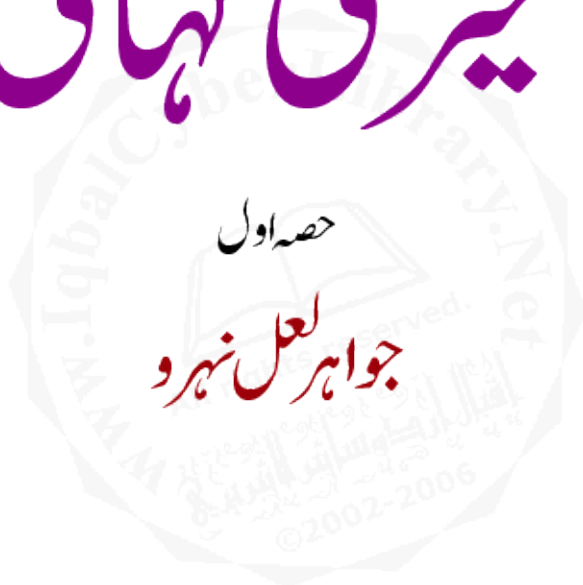


آپ بقی

میری کہانی

حصہ اول

جواہر لعل نہرو



انتساب

جان ہار کملا کے نام

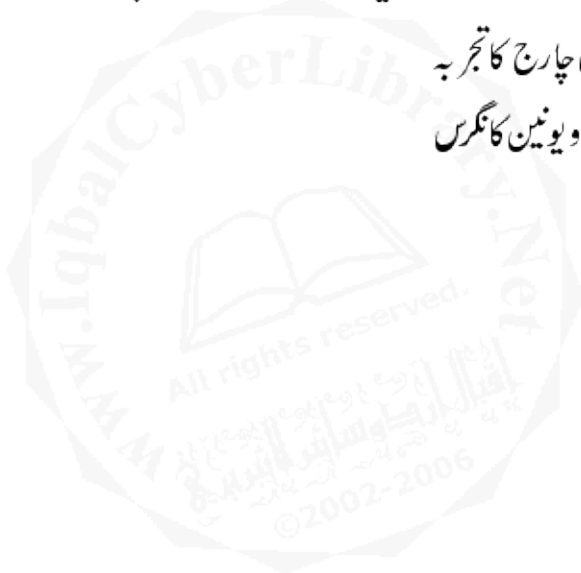
جواہر لال نہرو



فہرست مضامین

02	انتساب
05	پہلی بات
08	خاندان کاشمیر سے آنا
15	بچپن کا زمانہ
23	تھیوسوفی
31	ہیرا اور کیمبرج
47	انگلستان سے واپسی
64	میری شادی اور ہمالیہ کا سفر
68	سیاست میں گاندھی جی کی آمد
81	میرا مسوری سے شہر بدر ہونا
92	دیہات میں گشت
103	ترک موالات
121	۱۹۲۱ء اور میری پہلی جیل یا ترا
131	عدم تشدد یا تلوار
143	لکھنؤ و ڈسٹرکٹ جیل
156	دوبارہ رہائی
165	شکوہ اور ذہنی کش مکش
172	ریاست نا بھاکا پر مذاق واقعہ
184	کوکونا ڈو، اور مولانا محمد علی
195	میرے والد اور گاندھی جی
210	فرقہ پرستی کا زور

- 222 میونسپلٹی کا کام
- 231 یورپ میں
- 243 ہندوستان میں پھوٹ
- 251 مظلوموں کا جلسہ بروسیلز میں
- 258 ہندوستان کی واپسی اور سیاست کی منجھدھار میں دوبارہ کودنا
- 275 لائٹھی چارج کا تجربہ
- 281 ٹریڈ یونین کانگریس



پہلی بات:

یہ ساری کتاب میں نے جون ۱۹۳۴ء سے فروری ۱۹۳۵ء تک جیل میں لکھی تھی۔ اب سو اس کے کہ کہیں کہیں ایک آدھ لفظ بدلا، یا جو باتیں بعد میں کہنے کی تھیں انھیں ایک الگ باب میں لکھ دیا، اور کچھ گھٹایا بڑھایا نہیں۔ اس کے لکھنے میں اصل میں دو چیزیں میرے سامنے تھیں۔ ایک تو یہ کہ اپنے لیے کوئی خاص کام ٹھہرا لوں اور اسی میں لگا رہوں، کیونکہ بے اس کے جیل میں تنہائی کے پہاڑ سے دن کا لے نہیں کلتے، دوسرے یہ کہ ان واقعات کا جائزہ لے ڈالوں جو ہندوستان میں پچھلے زمانے میں پیش آئے اور جن سے مجھے بھی تعلق رہا، تاکہ انھیں صاف اور سلیجھی ہوئی نظر سے دیکھ سکوں۔ میں نے یہ کام اس طرح شروع کیا جیسے کوئی اپنے آپ سے اپنے دل کی باتیں کھود کھود کر پوچھتا ہے اور یہی رنگ بڑی حد تک ساری کتاب قائم رہا۔ اس کے لکھنے میں میں نے کوئی خاص اہتمام پڑھنے والوں کا لحاظ رکھ کر نہیں کیا۔ اگر مجھے پڑھنے والوں کا دھیان آیا بھی تو صرف اپنے دیس کے مردوں اور عورتوں کا۔ غیر ملکوں کے لیے لکھنا ہوتا تو شاید میں اور طرح لکھتا یا اور چیزوں پر زور دیتا۔ اس صورت میں بعض باتوں کو جن کا یہاں رواداری میں ذکر کر دیا ہے زیادہ صراحت سے بیان کرتا اور بعض کو جنہیں یہاں تفصیل سے لکھا ہے محض سرسری طور پر لکھتا۔ ممکن ہے کہ ہندوستان کے باہر کے لوگوں کو ان چیزوں سے جو تفصیل سے لکھی گئی ہیں دلچسپی نہ ہو ان کے نزدیک یہ معمولی یا ایسی کھلی ہوئی باتیں ہوں جن میں بحث کی گنجائش نہیں مگر میرے خیال میں آج کل کے ہندوستانیوں کے لیے یہ کسی قدر اہمیت رکھتی ہیں۔ اسی طرح شاید ہمارے ملک کے بعض سیاسی معاملات اور بعض اشخاص کا ذکر بھی باہر والوں کے لیے دلچسپی سے خالی ہوگا۔

امید ہے کہ پڑھنے والے اس بات کا لحاظ رکھیں گے کہ یہ کتاب ایسے زمانے میں لکھی گئی جو میری زندگی میں بڑی مصیبت کا وقت تھا۔ اس کا اثر کتاب میں صاف

نظر آتا ہے۔ اگر میں معمول کی حالت میں لکھتا تو تحریر کا رنگ کچھ اور ہوتا اور میں بعض موقعوں پر زیادہ ضبط سے کام لیتا۔ مگر میں نے یہی مناسب سمجھا کہ یہ جیسی ہے ویسی ہی رہنے دوں کیونکہ شائد لوگوں کے لیے وہی شکل زیادہ دلچسپ ہو جس سے وہ جذبات ظاہر ہوتے ہیں جو لکھتے وقت میرے تھے۔

میں نے صرف یہ کوشش کی ہے کہ جہاں تک ہو سکے اپنے ذہن کی نشوونما دکھاؤں۔ ہندوستان کی پچھلے زمانے کی تاریخ لکھنا مقصود نہیں دیکھنے میں یہ کتاب تاریخ سی معلوم ہوتی ہے۔ ممکن ہے اس سے پڑھنے والوں کو غلط فہمی ہو اور وہ اسے اتنی اہمیت دیں جس کی یہ مستحق نہیں۔ اس لیے میں یہ بتائے دیتا ہوں کہ اس میں بات کا صرف ایک ہی پہلو دکھایا گیا ہے اور وہ لازمی طور پر شخصی اور ذاتی رنگ میں ڈوبا ہوا ہے۔ بہت سے اہم واقعات کا اور بہت سے اشخاص کا، جنہوں نے واقعات پر اثر ڈالا ذکر تک نہیں ہے۔ اگر یہ سچ مچ تاریخ ہوتی تو یہ طریقہ سخت قابل اعتراض تھا لیکن یہ تاریخ نہیں آپ بیتی ہے اس لیے اتنی رعایت کی ضرورت مستحق ہے۔ جو لوگ پچھلے دنوں کے واقعات کا باقاعدہ مطالعہ کرنا چاہتے ہیں انہیں اور ٹھکانے ڈھونڈنے پڑیں گے۔ وہاں یہ ہو سکتا ہے کہ انہیں اس کتاب سے اور اس قسم کی اور آپ بیتیوں سے تاریخ کی کڑیاں ملانے میں اور واقعات کی لڑیاں پروانے میں مدد ملے۔

میں نے اپنے بعض رفیقوں کے متعلق، جن کے ساتھ میں برسوں سے کام کر رہا ہوں اور جو مجھے دل سے عزیز ہیں، آزادی سے اظہار رائے کیا ہے۔ میں نے جماعتوں اور شخصوں پر نکتہ چینی بھی کی ہے اور اس میں بعض جگہ سختی سے کام لیا ہے۔ میرا خیال یہ ہے کہ جو لوگ قومی معاملات میں قدم رکھتے ہیں انہیں ایک دوسرے سے، اور قوم سے جس کی خدمت کا یہ دعویٰ کرتے ہیں، صاف گویا برتنی چاہیے۔ آپس میں ظاہر داری کا برتاؤ کرنے سے، ٹیڑھے سوالوں کو ٹال جانے سے نہ تو ہم

ایک دوسرے کو اچھی طرح سمجھ سکتے ہیں اور نہ ان معاملات کو جو ہمیں درپیش ہیں۔ سچے اتحاد عمل کی بنیاد اس پر ہونی چاہیے کہ جن باتوں میں ہم میں اتفاق ہے اور جن میں اختلاف ہے ان سب کو اچھی طرح جان لیں اور واقعات کو چاہے وہ کتنے ہی بے ڈھب ہوں آنکھ سے آنکھ ملا کر دیکھیں۔ مگر اپنے نزدیک میں نے کوئی بات ایسی نہیں لکھی جس میں کسی شخص سے بیر یا جلن کی جھلک پائی جاتی ہو۔

میں نے جان بوجھ کر ہندوستان کے آج کل کے معاملات کو نہیں چھیڑا ہاں کہیں کہیں اور باتوں کے ذیل میں سرسری طور پر ان کا ذکر آ گیا ہے۔ جیل میں اس کا موقع نہ تھا کہ ان معاملات کی چھان بین کر کے ان سے پوری طرح بحث کر سکوں یہاں تک کہ میں خود اپنے دل میں اس کا فیصلہ نہیں کر سکتا تھا کہ ان سے کس طرح نبٹنا چاہیے۔ رہائی کے بعد بھی میں نے یہ مناسب نہیں سمجھا کہ اس موضوع پر کچھ لکھوں کیونکہ یہ کتاب کے مضمون کے ساتھ کھپتا نہیں تھا، غرض یہ آپ بیتی پچھلے زمانے کے واقعات کا ایک شخصی، سرسری اور ادھورا بیان ہے جو موجودہ زمانے کے لگ بھگ آ پہنچا ہے مگر اسے چھونے سے احتیاط کے ساتھ دامن بچائے ہوئے ہے۔

جواہر لال نہرو

باون وانکر

۲ جنوری ۳۶ء

خاندان کا کشمیر سے آنا

اپنے حالات آپ لکھنا بڑا مشکل اور نازک معاملہ ہے۔ اگر انسان اپنی برائی کرے تو اپنا دل دکھتا ہے اور تعریف کرے تو پڑھنے والوں کو برا لگتا ہے۔

(ایبراہیم کاؤلے)

خوش حال ماں باب کا اکلوتا بچہ، خصوصاً ہندوستان کے گھرانوں میں اکثر لاڈ پیار میں بگاڑ دیا جاتا ہے۔ اور جب گیارہ برس کی عمر تک اس کے کوئی بھائی بہن نہ ہو، پھر تو وہ بگڑنے سے بچ ہی نہیں سکتا۔ میری دونوں بہنیں مجھ سے بہت چھوٹی ہیں اور ان میں بھی کئی سال کا فرق ہے۔ اس لیے میرا بچپن تنہائی میں گذرا اور مجھے اپنی عمر کا کوئی ساتھی نہیں ملا۔ یہاں تک کہ اسکول کے بچوں کی صحبت سے بھی محروم رہا، کیونکہ مجھے کنڈرگارٹن یا کسی اور مکتب میں داخل نہیں کیا گیا بلکہ گھر پر استانیاں اور اتالیق رکھ کر تعلیم دلائی گئی۔

ہمارے گھر میں تنہائی نہیں بلکہ خوب چہل پہل تھی۔ میرے رشتے کے بھائی بہن اور قریبی عزیز ملا کر بہت بڑا کنبہ تھا۔ اور یہ سب ہندوستان کے دستور کے مطابق ایک ہی جگہ رہتے تھے۔ مگر میرے بھائی مجھ سے عمر میں بہت بڑے تھے۔ ان میں کچھ اسکول میں اور کچھ یونیورسٹی میں پڑھتے تھے اور مجھے بچہ سمجھ کر اپنے کام میں اور کھیل میں شریک نہیں کرتے تھے۔ غرض میں اتنے بڑے گھرانے میں اپنے آپ کو بالکل اکیلا پاتا تھا اور زیادہ تر اپنے خیالات میں ڈوبا رہتا تھا یا کہیں الگ بیٹھ کر کھیلا کرتا تھا۔

ہم لوگوں کو اصلی وطن کشمیر ہے۔ اب سے کوئی سوادو سو برس پہلے، اٹھارہویں صدی کے شروع میں، ہمارے پردادا کے باپ کشمیر کی پہاڑی وادی کو چھوڑ کر دولت اور شہرت کی تلاش میں نیچے زرخیز میدان میں آئے۔ یہ وہ زمانہ تھا کہ اورنگ زیب

کی وفات کے بعد سلطنت مغلیہ کا زوال شروع ہو چکا تھا۔ فرخ سیر ہندوستان کا بادشاہ تھا۔ ہمارے بزرگ جن کا نام راج کول تھا کشمیر میں سنسکرت اور فارسی کے عالم کی حیثیت سے امتیاز رکھتے تھے۔ جب فرخ سیر کشمیر گیا تو اس کی نظر عنایت راج کول پر پڑی اور غالباً اسی کے حکم سے وہ ۱۷۶۱ء کے لگ بھگ ترک وطن کر کے دلی آ گئے۔ بادشاہ نے انھیں جاگیر عطا کی جس میں ایک مکان بھی تھا۔ یہ مکان نہر کے کنارے واقع تھا جس کی وجہ سے راج کول نہر کو کہلانے لگے۔ اب خاندان کا نام ”کول“ کی جگہ ”کول نہر“ قرار پایا۔ آگے چل کر کول تو اڑ گیا اور صرف نہر باقی رہ گیا۔

اس کے بعد جو بد امنی کا زمانہ آیا اس میں ہمارے خاندان کو تقدیر نے بہت سے نشیب و فراز دکھائے۔ ہماری جاگیر گھٹتے گھٹتے بالکل ختم ہو گئی۔ میرے پردادا کشمیری نرائن نہرو نے ”سرکار کمپنی“ کی ملازمت اختیار کی اور اس کی طرف سے دلی کے برائے نام وکیل بنا کر بھیجے گئے۔ میرے دادا گنگا دھر نہرو ۱۸۵۷ء کی شورش سے پہلے، کچھ دن دلی کے کوتوال رہے تھے۔ ۱۸۶۱ء میں ۳۴ برس کی عمر میں ان کا انتقال ہو گیا۔

۱۸۵۷ء کے ہنگامے میں ہم لوگوں سے دلی ہمیشہ کے لیے چھٹ گئی اور ہمارے پرانے خاندانی کاغذات اور دستاویز بھی اسی گڑبڑ میں تلف ہو گئیں۔ ہمارا خاندان اپنی ساری املاک کھو کر اور بہت سے لوگوں کی طرح جو دلی کو چھوڑ کر بھاگ رہے تھے، آگرے پہنچا۔ میرے والد اس وقت تک پیدا نہیں ہوئے تھے مگر میرے دونوں چچا خاصے جوان تھے۔ ان کو تھوڑی بہت انگریزی بھی آتی تھی۔ جس کی بدولت چھوٹے بھائی نے اپنے آپ کو اور اپنے خاندان والوں کو ناگہانی اور ذلت کی موت سے بچالیا۔ وہ چند عزیزوں کے ساتھ، جن میں ان کی ننھی سی بہن بھی تھی دلی سے جا رہے تھے یہ لڑکی بعض کشمیری بچوں کی طرح بہت صاف رنگ کی تھی۔

رستے میں کچھ گورے ملے جنہیں شبہ ہوا کہ یہ کسی انگریز کی لڑکی ہے جسے میرے چچا چرا کر لئے جا رہے ہیں۔ ان دنوں الزام لگانا، سرسری تحقیقات کرنا اور سزا دینا یہ سارے مرحلے چند منٹ میں طے ہو جاتے تھے اور کچھ تعجب نہیں تھا کہ میرے چچا اور دوسرے عزیزوں کو سب سے قریب کے درخت پر پھانسی دے دی جاتی۔ مگر خوش قسمتی سے چچا جان کی انگریز دانی کام آگئی اور تھوڑی سی مہلت مل گئی۔ اتنے میں کوئی شخص جوان لوگوں سے واقف تھا ادھر سے گزرا اور اس نے انہیں رہائی دلائی۔

چند سال ہمارا خاندان آگرے میں رہا اور اسی شہر میں ۶ مئی ۱۸۶۱ء (۱) کو میرے والد پیدا ہوئے۔ ان کی پیدائش سے تین مہینے پہلے دادا جان کا انتقال ہو چکا تھا ان کی ایک قلمی تصویر ہمارے یہاں اب تک موجود ہے۔ وہ مغل دربار کا لباس پہنے ہیں اور ان کے ہاتھ میں ایک خمدار تلوار ہے۔ ان کا چہرہ مہرہ بالکل کشمیری ہے پھر بھی یہ گمان ہوتا ہے کہ کسی مغل امیر کی تصویر ہے۔ اب خاندان کی پرورش کا بوجھ میرے دونوں چچاؤں پر پڑا جو عمر میں والد سے بہت بڑے تھے۔ بڑے چچا ہنسی دھرنہر و حکومت برطانیہ کے محکمہ عدالت میں نوکر ہو کر ایک جگہ سے دوسری جگہ تبدیل ہوتے رہے اور ان کا تعلق ایک حد تک خاندان سے قطع ہو گیا۔ چھوٹے چچا نند لال نہرو نے ایک ہندوستانی ریاست کی ملازمت اختیار کی اور دس برس تک رجبو تے تانے کی ریاست کھیتری میں دیوان رہے۔ اس کے بعد انھوں نے قانون سیکھا اور آگرے میں وکالت کرنے لگے۔

میرے والد نے انھیں کے سایہ عاطفت میں پرورش پائی۔ دونوں ایک دوسرے کو بہت چاہتے تھے اور ان کے تعلقات میں برادرانہ لفت نے باپ بیٹے کی سی محبت کے ساتھ مل کر ایک عجیب شان پیدا کر دی تھی۔ والد اپنے بھائی بہنوں میں سب سے چھوٹے تھے اس لئے طاہر ہے کہ وہ اپنی ماں کے لاڈ لے تھے۔ دادی جان اپنے ارادے کی پکی تھیں اور مجال نہ تھی کہ کوئی ان کی بات کو ٹال دے۔ ان کی

وفات کی پچاس برس ہو گئے مگر ابھی تک بوڑھی کشمیری خواتین ان کا ذکر کرتی ہیں کہ وہ بڑے طنطنے کی بی بی تھیں اور اگر کوئی کام ان کی مرضی کے خلاف ہو تو آفت مچا دیتی تھیں۔

میرے چچا ہانی کورٹ میں جو نیا نیا قائم ہوا تھا، وکالت کرنے لگے اور جب وہ آگرے سے الہ آباد منتقل ہوا تو ہمارا خاندان بھی وہیں چلا گیا۔ اس وقت سے الہ آباد ہمارا وطن ہو گیا۔ اسی شہر میں مدت کے بعد میں پیدا ہوا۔ میرے چچا کا کام رفتہ رفتہ بہت بڑھ گیا اور ان کا شمار ہانی کورٹ کے چوٹی کے وکیلوں میں ہونے لگا۔ اس عرصے میں میرے والد کا پورا ورالہ آباد میں اسکول اور کالج کی تعلیم کی منزلیں طے کر رہے تھے۔ ابتدا میں انھوں نے صرف عربی فارسی پڑھی اور انگریزی کہیں با رہ چودہ برس کی عمر میں جا کر شروع کی۔ اس کم سنی میں وہ فارسی کی بہت اچھی استعداد رکھتے تھے مگر اسکول اور کالج کے زمانے میں ان کی شہرت زیادہ تر ان کی شرارتوں کی وجہ سے تھی۔ وہ کوئی قابل تقلید طالب علم نہ تھے۔ پڑھنے لکھنے سے زیادہ انھیں سمجھے جاتے تھے انھیں مغربی لباس اور مغربی تہذیب کا بہت شوق تھا حالانکہ اس وقت تک کلکتہ بمبئی جیسے شہروں کے سوا اور جگہ ہندوستان میں ان چیزوں کا رواج بہت ہی کم تھا۔ ان کی شوخیوں کے باوجود انگریز پروفیسران پر مہربان تھے اور اکثر مشکلوں میں ان کی مدد کرتے تھے جن میں وہ اپنی شرارت کی وجہ سے پھنس جاتے تھے۔ ان میں سے ایک میونسٹرل کالج الہ آباد کے پرنسپل مسٹر ہیری سن بھی تھے۔ ان کا ذکر میرے والد آخر عمر میں ہم لوگوں کے سامنے بڑی محبت سے کیا کرتے تھے اور اپنی طالب علمی کی زمانے کا ایک خط جو ان بزرگ نے انہیں لکھا تھا، انہوں نے بڑی احتیاط سے رکھ چھوڑا تھا۔

یونیورسٹی کے ابتدائی امتحانوں میں انہوں نے کوئی خاص امتیاز تو حاصل نہیں کیا مگر پاس ہوتے چلے گئے یہاں تک کہ بی۔ اے کے امتحان کی نوبت آئی۔ اس

کے لئے انہوں نے بہت کم محنت کی تھی اور پہلے پرچے کے جواب جو انہوں نے دئے ان کے خیال میں بالکل ناقابل اطمینان تھے۔ یہ سمجھ کر کہ پہلا پرچہ بگڑ گیا ہے وہ کامیابی سے مایوس ہو گئے اور امتحان چھوڑ چھاڑ تاج محل کی سیر کرنے لگے۔ (ان دنوں یونیورسٹی کے امتحان آگرے میں ہوتے تھے) بعد میں ان کے پروفیسر نے انہیں بلا کر بہت ڈانٹا اور کہا کہ تمہارا پہلا پرچہ اچھا خاصا ہو گیا تھا۔ تم نے سخت حماقت کی، کہ دوسرے پرچوں میں شریک نہیں ہوئے۔ بہر حال میرے والد کی یونیورسٹی کی تعلیم یہیں ختم ہو گئی۔ بی۔ اے انہوں نے پاس نہیں کیا۔

ان کے دل میں ترقی کی امنگ تھی اور وہ کوئی علمی پیشہ اختیار کرنا چاہتے تھے۔ ظاہر ہے کہ ان کی نظر قانون کے پیشے پر پڑی کیونکہ ان دنوں ہندوستان میں یہی ایک پیشہ تھا جس میں قابل آدمی کھپ سکتے تھے اور جسے اس میں کامیابی حاصل ہو جائے، اس کے پو بارے تھے۔ پھر ان کے سامنے بھائی کی مثال بھی تھی۔ چنانچہ انہوں نے ہائی کورٹ کی وکالت کا امتحان دیا اور اس میں اول نمبر پر پاس ہو کر سونے کا تمغہ حاصل کیا۔ اب انہیں اپنی پسند کا کام مل گیا یا یوں کہئے کہ جو کام ایک بار اختیار کر لیا اس میں کامیابی حاصل کرنے پر تل گئے۔

انہوں نے کانپور میں ضلع کی عدالتوں میں وکالت شروع کر دی۔ ترقی کی دھن میں انہوں نے خوب محنت کی اور تھوڑے ہی دنوں میں ان کا کام چل اٹھا مگر کھیل تماشوں کے شوق کا وہی حال تھا اور اب بھی ان کا تھوڑا بہت وقت اس میں صرف ہوتا تھا۔ سب سے زیادہ دلچسپی انہیں کشتی سے تھی۔ کانپور کے دنگل اس زمانے میں مشہور تھے۔

کانپور میں تین سال کام سیکھنے کے بعد وہ الہ آباد آ گئے اور ہائی کورٹ میں وکالت کرنے لگے۔ اس کے تھوڑے ہی دن بعد ان کے بھائی پنڈت نند لال نہرو کا یکا یک انتقال ہو گیا۔ یہ صدمہ میرے والد کے لئے بہت سخت تھا۔ ایک طرف تو یہ غم

کہ وہ پیارا بھائی جس نے بیٹے کی طرح پالا تھا جد ہو گیا دوسری طرف یہ فکر کہ خاندان کا سردار اور سب سے زیادہ کمانے والا فرد اٹھ گیا۔ اس دن سے ایک بہت بڑے کنبے کی پرورش کا بہت سا بوجھ اس کم عمری میں میرے والد پر پڑ گیا۔

انہوں نے دل میں ٹھان لی کہ وکالت میں کامیابی حاصل کر کے رہیں گے، اور کئی مہینے تک اور سب کچھ چھوڑ کر اسی میں محو رہے۔ چچا کے قریب قریب کل مقدمے انہیں کو ملے اور چونکہ انہوں نے اس کام کو بڑی عمدگی سے انجام دیا اس لئے ان کی وکالت خوب چمکی اور وہ بات جس کی انہیں دلی تمنا تھی حاصل ہو گئی۔ یعنی انہیں کام بھی زیادہ ملنے لگا اور آمدنی بھی بڑھ گئی۔ نوجوانی میں کامیاب وکیل ہو جانے کا خمیازہ انہیں یہ بھگتنا پڑا کہ ان کے محبوب پیشے نے جسے اپنی محبت میں شرکت گوارا نہیں ان کی سار زندگی پر قبضہ کر لیا۔ انہیں اور کسی ذاتی یا قومی کام کا وقت ہی نہیں ملتا تھا اور چھوٹی بڑی تعطیلوں کا زمانہ بھی وکالت ہی کی نذر ہو جاتا تھا۔ انہیں دونوں نیشنل کانگریس انگریزی جاننے والے اور اوسط طبقے کے لوگوں کو اپنی طرف متوجہ کر رہی تھی۔ میرے والد بھی اس کے بعض جلسوں میں شریک ہوئے اور اصولی طور پر اس کے حامی بن گئے مگر اس زمانے میں انہیں اس کے کام سے کچھ زیادہ دلچسپی نہ تھی۔ ایک تو انہیں اپنے پیشے سے فرصت نہیں ملتی تھی دوسرے وہ سیاسی مسئلوں اور قومی کاموں میں کچھ انکل بھی نہیں رکھتے تھے۔ انہوں نے ابھی تک ان چیزوں کی طرف توجہ نہیں کی تھی اور ان سے بالکل ناواقف تھے۔ وہ کسی ایسی تحریک یا انجمن میں شریک نہیں ہونا چاہتے تھے جس میں انہیں دوسرے کی پیروی کرنی پڑے۔ ان میں جو خود سری بچپن اور نوجوانی میں تھی، وہ بظاہر دب گئی تھی، مگر اصل میں اس نے ایک نئی یعنی طلب قوت کی شکل اختیار کر لی تھی۔ یہی چیز تھی جس نے انہیں ان کے پیشے میں کامیاب کیا اور ان کے دل میں خوداری اور اعتماد نفس کے جذبات پیدا کئے۔ انہیں لڑنے کا خصوصاً زبردست سے مقابلہ کرنے کا شوق تھا۔ مگر عجیب بات ہے کہ

اس زمانے میں وہ سیاسی میدان کے قریب تک نہ آتے تھے۔ سچ پوچھئے تو اس وقت تک نیشنل کانگریس کی سیاست میں لڑائی کو دخل بھی نہ تھا۔ بہر حال وہ اس کوچے سے نابلد تھے اور ان کے دل میں ہر وقت اپنے کٹھن پیشے کا خیال بسا رہتا تھا۔ انہوں نے ترقی کے زینے پر مضبوطی سے قدم جمالیا تھا اور ایک ایک سیڑھی کر کے اوپر چڑھتے چلے جاتے تھے۔ انہیں اس پر فخر تھا کہ اس میں کسی کے احسان یا عنایت کو دخل نہیں بلکہ یہ خود ان کے دماغ اور ارادے کا کرشمہ ہے۔

گو وہ ایک معنی میں قوم پرست تھے مگر انگریزوں کو ان کے طور طریقے کو بہت پسند کرتے تھے۔ وہ سمجھتے تھے کہ ہم ہندوستانیوں کا اخلاق اس قدر پست ہو چکا ہے کہ جو برتاؤ ہمارے ساتھ ہوتا ہے ہم ایک حد تک اس کے مستحق ہیں۔ وہ ان سیاست دانوں کو کچھ اچھی نظر سے نہیں دیکھتے تھے جو باتیں بہت بتاتے ہیں اور کرتے کچھ نہیں، حالانکہ وہ خود بھی نہیں جانتے تھے کہ آخر اور کیا کیا جائے۔ پھر ان کا ذاتی کامیابی نے ان کے دل میں یہ خیال بھی پیدا کر دیا تھا کہ سب تو نہیں مگر بہت سے لوگ جب اور پیشوں میں ناکام رہتے ہیں تو سیاست کو لے بیٹھتے ہیں۔

آمدنی میں روز بروز اضافہ ہونے سے ہمارا زندگی کا طریقہ بہت کچھ بدل گیا۔ ادھر آمدنی بڑھتی گئی، ادھر خرچ بڑھتا گیا۔ روپیہ جمع کرنے کو میرے والد اپنی کمانے کی قوت کی توہین سمجھتے تھے۔ انہیں بھروسہ تھا کہ جب چاہوں اور جتنا چاہوں پیدا کر سکتا ہوں۔ کھیل تماشے کے شوق اور عیش و عشرت کے ذوق میں جو کچھ ملتا اڑا دیتے۔ رفتہ رفتہ ہمارے طرز زندگی میں مغربی رنگ گہرا ہوتا چلا گیا۔

یہ تھا ہمارے گھر کا نقشہ جو میں نے اپنے بچپن میں دیکھا۔ (۲)

(۱) یہ عجیب اتفاق ہے کہ راہبند ناتھ ٹیگور کی ولادت بھی ۶ مئی ۱۸۲۱ء کو ہوئی۔

(۲) میری پیدائش الہ آباد میں ۴ نومبر ۱۸۸۹ء کو ہوئی۔

بچپن کا زمانہ

میرا بچپن دنیا کے بکھیڑوں سے محفوظ، اور واقعات سے خالی تھی۔ میں اپنے رشتے کے بھائیوں کی بات چیت، جو میرے سن سے اونچے تھے سنا کرتا تھا اور بہت سی باتیں میری سمجھ میں نہیں آتی تھیں۔ یہ لوگ اکثر اس کا ذکر کیا کرتے تھے کہ انگریز اور کرانی ہندوستانیوں سے حقارت کا برتاؤ کرتے ہیں اور ہر ہندوستانی کا فرض ہے کہ اس ذلت کو چپ چاپ نہ سہے بلکہ ڈٹ کر مقابلہ کرے۔ حاکم اور محکوم میں آئے دن اس طرح کے جھگڑے ہوا کرتے تھے۔ اور ان کے قصے ہمارے گھر میں چھڑے رہتے تھے۔ یہ چرچا عام تھا کہ جب کبھی انگریز ہندوستانی کو مار ڈالتا ہے، اس کے ہم قوموں کو جیوری اسے بری کر دیتی ہے۔ ریلوں میں کچھ ڈبے انگریزوں کے لئے محفوظ ہوتے تھے اور چاہے گاڑی میں کتنی ہی بھيڑ ہو (ان دنوں بھيڑ ہوتی بھی بہت تھی) کسی ہندوستانی کی مجال نہ تھی کہ ان ڈبوں میں گواہ خالی ہی کیوں نہ ہوں سفر کر سکے۔ یہی نہیں بلکہ انگریز غیر محفوظ ڈبے پر قبضہ کر لیتا تھا اور کسی ہندوستانی کو اس میں قدم رکھنے نہیں دیتا تھا۔ اسی طرح پارک وغیرہ میں بھی یورپیوں کے لئے محفوظ بنچیں ہوتی تھیں مجھے بدلیسی حاکموں کی ان بے ہودہ حرکتوں پر بڑا غصہ آتا تھا اور جب کوئی ہندوستانی کلمہ کہہ جواب دیتا تھا تو میں بہت خوش ہوتا تھا۔ ایسا بھی ہوتا تھا کہ خود میرے بھائیوں یا ان کے دوستوں میں سے کسی کی جھڑپ انگریز سے ہو جائے۔ پھر تو ظاہر ہے کہ ہم سب کو بڑا جوش آتا تھا۔ میرے ایک رشتے کے بھائی جو گھر بھر میں سب سے مضبوط تھے، اوبدا کر انگریزوں سے اور اس سے زیادہ کرانیوں سے لڑ بیٹھتے تھے، اس لئے کہ کرانی، شاید یہ دکھانے کو کہ ہم بھی حاکم قوم میں سے ہیں، انگریز عہدہ داروں اور تاجروں سے زیادہ بدتمیزی کرتے تھے یہ جھگڑے خاص طور پر ریل کے سفر میں پیش آتے تھے۔

اگرچہ مجھے بدلیسی حاکموں کا ہوان اور ان کا یہ برتاؤ بہت برا لگتا تھا لیکن جہاں

تک یاد ہے، افراد کی حیثیت سے مجھے انگریزوں سے کوئی کد نہیں تھی۔ میں میم
استانیوں کی نگرانی میں رہ چکا تھا اور ابا جان کے انگریز دوستوں کو گھر میں آتے جاتے
دیکھا کرتا تھا۔ سچ پوچھئے تو میں دل میں انگریزوں کو اچھا سمجھتا تھا۔

شام کو والد سے ملنے بہت سے دوست آ جاتے تھے۔ وہ اس بوجھ کو جو دن بھر
دل پر رہتا تھا اتار پھینکتے تھے اور سارا گھر ان کے قہقہوں کی آواز سے گونج اٹھتا تھا۔
ان کی ہنسی سارے الہ آباد میں مشہور تھی۔ بعض اوقات میں پردے کے پیچھے سے
جھانک کر انہیں اور ان کے دوستوں کو دیکھتا تھا اور اس سوچ میں رہتا تھا کہ یہ بڑے
بڑے لوگ آپس میں کیا باتیں کیا کرتے ہیں۔ اگر کسی نے مجھے دیکھ لیا تو میں پکڑ کر
باہر لایا جاتا تھا۔ والد مجھے کچھ دیر اپنے گھٹنے پر بٹھا لیتے اور میں ذرا سہا ہوا بیٹھا رہتا
تھا۔ ایک بار میں نے انہیں کلیئرٹ یا کوئی اور لال رنگ کی شراب پیتے ہوئے دیکھا
وہسکی کو تو میں پہچانتا تھا اس لئے کہ میں نے والد کو ان کے دوستوں کو اکثر اسے پیتے
ہوئے دیکھا تھا مگر اس نئی سرخ چیز کو دیکھ کر میرے رونگٹے کھڑے ہو گئے اور میں
نے دوڑ کر اماں جان سے کہا کہ ابا جان خون پی رہے ہیں۔

میرے دل میں والد کی بے حد عظمت تھی۔ میں انہیں قوت، ہمت اور عقل کا
پتلا جانتا تھا اور جتنے آدمی میں نے دیکھے تھے سب سے برتر سمجھتا تھا۔ مجھے آرزو تھی
کہ میں بھی بڑا ہو کر ان جیسا ہو جاؤں۔ مگر عظمت اور محبت کے ساتھ ساتھ میرے
دل میں ان کا ڈر بھی بیٹھا ہوا تھا۔ میں نے انہیں نوکروں وغیرہ پر خفا ہوتے دیکھا
تھا۔ اس وقت وہ مجھے بہت ڈراؤنے معلوم ہوتے تھے اور میں خوف سے اور کبھی کبھی
طیش سے کانپنے لگتا تھا کہ نوکروں کے ساتھ ایسا برتاؤ کیا جاتا ہے۔ ان کا غصہ واقعی
بہت برا تھا اور میں نے اس وقت کیا اس کے بعد بھی اس کی ٹکر کا غصہ نہیں دیکھا مگر
یہ اچھا تھا کہ ان میں ظرافت کا مادہ تھا اور ارادے کے بہت مضبوط تھے، اس لئے
عام طور پر ضبط سے کام لیتے تھے۔ عمر کے ساتھ ساتھ یہ ضبط کی قوت بڑھتی گئی اور آخر

عمر میں شاید ہی کبھی انہیں پہلا سا غصہ آیا ہو۔

مجھے بچپن کی جو سب سے پہلی بات یاد ہیں ان میں والد کا غصہ بھی ہے اس لئے کہ یہ مجھی پر نازل ہوا تھا۔ میں ان دنوں کوئی پانچ چھ سال کا ہوں گا۔ والد کی کام کی میز پر ”دوست قلم“ (فائونٹین پن) رکھے ہوئے دیکھ کر میرا دل لپکا گیا۔ میں نے کہا کہ انہیں ایک ساتھ قلموں کی تو ضرورت ہونے سے رہی۔ اس لئے میں نے لے لیا۔ بعد میں جب دیکھا کہ اس قلم کی زور شور سے تلاش ہو رہی ہے تو میں بہت ڈرا مگر میں نے اقرار نہیں کیا۔ آخر پتہ چل گیا اور میرے جرم کا ڈھنڈورا بٹ گیا۔ والد بے حد خفا ہوئے اور میری خوب مرمت کی۔ میں درد کی تکلیف اور ذلت کے رنج سے بے تاب سیدھا ماں کے پاس پہنچا اور کئی روز تک میرے چھوٹے سے دکھتے ہوئے جسم پر طرح طرح کے روغنوں کی مالش ہوتی رہی۔

مجھے یاد نہیں کہ اس سزا کی وجہ سے مجھے والد سے کوئی شکایت پیدا ہوئی ہو۔ غالباً میرا یہی خیال تھا کہ سزا تھی تو بالکل بجا، مگر حد سے بڑھ گئی تھی لیکن باوجود اس کے میرے دل میں ان کی عظمت اور محبت اسی طرح قائم رہی۔ اب میں ان سے ڈرنے بھی لگا۔ البتہ والدہ سے میں بالکل نہیں ڈرتا تھا کیونکہ یہ معلوم تھا کہ چاہے میں کچھ بھی کروں وہ درگزر سے کام لیں گی۔ ان کی بے اندازی محبت کی جوہ سے میں ان کے ساتھ تھا اس لئے ان سے میں زیادہ مانوس تھا۔ اور اپنے دل کی بات جو والد سے کبھی نہ کہتا ان سے کہہ دیا کرتا تھا۔ وہ چھریرے جسم اور چھوٹے قد کی تھیں۔ اور تھوڑے دن میں میرا قد ان لے لگ بھگ جا پہنچا اس لئے میرے دل میں عمر کے فرق کا احساس کم ہو گیا اور وہ مجھے اپنے برابر کی معلوم ہونے لگیں۔ مجھے ان کی پیاری صورت اور ننھے منے ہاتھ پاؤں بہت بھلے لگتے تھے۔ وہ ایک نووارد کشمیری گھرانے کی تھیں جسے اپنا وطن چھوڑے دوہی پشتیں گزری تھیں۔

میرے دوسرے ہماز والد کے ایک محرر منشی مبارک علی تھے۔ وہ بدایوں کے

ایک آسودہ حال خاندان سے تھے۔ ۱۸۵۷ء کی شورش میں ان کا گھر اجڑ گیا اور انگریزوں کی فوج نے ان کے خاندان کو قریب قریب ختم کر دیا۔ مصیبت نے ان کے قلب میں رقت اور درد پیدا کر دیا تھا، اور وہ سب سے خصوصاً بچوں سے بڑی نرمی سے پیش آتے تھے۔ میرے لئے ان کا دامن، جانا بوجھا امن کا ٹھکانا تھا۔ جب کبھی اداس یا پریشان ہوتا انہیں کے پاس پہنچتا۔ ان کی شاندار سفید داڑھی کو دیکھ کر میں بچپن کی سادگی سے یہ سمجھتا تھا کہ یہ پراچین وقتوں کے آدمی ہیں جنہیں کئی جگہ کی باتیں یاد ہیں۔ انکی گود میں بیٹھ کر حیرت سے آنکھیں پھیلانے میں ان کے بے شمار کہانیوں میں سے الف لیلیٰ اور دوسری کتابوں کے قصے یا ۵۷ء اور ۵۸ء کے حالات سنا کرتا تھا۔ منشی جی کا انتقال بہت برسوں کے بعد میری جوانی کے زمانے میں ہوا۔ وہ مجھے اب تک یاد ہیں اور ان کی یاد کو میں دل و جان سے عزیز رکھتا ہوں۔ میری والدہ اور چچی ہندوؤں کی دیو مالا کی کہانیاں اور رامائن اور مہابھارت کی داستانیں سنایا کرتی تھیں۔ میری چچی یعنی پنڈت نند لال کی بیوی کو ہندوستان کی پرانی کتابوں پر عبور تھا اور انہیں اس طرح کے ہزاروں قصے یاد تھے۔ اس لئے میری معلومات ہندوستان کی دیو مالا اور کتھامالا میں بہت بڑھ گئی۔

مذہب کا میرے دل میں محض ایک دھندلا سا تصور تھا میں اسے عورتوں کا معاملہ سمجھتا تھا۔ والد اور میرے چچے بھائی مذہبی امور کو کوئی اہمیت نہیں دیتے تھے اور ہنسی میں ٹال دیا کرتے تھے۔ گھر کی عورتیں طرح طرح کی رسمیں مناتی تھیں اور پوجا پاٹ کیا کرتی تھیں۔ مجھے یہ باتیں بہت بھلی معلوم ہوتی تھیں۔ اگرچہ میں اپنے بڑوں کی تقلید میں کسی حد تک بے پروائی کا اظہار کرتا تھا۔ کبھی کبھی میں والدہ کے ساتھ گنگا اشنان کو جاتا تھا۔ بعض اوقات وہ مجھے الہ آباد، بنارس اور شہروں کے مندروں میں یا ان سنیاسیوں کی خدمت میں جو بڑے مہماتما سمجھے جاتے تھے، لے جاتی تھیں۔ مگر میرے دل پر ان چیزوں کا کوئی مستقل اثر نہیں پڑا۔

پھر بڑے بڑے تہوار تھے جیسے ہولی جس میں سارا شہر رنگ رلیاں مناتا تھا اور ہم ایک دوسرے پر خوب پانی پھینکتے تھے۔ یاد دہانی جس میں ایک ایک مکان میں ہزاروں دئے جلائے جاتے تھے۔ جنم اسٹی میں آدھی رات کو کرشن کے قید خانہ میں پیدا ہونے کی خوشی منائی جاتی تھی۔ ہم لوگوں کے لئے آدمی رات تک جاگنا بہت مشکل تھا۔ دسہرے اور رام لیلا میں رام چند جی کی لنگا جیتنے کی پرانی کہانی، جلوس اور سوانگ کی شکل میں دہرائی جاتی تھی اور تماشا نیوں کے ٹھٹ کے ٹھٹ لگ جاتے تھے۔ ہم سب بچے محرم کا جلوس دیکھنے بھی جایا کرتے تھے جس میں علموں کے ریشمی پھریرے لہراتے تھے اور حسنی حسینی کی شہادت کا ماتم ہوتا تھا۔ دونوں عیدوں کو منشی جی اچھے اچھے کپڑے پہن کر عید گاہ میں نماز پڑھنے جاتے تھے اور میں ان کے گھر جا کر سویاں اور دوسرے لذیذ کھانے اڑاتا تھا۔ ان کے علاوہ ہندوؤں کے بہت سے چھوٹے چھوٹے تہوار جیسے رکھشا بندھن، بھیا دوج وغیرہ۔ ہم کشمیریوں کے بعض خاص تہوار بھی تھے جو اور ہندوؤں میں نہیں منائے جاتے تھے۔ ان سب سے بڑا نو روز یعنی ہمارے سمت کی شروع ہونے کا تہوار تھا۔ یہ ہم لوگوں کے لئے خاصی خوشی اک دن ہوتا تھا۔ گھر بھرنے کپڑے پہنتا تھا اور بچوں کو نقدی ملتی تھی۔

مگر ان سب تہواروں سے زیادہ مجھے اس تقریب سے دلچسپی تھی جو ہر سال خاص میرے لئے ہوا کرتی تھی یعنی میری سالگرہ۔ اس دن میرے جوش کو کچھ نہ پوچھے۔ صبح تڑکے میں ایک بڑی ترازو میں گیہوں وغیرہ سے تلتا تھا اور یہ چیزیں غریبوں کو بانٹ دی جاتی تھیں۔ پھر نئی پوشاک سج کر میں لوگوں سے تحفے لیتا تھا اور شام کو دعوت ہوتی تھی جس میں بہت سے لوگ جمع ہوتے تھے۔ اپنے آپ کو اس برات کا دولہا سمجھ کر نخر سے پھولا نہ ساتا تھا۔ مجھے سب سے زیادہ شکایت یہ تھی کہ میری سالگرہ بہت دن کے بعد آتی ہے بلکہ میں نے بہت کچھ شور بھی مچایا کہ یہ تقریب سال میں کئی بار ہوا کرے۔ اس وقت میں نہیں جانتا تھا کہ ایک دن وہ

آئے گا، جب سالگرہ بڑھتی ہوئی عمر کی نشانی بن کر ناگوار ہوا کرے گی۔

بعض اوقات ہمارا سارا خاندان دور کا سفر کر کے دوسرے شہر جاتا تھا کہ کسی عزیز یا دوست کی شادی میں شریک ہو۔ ہم بچوں کو اس قسم کے سفر سے بڑی خوشی ہو تی تھی۔ اس لئے کہ شادی کے زمانے میں قاعدوں کی بندشیں ڈھیلی پڑتیں اور ہم گھر بھر میں آزادی سے پھرتے۔ شادی کے گھر میں کئی خاندان اکٹھے رہتے تھے اور بہت سے لڑکے لڑکیاں جمع ہو جاتیں تھیں۔ ان موقعوں پر مجھے تنہائی کی شکایت نہیں ہو سکتی تھی۔ ہم دل بھر کر کھیل کود اور شرارت کا لطف اٹھاتے اور کبھی کبھی بڑوں کی ڈانٹ بھی کھاتے۔

ہندوستان کے غریبوں اور امیروں کی شادیوں کو بے جانمائش اور فضول خرچی کی وجہ سے بہت کچھ برا بھلا کہا گیا ہے اور وہ اس کی مستحق بھی ہیں۔ فضول خرچی کے علاوہ اس عامیانہ آرائش کو دیکھ کر جس میں نفاست اور خوشی مذاقی کا نام تک نہیں ہوتا، بڑی تکلیف ہوتی ہے۔ ظاہر ہے کہ بعض صورتیں اس سے متشبی بھی ہوتی ہیں۔ اس کا الزام اصل میں اوسط طبقے کے لوگوں پر ہے۔ غریب لگو بھی فضول خرچ ہوتے ہیں، اور اس کی وجہ سے اکثر قرض کے بوجھ میں دب جاتے ہیں۔ مگر یہ بات جو بعض حضرات کہا کرتے ہیں، بالکل مہمل ہے کہ ان کا افلاس ان رسموں کی وجہ سے ہے۔ لوگ اس کو نہیں دیکھتے کہ غریبوں کی زندگی بالکل پھینکی اور سپاٹ ہوتی ہے اور شادی کے موقع پر جو تھوڑا سا گانا بجانا، کھانا کھلانا ہوتا ہے وہ ان کے بے روح مشقت کی خشکی میں ذر سار س پیدا کر دیتا ہے اور دم بھر کے لئے انہیں گھر میں گھسے رہنے اور بے لطف کام میں جتے رہنے سے نجات دے دیتا ہے۔ ایسا کون بے درد ہو گا کہ ان بچاروں کو جو کبھی کبھار ہنسنے کا موقع مل جاتا ہے اس سے بھی انہیں محروم کر دے؟ آپ شوق سے فضول خرچی کو روکنے۔ تکلفات کو کم کیجئے۔

(ان بچاروں کی غریباً منو خوشیوں کے لئے اتنے بڑے بڑے لفظ استعمال کرنا

حماقت معلوم ہوتا ہے) مگر خدا کے لئے ان کی زندگی کو اور زیادہ بے رنگ اور اداس نہ بنائیے۔

اسی طرح اوسط طبقوں میں بھی، فضول خرچی اور تکلف سے قطع نظر کر کے دیکھا جائے تو یہ شادیاں وہ صحبتیں ہیں جن میں دور افتادہ عزیز اور دوست مدت کے بعد مل بیٹھتے ہیں۔ ہندوستان بہت بڑا ملک ہے۔ یہاں دوستوں سے ملنا سہل نہیں ہے۔ خصوصاً بہت سے دوستوں کا ایک جگہ اکٹھا ہونا بہت دشوار ہے اسی وجہ سے شادی کی تقریبیں اس قدر ہر د عزیز ہیں۔ صرف سیاسی مجلسیں یعنی کانگریس یا اس قسم کی اور کانفرنسیں ان کا مقابلہ کر سکتی ہیں بلکہ سچ پوچھئے تو لطف صحبت کے لحاظ سے بھی ان سے بڑھ گئی ہیں۔

کشمیری ایک لحاظ سے اور ہندوستان خصوصاً شمال کے رہنے والوں سے فائدے میں ہیں۔ ان کے یہاں پردے کی رسم کبھی بھی نہیں تھی۔ جب وہ بچے کے میدانوں میں آئے اور انہوں نے یہاں پردے کا رواج دیکھا تو انہوں نے بھی اسے اختیار کر لیا اس لئے کہ وہ عموماً شمالی ہند میں رہے اور یہاں یہ شرافت کی لازمی شرط سمجھی جاتی تھی مگر پھر بھی ان میں زیادہ گہرا پردہ نہیں اروجو ہے وہ بھی صرف غیر کشمیریوں کے مقابلے میں ہے۔ آپس میں ان کے یہاں عورت مرد آزادی سے ملتے ہیں اور ہر کشمیری بے تکلف دوسرے کشمیریوں کے گھر میں داخل ہو سکتا ہے۔ ان کی تقریبوں اور دعوتوں میں عورتیں اور مرد ساتھ ساتھ شریک ہوتے ہیں اگرچہ عموماً عورتوں کی ٹولی الگ بیٹھی ہے۔ لڑکے لڑکیاں کم وہ بیش برابری کے ساتھ ملتی جلتی ہیں۔ البتہ مغرب کی سی آزادی ان میں نہیں ہے۔

اس طرح سے میری زندگی کے ابتدائی سال گزرے۔ بعض اوقات جیسا کہ بڑے خاندانوں میں لازمی طور پر ہوتا ہے، آپس میں لڑائی بھی ہو جایا کرتی تھی۔ جب یہ بہت بڑھ جاتی تو میرے والد کو خبر ہوتی، وہ بہت خفا ہوتے تھے اور ان کا

خیال تھا کہ یہ سب عورتوں کی بے وقوفی کا نتیجہ ہے۔ یہ تو میری سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ قصہ کیا ہے مگر میں دیکھتا تھا کہ لوگ ایک دوسرے سے بری طرح گفتگو کرتے ہیں یا کھنچے کھنچے رہتے ہیں۔ مجھے اس سے بہت رنج ہوتا تھا اگر والد نے دخل دیا تو گھر بھر اٹھتا تھا۔

اس زمانے کا ایک چھوٹا سا واقعہ میرے حافظے میں اب تک نقش ہے۔ میری عمر کوئی سات آٹھ برس کی ہوگی۔ میں روز چھاؤنی کے ایک سوار کے ساتھ گھورے پر سیر کرنے جایا کرتا تھا۔ ایک دن شام کو میں گر پڑا، اور میرا ٹٹو (یہ بڑا خوب صورت جانور تھا جس میں عرب خون بھی شامل تھا) میرے بغیر گھر واپس گیا۔ والد کے یہاں اس وقت ٹینس پارٹی تھی۔ ایک ہل چل مچ گئی اور پارٹی کے سب کے سب لوگ میرے والد کے پیچھے مختلف سوار یوں کا ایک جلوس بنا کر مجھے ڈھونڈنے نکلے۔ میں انہیں راستے میں مل گیا اور انہوں نے مجھے اس طرح ہاتھوں ہاتھ لیا جیسے میں نے کوئی بڑا بہادری کا کام کیا ہو۔

تھیوسوفی

جب میں دس سال کا ہوا تو ہم لوگ ایک نئے گھر میں اٹھ گئے جو پہلے گھر سے بہت بڑا تھا۔ اس کا نام میرے والد نے ”آئیند بھون“ رکھا۔ اس میں ایک بہت بڑا باغ اور ایک تیرنے کا حوض تھا اور میں بڑے جوش میں روزی نئی چیزیں دریافت کرتا تھا۔ عمارت میں اضافہ ہو رہا تھا اور رکھودنے بنانے کا کام زوروں پر تھا۔ میں بڑے شوق سے مزدوروں کو کام کرتے دیکھا کرتا تھا۔

تیرنے کا بڑا حوض گھر میں تھا ہی اس لئے میں بہت جلد تیرنا سیکھ لیا اور پانی سے مانوس ہو گیا۔ گرمی کے لمبے پتے دنوں میں وقت بے وقت حوض میں جا کر ڈبکی لگاتا تھا۔ یہ میرے لئے ایک انوکھا تماشہ تھا اور بجلی کی روشنی جو اس میں اور سارے گھر میں لگی تھی ان دنوں الہ آباد میں نئی چیز سمجھی جاتی تھی۔ سب کے ساتھ مل کر نہانے سے میں بہت خوش ہوتا تھا اور جو لوگ تیرنا نہیں جانتے تھے، انہیں پانی میں دھکیل کر یا کھینچ کر ڈرانے میں بڑا مزہ آتا تھا۔ ان میں ڈاکٹر تیج بہادر سپرو کی حالت مجھے خاص طور پر یاد ہے جو اس زمانے میں الہ آباد میں وکالت کا کام سیکھ رہے تھے۔ وہ تیرنا جانتے بھی نہیں تھے اور سیکھنا بھی نہیں چاہتے تھے۔ وہ پہلی سیڑھی پر، ڈیڑھ فٹ پانی میں بیٹھے رہتے اور دوسری سیڑھی تک جانے پر بھی کسی طرح راضی نہ ہوتے۔ اگر کوئی انہیں سرکانا چاہتا تو بہت چپختے چلاتے۔ میرے والد کو بھی تیرنا کچھ یوں ہی سا آتا تھا۔ مگر وہ دانت بھینچ کر اور تن بدن کا زور لگا کر کسی نہ کسی طرح حوض کو پار کر لیتے تھے۔

ان دنوں جنوبی افریقہ میں بوئر لڑائی چھڑی ہوئی تھی۔ مجھے اس سے بڑی دلچسپی تھی اور میں دل و جان سے بوئروں کا طرفدار تھا۔ لڑائی کے خبروں کے شوق میں، میں نے اخبار پڑھنا شروع کر دیا۔

مگر اسی زمانے میں ہمارے گھر میں ایک نئی بات ہوئی جس نے مری ساری

توجہ اپنی طرف کھینچ لی، یعنی میری چھوٹی بہن پیدا ہوئی۔ میں دل ہی دل میں کڑھا کرتا کہ میرے کوئی بھائی بہن نہیں اور سب کے ہیں اس لئے یہ امید بڑی خوش گوار تھی کہ ایک ننھا سا بھائی یا ننھی سی بہن ہونے والی ہے جو خاص میری ہی ہوگی۔ والد ان دنوں یورپ گئے ہوئے تھے۔ مجھے یاد ہے کہ میں برآمدے میں بڑی بے چینی سے اس واقعے کا انتظار کر رہا تھا۔ اتنے میں ایک ڈاکٹر آ کر مجھے یہ خبر سنئی اور کہا کہ تم یہ خوش ہو گے کہ لڑکا نہیں ہوا ورنہ وہ باپ کے تر کے میں حصہ بٹاتا۔ اس نے یہ بات مذاق میں کہی ہوگی مگر مجھے بڑا غصہ آیا کہ یہ شخص سمجھتا ہے کہ میں ایسا ناپاک خیال دل میں لاسکتا ہوں۔

والد کے یورپ جانے سے ہندوستان کے کشمیری برہمنوں میں بڑی کھلبلی مچی ہوئی تھی۔ انہوں نے واپس آ کر پرائیڈت یعنی پاک کئے جانے کی رسم ادا کرنے سے انکار کر دیا۔ چند سال پہلے ایک اور کشمیری برہمن یعنی پنڈت بشن نرائن در، جو آگے چل کر کانگریس کے صدر ہوئے پیرسٹری پاس کرنے انگلستان گئے تھے ان کی واپسی پر برادری کے کٹر لگوں نے انہیں ذات سے باہر کر دیا حالانکہ انہوں نے پرائیڈت بھی کر لیا تھا۔ اس بنا پر برادری قریب قریب برابر کے دو حصوں میں تقسیم ہو گئی تھی۔ اس کے بعد بہت سے کشمیری نوجوان یورپ گئے اور وہاں سے آ کر اصلاح پسند فرقے میں شامل ہو گئے مگر اسی وقت جب وہ پرائیڈت کر چکے تھے۔ اس رسم کا خالی ایک دھکوسلا تھا جسے مذہب سے ذرا بھی لگاؤ نہ تھا۔ اس کے معنی یہ تھے کہ انسان جماعت کے آگے سر جھکائے اور اس کے دستور کی ظاہری پابندی کر لے پھر وہ دھرم کے خلاف جو چاہتا کرتا اور غیر برہمن اور غیر ہندو لوگوں کے ساتھ اٹھتا بیٹھتا کھاتا پیتا۔

والد نے ایک قدم اور آگے بڑھایا اور کسی قسم کی رسم ادا کرنے سے یہاں تک کہ نام کے لئے پرائیڈت کرنے سے بھی صاف انکار کر دیا۔ اس پر بڑی برہمنی پھیلی

خصوصاً اس وجہ سے کہ والد کا طرز عمل بہت سخت اور کسی قدر حقارت آمیز تھا۔ آخر میں بہت سے کشمیری والد کے ساتھ ہو گئے اور ایک تیسرا فرقہ بن گیا۔ چند سال کے اندر جوں جوں خیالات بدلتے گئے اور پرانی بندشیں ٹوٹی گئیں۔ ان فرقوں میں رفتہ رفتہ میل ہوتا گیا۔ کشمیری لڑکے اور لڑکیاں بہت بڑی تعداد میں یورپ اور امریکہ میں تعلیم پا کر آئے اور پرائیویٹ کا کوئی سوال نہیں اٹھا۔ کھانے پینے کی قید بھی قریب قریب اٹھ گئی اور چند کٹر آدمیوں خصوصاً بوڑھی عورتوں کے سوا سب غیر کشمیریوں مسلمانوں اور بدیسیوں کے ساتھ مل کر کھانے لگے۔ پردہ کشمیری عورتوں میں دوسرے فرقوں سے بھی باقی نہیں رہا۔ اس کا رہا سہا کھوج ۳۰ء کے سیاسی تحریک نے مٹا دیا۔ دوسرے فرقوں سے شادی بیاہ ابھی عام نہیں ہے مگر اس کی مثالیں بھی دیکھنے میں آتی ہیں اور روز بروز بڑھ رہی ہیں۔ میری دونوں بہنوں کی شادی غیر کشمیریوں میں ہوئی ہے اور ہمارے خاندان کے ایک نوجوان نے ایک ہنگری کی لڑکی سے شادی کی ہے۔ برادری کے باہر شادی کرنے کی مخالفت مذہبی حکم نہیں بلکہ معاشرتی مسئلہ ہے۔ بہت سے کشمیری یہ چاہتے ہیں کہ اپنی جماعت کی ”شخصیت“ اور اپنے خاص آریائی خط و خال قائم رکھیں اور انہیں ڈر ہے کہ ہندوستانی اور غیر ہندوستانی انسانوں کے سمندر میں ملنے کے بعد ان چیزوں کا پتہ بھی نہ لگے گا۔ ہم لوگوں کی تعداد اس عظیم الشان ملک کی کل آبادی کے مقابلے میں بہت ہی کم ہے۔

غالباً زمانہ حال میں کشمیری برہمنوں میں سب سے پہلے مرزا موہن لال کشمیری اب سے کوئی سو برس پہلے مغربی ملکوں میں گئے۔ یہ ایک ذہن اور خوش رو نوجوان تھے اور دلی کے مشن کالج میں پڑھتے تھے۔ جب برطانوی مہم کا بل بھیجی گئی تو فارسی کے ترجمان کی حیثیت سے اس کے ساتھ جانے کے لئے منتخب کئے گئے اس کے بعد انہوں نے سارے وسط ایشیا اور ایران کا سفر کیا۔ جہاں کہیں جاتے ایک نئی شادی کرتے اور وہ بھی عموماً کسی اونچے گھرانے میں۔ انہوں نے اسلام قبول کر لیا اور

ایران میں ان کی شادی شاہی خاندان کی ایک لڑکی سے ہو گئی۔ اسی وجہ سے انہیں مرزا کا خطاب ملا۔ وہ یورپ گئے اور نو جوان ملکہ وکٹوریہ کی خدمت میں پیش کئے گئے۔ انہوں نے اپنی زندگی کے حالات اور سفر کے واقعات بڑے دلچسپ انداز میں لکھے ہیں۔

کوئی گیارہ برس کی عمر میں، میں ایک نئے اتالیق فرڈینیڈ - ٹ - بروکس کے سپرد کیا گیا۔ ان کے باپ آئرستان کے اور ماں فرانس یا بلجیم کی تھیں وہ بڑے جوش تھیو سوف تھے اور مسز اینی بیسنٹ نے والد سے ان کی سفارش کی تھی۔ تین سال تک وہ میرے ساتھ رہے اور ان کا مجھ پر کئی طرح سے بہت گہرا اثر پڑا۔ اس زمانے میں میرے صرف ایک ہی اتالیق اور تھے یہ ایک نیک دل بوڑھے پنڈت تھے جو مجھے ہندی اور سنسکرت پڑھانے کے لئے رکھے گئے تھے۔ کئی سال کی کوشش میں پنڈت جی مجھے جو کچھ پڑھا سکے وہ اتنا تھوڑا تھا کہ لاطینی کی طرح جو میں نے آگے چل کر ہیرو میں سیکھی، سنسکرت میں بھی شدید سے آگے نہیں بڑھا۔ قصور یقیناً میرا ہی تھا۔ میں زبانی سیکھنے میں کچا تھا خصوصاً قواعد سے مجھے مطلق دلچسپی نہ تھی۔

ف - ٹ بروکس نے میرے دل میں مطالعے کا ذوق پیدا کر دیا اور میں نے انگریزی کی بہت سی کتابیں پڑھ ڈالیں مگر بغیر کسی سلسلے یا مقصد کے۔ بچوں اور لڑکوں کی کتابوں پر مجھے خاص عبور تھا۔ میری محبوب کتابیں لیونس کیروں کی تصانیف اور جنگل کی داستان (۱) اور ”کم“ تھیں۔ ”ڈان کونٹوٹ“ میں کٹاؤ درے نے جو تصویریں بنائی ہیں وہ مجھے بہت پسند تھیں۔ فریڈیوف نالسن کی کتاب ”شمال کا آخری سرا“ (۲) پڑھ کر من چلے پن کے کاموں کا ایک نیا عالم میری نظروں میں پھرنے لگا۔ اسکاٹ، ڈکنس اور تھیکرے کے ناول، مارک ٹوین کی کتاب ایچ۔ جی ویلس کے رومان اور شیر لاک ہومس والے قصے بھی میں نے پڑھے تھے۔ ”زندہ کے قیدی“ (۳) کے مطالعے سے مجھے بڑی عبرت ہوئی اور جیروم - ک جیروم کی

کتاب ”تین آدمی ایک کشتی میں“ میرے نزدیک ظرافت کی انتہا تھی۔ دوسرے کی ”ٹرلی“ اور پیٹر ایٹسن“ کا نقش بھی اب تک میرے حافظے میں موجود ہے۔ شعر سے مجھے بہت شوق تھا اور گو میری زندگی نے بہت سے پلٹے کھائے مگر یہ شوق تھوڑا بہت اب تک موجود ہے۔

بروکس نے مجھے سائنس کے اسرار سے بھی آشنا کر دیا۔ ہم دونوں نے مل کر ایک چھوٹا سا عمل (۴) بنالیا۔ میں اس میں بڑی دلچسپی کے ساتھ گھنٹوں کیما اور طبقات کے تجربے کرتا تھا۔ پڑھنے لکھنے کے علاوہ، بروکس نے میری زندگی پر ایک نیا اثر ڈالا جس سے میں ایک عرصہ تک بہت متاثر رہا۔ وہ اپنی قیام گاہ میں ہر ہفتے تھیوسوفیوں کی صحبت منعقد کرتے تھے جس میں میں بھی شریک ہوتا تھا۔ رفتہ رفتہ ان کی اصطلاحیں اور خیالات میرے دل میں بس گئے۔ وہاں فلسفے کے مسئلے چھڑے رہتے تھے۔ اوتاروں، ہمزادوں، نور کے حلقوں (۵) اور کرما (۶) کے نظریے کی بحث ہوا کرتی تھی۔ میڈم بلاواٹسکی اور دوسرے تھیوسوفیوں کی موٹی موٹی کتابوں کے علاوہ ہندو شاستروں، بدھ مت کے ”دھام پد“، فیشا غورث، پولونیس اور مختلف فلسفیوں اور باغیوں کی تصانیف کے حوالے دئے جاتے تھے۔ بہت سی باتیں میری سمجھ سے باہر تھیں۔ مگر سننے میں یہ ساری راگ مالا بہت پر اسرار اور دلکش معلوم ہوتی تھی اور میں دل میں کہتا تھا کہ دنیا بھر کے بھیدوں کی کنجی یہی ہے۔ یہ پہلا موقع تھا کہ میں نے جان بوجھ کر مذہب اور دوسری دنیا کے بارے میں سوچنا شروع کیا۔ خصوصاً ہندو دھرم کی وقعت میری نظر میں بہت بڑھ گئی، اس کی رسموں کی نہیں بلکہ اس کے جید کتابوں اپنشد اور بھگوت گیتا کی۔ ظاہر کے کہ ان کا مطلب نہیں سمجھتا تھا مگر ان کی عبارت بڑی اچھی معلوم ہوتی تھی۔ میں خواب میں ہمزادوں کو دیکھا کرتا تھا اور کبھی کبھی اپنے آپ کو آسمان پر اڑتا ہوا پاتا تھا۔ یہ خواب کہ میرا جسم آپ ہی آپ اڑتا چلا جا رہا ہے۔ مجھے اپنی زندگی میں اکثر نظر آیا ہے۔ بعض اوقات تو یہ

بہت ہی صاف اور واضح ہوتا اور مجھے زمین اپنے قدموں کے نیچے دو دور تک پھیلی ہوئی نظر آتی تھی۔ معلوم نہیں آج کل کے تعبیر بتانے والے فروئیڈ وغیرہ ان خوابوں کی کیا تعبیر کریں گے۔

اسی زمانے میں مسز اینی بیسنٹ الہ آباد آئیں اور انہوں نے تھیوسوفی کے موضوع پر کئی لکچر دئے۔ میں ان کی خطابت سے بہت متاثر ہوا اور جب ان کی تقریروں سے لوٹا تو مجھ پر ایک بے خودی کا عالم طاری ہو جاتا، گویا میں خواب دیکھ رہا ہوں۔ میں نے تھیوسوفی کی انجمن میں شریک ہونے کا ارادہ کر لیا اگرچہ میری عمر اس زمانے میں صرف تیرہ برس کی تھی۔ جب میں نے والد سے پوچھا تو انہوں نے ہنس کر اجازت دے دی۔ ان کے نزدیک اس مسئلے کی کوئی اہمیت نہ تھی نہ وہ اس کی مخالفت کی ضرورت سمجھتے تھے اور نہ موافقت کی۔ مجھے اس سرد مہری سے کسی قدر تکلیف ہوئی اگرچہ اور باتوں کے لحاظ سے میری نظر میں ان کی بڑی عظمت تھی مگر یہ سمجھتا تھا کہ ان میں روحانیت کی کمی ہے۔ اصل میں وہ خود تھیوسوف رہ چکے تھے اور ابتدائی زمانے میں جب میڈم بلاواؤسکی ہندوستان آئی تھیں اس جماعت میں شریک ہوئے تھے۔ انہوں نے مذہبی جذبے کی بنا پر نہیں بلکہ ایک نئی چیز کے شوق میں شرکت کر لی تھی اور تھوڑے ہی دن بعد الگ ہو گئے۔ مگر ان کے بعض دوست جو انہیں کے ساتھ ممبر ہوئے تھے، جھے رہے اور جماعت کے اعلیٰ روحانی مدارج پر پہنچ گئے۔

غرض میں تیرہ برس کی عمر میں تھیوسوفی انجمن کا رکن ہو گیا اور خود مسز بیسنٹ نے میرے داخلے کی رسم ادا کی۔ انہوں نے مجھے اچھی اچھی نصیحتیں کیں اور بعض پر اسرار نشانیاں تعلیم کیں جو غالباً فراموشوں سے لی گئی تھیں۔ میرے جسم میں اس وقت ایک بجلی سی دوڑ گئی۔ اس کے بعد بنارس میں تھیوسوفوں کی کانفرنس میں شریک ہوا جہاں مجھے کرناٹ الکاٹ اور ان کی شان دار داڑھی کی زیارت نصیب ہوئی۔

اس کا اندازہ کرنا مشکل ہے کہ اب سے تیس برس پہلے لڑکپن کے زمانے میں میری صورت کیسی تھی اور خیالات کیا تھے۔ مگر جہاں تک مجھے یاد ہے اس تھیوسوفی دور میں میرے چہرے پر وہ افسردگی اور بے رونقی چھا گئی تھی جو پریزگاری کی علامت سمجھی جاتی ہے۔ اور تھیوسوف مردوں اور عورتوں میں اکثر نظر آتی ہے یا کم سے کم اس زمانے میں نظر آتی تھی۔ ایک برگزیدہ ہستی ہونے کے احساس نے میری صورت اور سیرت میں کچھ عجیب روڑھ پین پیدا کر دیا تھا غرض میری عمر کے لڑکوں اور لڑکیوں کو میری صحبت ایک مصیبت معلوم ہوتی ہوگی۔

کچھ عرصے بعد ف۔ ٹ بروکس رخصت ہو گئے۔ اور مجھے تھیوسوفی سے زیادہ سابقہ نہیں رہا۔ اس کے تھوڑے ہی دن بعد میری زندگی کا تھیوسوفی کا دور بالکل ختم ہو گیا جس کا ایک سبب شاید یہ بھی ہوا کہ میں اسکول کی تعلیم کے لئے انگلستان بھیج دیا گیا مگر جو زمانہ ف۔ ٹ۔ بروکس کے ساتھ گزرا تھا اس کا گہرا نقش میرے دل پر باقی ہے اور میں ان کے اور تھیوسوفی کے احسان سے انکار نہیں کر سکتا۔ مگر سچ پوچھئے تو اس عرصے میں تھیوسوفی کی وقعت میری نظر میں بہت کم ہو گئی ہے۔ اب وہ مجھے برگزیدہ ہستیاں نہیں بلکہ معمولی قسم کے آدمی معلوم ہوتے ہیں جو سلامتی کو خطرے پر اور آسائش کو شہادت پر ترجیح دیتے ہیں البتہ مسز بیسنٹ کا میں ہمیشہ دل سے قائل رہا۔

اس کے بعد جس اہم واقعے سے میں متاثر ہوا وہ روس اور جاپان کی لڑائی تھی۔ جاپان کی فتوحات سے مجھے بڑا جوش آتا اور میں نئی نئی خبریں معلوم کرنے کے لئے بے چینی سے اخباروں کا انتظار کیا کرتا تھا۔ میں نے جاپان کے متعلق بہت سے کتابیں خریدیں اور ان میں سے بعض کو پڑھنے کی کوشش بھی کی۔ جاپان کی تاریخ میں تو میں الجھ کر رہ جاتا تھا مگر قدیم جاپان کے سو رماؤں کے قصوں اور لیف کیڈو ہارن کی شگفتہ عبارت میں مجھے بہت لطف آتا تھا۔ میرا دل قومیت کے جذبے سے

معمور تھا اور سوچا کرتا تھا کہ کاش ہندوستان اور سارے ایشیا کو یورپ کی غلامی سے نجات مل جائے۔ میں بہادری کے کاموں کے منصوبے باندھا کرتا تھا کہ یوں تلوار ہاتھ میں لے کر ہندوستان کی خاطر لڑوں گا اور اسے آزاد کراؤں گا۔

اب میری عمر چودہ برس کی ہو گئی تھی۔ ہمارے گھر میں بہت کچھ تبدیلیاں ہو رہی تھیں۔ میرے رشتے کے بھائی جو مجھ سے عمر میں بہت بڑے تھے، اپنے اپنے کاروبار میں لگ گئے تھے اور اب وہ مشترکہ مکان کو چھوڑ کر اپنے گھر بار الگ کر رہے تھے۔ میرے دل میں نئے خیالات اور دھندلے تصورات منڈلا رہے تھے اور مجھے عورتوں سے کچھ زیادہ دلچسپی پیدا ہو چلی تھی۔ میں اب تک لڑکوں کی صحبت میں رہنے کو ترجیح دیتا تھا اور لڑکیوں سے ملنا جلنا اپنی شان کے خلاف سمجھتا تھا۔ مگر کبھی کبھی کشمیریوں کی دعوتوں اور تقریبوں میں جہاں حسین لڑکیاں کثرت سے ہوتی تھیں، یا واقعات پر نظر سے نظر مل جانے، یا بدن سے بدن چھو جانے سے میرے جسم میں بجلی سے دوڑ جاتی تھی۔

مئی ۱۹۰۵ء میں جب میری عمر پندرہ برس کی تھی میرے والد، مجھے میری والدہ اور میری چھوٹی بہن کو لے کر انگلستان روانہ ہو گئے۔

The Jungle Book (۱)

Farthest North. (۲)

The Prisoners of Zenda. (۳)

Laboratory. (۴)

Auras (۵) نور کے حلقے جوتھیوسوفیوں اور دوسرے باطنیوں کے نزدیک

انسانوں کو گھیرے رہتے ہیں، ہر انسان کا حلقہ الگ ہوتا ہے۔

(۶) جزا اور سزا کا ابدی دور۔

ہیرو اور کیمبرج

آخر مئی کی کسی تاریخ کو ہم لندن پہنچے۔ ڈور سے ریل روانہ ہونے کے بعد رستے میں ہم نے یہ خبر پڑھی کہ جاپان کو ٹوشیما کے مقام پر بڑی زبردست بحری فتح حاصل ہوئی۔ میں خوشی سے پھولا نہ سانا تھا۔ دوسرے ہی دن ڈربی کی گھوڑ دوڑ تھی اور ہم سب اس کا تماشا دیکھنے گئے وہاں سے لوٹ کر ہماری ملاقات ڈاکٹر مختار احمد انصاری سے ہوئی جو اس زمانے میں ایک ذہین اور مستعد نوجوان تھے اور اپنی تعلیم میں نہایت اعلیٰ درجے کی کامیابی حاصل کر چکے تھے۔ ان دنوں وہ لندن کے ایک ہسپتال میں ہاؤس سرجن تھے۔

میری خوش قسمتی سمجھئے کہ مجھے ہیرو میں جگہ مل گئی کیونکہ میری عمر پندرہ برس کی ہو چکی تھی اور یہ داخلے کی مقررہ عمر سے کچھ تھوڑی سے زیادہ تھی۔ میرے خاندان کے لوگ یورپ کے اور ملکوں کو چلے گئے اور وہاں سے ہندوستان واپس ہو گئے۔

یہ پہلا موقع تھا کہ میں نے اپنے باپ کو غیروں میں بالکل اکیلا پایا مجھے تنہائی اور گھر کی یاد ستانے لگی۔ مگر یہ حالت زیادہ دن نہیں رہی۔ میرا قدم اسکول میں تھوڑا بہت جم گیا، اور پڑھنے میں اور کھیل میں وقت گزرنے لگا۔ مگر میں وہاں پوری طرح کبھی نہیں کھپ سکا۔ ہمیشہ یہ احساس رہتا تھا کہ میں ان لوگوں میں سے نہیں ہوں اور شاید وہ لوگ بھی مجھے غیر سمجھتے ہوں گے، پھر بھی میں کھیلوں میں پورا حصہ لیتا تھا۔ اگرچہ ان میں کسی قسم کا امتیاز حاصل نہیں کر سکا۔ میرے خیال میں یہ بات مان لی گئی تھی کہ میں کسی کام سے جی چرانے والا نہیں۔

شروع میں میرا داخلہ چھوٹے درجے میں ہوا اس لئے کہ میں لاطینی بہت کم جانتا تھا مگر تھوڑے ہی دن میں مجھے ترقی مل گئی۔ بہت سے مضمونوں میں خصوصاً عام معلومات میں میں اپنی عمر کے لڑکوں سے آگے تھا۔ میرا ذوق زیادہ وسیع تھا اور میں اپنے اکثر ساتھیوں سے زیادہ کتابیں اور اخبار پڑھتا تھا۔ مجھے یاد ہے کہ میں نے

اپنے والد کو ایک خط میں لکھا تھا کہ انگریز لڑکے اکثر ٹھس ہوتے ہیں اور اپنے کھیلوں کے اور کسی چیز کے متعلق گفتگو نہیں کر سکتے۔ تاہم مجھے بعض تیز لڑکے بھی نظر آئے خصوصاً اونچی جماعتوں میں پہنچنے کے بعد۔

مجھے پارلیمنٹ کے عام انتخاب سے جو غالباً ۱۹۰۵ء کے آخر میں ہوا بہت دلچسپی تھی۔ اس میں لبرلک جماعت نے بڑی فتح پائی ۱۹۰۶ء کے شروع میں ہمارے استاد نے ہم سے نئی حکومت کے بارے میں سوال کیا اور انہیں بڑا تعجب ہوا کہ ساری جماعت میں صرف میں ہی نے ان کے سوال کا اچھی طرح جواب دیا۔ بلکہ کیمبل بیز میں کی مجلس وزراء کی قریب قریب پوری فہرست زبانی سنادی۔ سیاست کے علاوہ ایک اور چیز سے بھی مجھے خاص شوق تھا اور وہ ہوائی جہاز رانی کی ابتدائی نشوونما تھی۔ یہ رائٹ برادران اور سینٹوس ڈومونٹ کا زمانہ تھا (جس کے بعد ہی ارمن تھیم اور بلیرو یوکا دور آیا) اور میں نے اپنے جوش میں ہیرو سے والد کو لکھا تھا کہ بہت جلد میں سینچر اتوار کی چھٹی میں ہوائی جہاز سے ہندوستان آیا کروں گا۔

میرے زمانے میں ہیرو میں چار پانچ ہندوستانی لڑکے تھے۔ ان میں سے جو اور ہوٹلوں میں رہتے تھے ان سے میری بہت کم ملاقات ہوئی تھی۔ خود میرے ہوٹل میں جس کے نگران ہیڈ ماسٹر تھے، مہاراج بڑودہ کے صاحبزادے تھے اور بعد میں مہاراج کپور تھلہ کے بڑے صاحبزادے پریم جیت سنگھ بھی آگئے جواب کا صاحب ہو گئے ہیں۔ وہ اس مدرسے میں بالکل نہیں کھپتے تھے۔ ہمیشہ اداس رہا کرتے اور دوسرے لڑکوں سے ملنے جلنے سے گھبراتے۔ جب یہ لوگ ان کا مذاق اڑاتے تو وہ بہت خفا ہوتے اور کہتے کہ کبھی کپور تھلے آئے تو سمجھ لوں گا۔ ظاہر ہے کہ اس سے معاملہ اور بگڑ جاتا تھا۔ وہ یہاں آنے سے پہلے کچھ دن فرانس میں رہ چکے تھے اور فرانسیسی زبان روانی سے بولتے تھے مگر یہ لطف دیکھنے کے اس سے انہیں اپنے فرانسیسی کے سبق میں کوئی مدد نہیں ملتی تھی۔ یہ اس طریقہ تعلیم کی برکت تھی جو انگلستان

کے پبلک اسکولوں میں غیر زبانوں کی تعلیم دینے کے لیے اختیار کیا جاتا تھا۔ ایک بار عجیب واقعہ ہوا۔ آدھی رات کو یکا یک ہوٹل کے نگراں ہمارے کمروں میں پہنچے اور سب کی تلاشی لی گئی۔ معلوم ہوا کہ پرم جیت سنگھ کی سونے کی شام کی خوشنما چھڑی غائب ہو گئی ہے۔ تلاشی کا کوئی نتیجہ نہیں نکلا۔ دو تین دن میں لارڈ کے میدان میں اسٹین اور ہیرو کا میچ ہوا اور اس کے بعد ہی وہ چھڑی مالک کے کمرے میں پائی گئی۔ ظاہر ہے کہ کوئی صاحب اسے لے کر میچ دیکھنے گئے تھے اور پھر واپس کر گئے۔

ہمارے ہوٹل میں اور دوسرے ہوٹلوں میں چند یہودی بھی تھے ان لوگوں سے اچھی خاصی نبھتی تھی مگر دلوں میں سامی نسل سے کسی قدر نفرت ضرور موجود تھی۔ یہ ”ملعون یہودی“ کہلاتے تھے اور قریب قریب غیر شعوری طور پر میں بھی یہ سمجھنے لگا کہ ان سے نفرت کرنا فیشن میں داخل ہے۔ مگر اصل میں مجھے سامی نسل سے کوئی کد نہ تھی اور آگے چل کر کئی یہودیوں سے میری بڑی دوستی ہو گئی۔

میں ہیرو سے مانوس ہو گیا تھا اور اسے بہت پسند کرتا تھا مگر اب یہ احساس ہو چلا تھا کہ میں اس کی سطح سے اونچا ہوتا جاتا ہوں۔ میرا دل یونیورسٹی کی طرف کھینچ رہا تھا۔ ۱۹۰۶ء اور ۱۹۰۷ء میں ہندوستان کی خبریں انگلستان کے اخباروں میں بہت مجمل طور پر آتی تھیں۔ مگر ان سے بھی یہ پتہ چلتا تھا کہ بنگال، پنجاب اور مہاراشٹر میں بڑے بڑے واقعات ہو رہے ہیں۔ لالہ جت رائے اور اجیت سنگھ جی جلاوطن کر دئے گئے تھے۔ بنگال میں شورش برپا تھی۔ پونا سے تلک کی جدوجہد کے متعلق تار آ رہے تھے سودیشی اور بائیکاٹ کا زور تھا۔ ان سب باتوں نے میرے دل میں سخت ہیجان پیدا کر دیا تھا مگر ہیرو میں ایک شخص بھی ایسا نہ تھا جس سے میں اس کا ذکر کر سکوں۔ البتہ چھٹیوں میں اپنے رشتے کے بھائیوں سے یا اور ہندوستانی دوستوں سے ملنا ہوتا تھا اور میں اپنے دل کا بوجھ ہلکا کرتا تھا۔

اسکول میں اچھا کام کرنے کے انعام میں مجھے ایک بارج۔م۔ٹریولین گاری بالڈی کی کتابیں ملیں۔ انہیں میں نے بہت شوق سے پڑھا اور بہت جلد اس سلسلے کی باقی دو کتابیں بھی مہیاک کے گاری بالڈی کے سارے حالات کا غور سے مطالعہ کیا۔ میری نظروں میں یہ نقشے پھرنے لگے کہ ہندوستان میں ایسے ہی کار نمایاں انجام پا رہے ہیں اور آزادی کی خاطر بڑی بہادری سے جنگ ہو رہی ہے۔ ان خیالات کی وسعت کے آگے ہیر و ایک تنگ اور محدود جگہ معلوم ہونے لگی اور میرا دل یونیورسٹی کی وسیع تر فضا کو ڈھونڈھنے لگا۔ چنانچہ میں اپنے والد کی اجازت حاصل کر کے ہیر و سے رخصت ہو گیا۔ یہاں میرا قدم صرف دو برس رہا جو مقررہ معیار سے بہت کم تھا۔ میں ہیر و سے اپنی خوشی سے جا رہا تھا مگر مجھے یاد ہے کہ جب رخصت ہونے کا وقت آیا تو میرا دل بھر آیا اور آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ مجھے اس سے ایک گونہ انس ہو گیا تھا اور اس کے چھوڑنے سے میری زندگی کا ایک دور ختم ہو گیا۔ مگر یہ میں نہیں کہہ سکتا کہ مجھے واقعی رنج تھا یا نہیں۔ شاید مجھے یہ احساس تھا کہ اس موقع پر اداس ہونا ضروری ہے۔ اس لئے کہ ہیر و کی روایات اور گیتوں کا یہ تقاضا ہے۔ میں ان روایات سے متاثر تھا اس لئے میں نے جان بوجھ کر ان روایات کے اثر سے بچنے کی کوشش نہیں کی تھی تا کہ جس جگہ رہتا ہوں اس سے ہم آہنگ ہو جاؤں۔

شروع اکتوبر ۱۹۰۷ء سترہ اٹھارہ برس کی عمر، ٹریٹنی کالج، کیمبرج کا منظر، میرا دل فخر و مسرت سے معمور تھا۔ اب میں یونیورسٹی کا طالب علم تھا، اور اسکول کے مقابلے میں بہت آزاد تھا۔ لڑکپن کی بیڑیاں کٹ چکی تھیں اور وہ دن آ گیا تھا کہ میں اپنے آپ کو بالغ کہہ سکوں۔ میں کیمبرج کے چوڑے چوکوں اور تنگ گلیوں میں اکڑتا پھرتا تھا اور کوئی جاننے والا مل جاتا تو مجھے بڑی خوشی ہوتی تھی۔

تین سال میں کیمبرج میں رہا اور یہ تین سال بے خلل سکون اور خاموشی سے گزر گئے جیسے کیم ندی دھیرے دھیرے بہتی ہے۔ یہ بھی کیا خوش گوار زمانہ تھا۔

بہت سے دوست، تھوڑا سا کام، تھوڑا سا کھیل اور دائرہ نظر کا آہستہ آہستہ بڑھنا۔ میں نے سائنس کی سند حاصل کی جس میں میرے مضمون کیمیا، ارضیات اور نباتیات تھے مگر میری دلچسپی انہیں مضامین تک محدود نہ تھی۔ میں جن لوگوں سے کیمبرج میں یا تعطیل کے زمانے میں لندن میں ملتا تھا وہ عالمانہ انداز سے ادب، تاریخ، سیاسیات اور معاشیات پر گفتگو کیا کرتے تھے۔ پہلے پہل تو ان غلیٹ جتانے والوں کی باتیں میری سمجھ میں نہیں آتی تھیں مگر جب میں نے تھوڑی سی کتابیں پڑھ ڈالیں تو مجھے اس کا ڈھب آ گیا اور کم سے کم اتنا ہو گیا کہ گفتگو کا سلسلہ جاری رکھ سکتا تھا اور معمولی موضوعوں سے اپنی ناواقفیت کا اظہار نہیں ہونے دیتا تھا۔ چنانچہ ہم نشے کے فلسفے (جس کا ان دنوں کیمبرج میں زور تھا) برنارڈ شا کے دیباچوں اور لوایس ڈکنسن کی نئی کتابوں پر بحث کیا کرتے تھے۔ ہم اپنے آپ کو بہت پختہ کار سمجھتے تھے۔ عورت مرد کے تعلقات اور اخلاقی مسئلوں کا ذکر اس طرح کرتے تھے کہ گویا ہم عام معیار سے بہت اونچے ہیں اور ایوان بلاک، ہیولاک، سلیس، کرافٹ اپنگ، آٹو ونگر کے حوالے اس بے پروائی سے دیتے تھے جیسے ان کی سب کتابیں چالے بیٹھے ہیں۔ اپنے نزدیک ہم اس موضوع سے اتنی واقفیت رکھتے تھے جتنی ایک غیر ماہر فن کو ہونی چاہیے۔

مگر سچ پوچھئے تو اس قدر بڑھ برھ کے باتیں بنانے کے باوجود ہم میں سے اکثر جنسی معاملات میں کچے اور جھینپو تھے۔ کم سے کم میرا یہی حال تھا اور بہت عرصے تک یعنی کیمبرج چھوڑنے کے بعد تک جنسی مسائل کے متعلق میری واقفیت محض نظری پہلو تک محدود رہی اس کی وجہ بتانا ذرا مشکل ہے۔ ہم میں سے اکثر میں جنسی رغبت بہت قوی تھی اور گناہ کا خیال شاید ہی کسی کو ہو۔ مجھے تو بالکل نہیں تھا۔ مذہب کی روک کو اس میں مطلق دخل نہ تھا۔ ہم لوگ ان چیزوں کو غیر اخلاقی کہا کرتے تھے یعنی نہ اچھی نہ بری مگر باوجود ان سب باتوں کے کچھ تو میرے شرمیلے

پن نے اور کچھ اس کراہت نے جو عشق بازی کے مروجہ طریقوں کو دیکھ کر ہوتی تھی۔ مجھے روک رکھا۔ میں ان دنوں بہت شرمیلا تھا شاید اس سبب سے کہ میرا بچپن تنہائی میں گزرا تھا۔

میرا عام تصور زندگی اس زمانہ میں ایک طرح کی دھندلی سی لذت پرستی تھی۔ اس میں کچھ تو جوانی کی ترنگ شامل تھی اور کچھ آسکروائٹڈ اوولٹریٹریٹر کا اثر۔ لطف و مسرت کی خواہش کا موٹا سا فلسفیانہ نام رکھ دینا سہل ہے مگر اصل میں میرا مقصد لذت پرستی سے اونچا تھا اس لئے کہ عیش اور آرام کی زندگی مجھے کوئی خاص رغبت نہیں تھی۔ بات یہ تھی کہ میری طبیعت میں مذہبی رنگ نہیں تھا اور میں مذہب کی سختیوں کا ناپسند کرتا تھا اس لئے ظاہر ہے کہ مجھے کوئی اور معیار زندگی تلاش کرنا تھا۔ مگر میری نظر بالکل سطحی تھی اور میں کسی چیز کی گہرائی تک نہیں پہنچ سکتا تھا اس لئے زندگی کے جمالی پہلو نے مجھے اپنی طرف کھینچ لیا اور یہ بات دل کو لگتی ہوئی معلوم ہوئی کہ انسان عامیانہ طریقے سے دنیا کی لذتوں پر نہ گرے بلکہ اپنا وقار قائم رکھے مگر اسی کے ساتھ ہر طرح کی نعمتوں کے مزے لیتا رہے اور بھری پری وسیع اور ہمہ گیر زندگی بسر کرے۔ میں زندگی کا لفظ اٹھاتا تھا اور میری سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ اس میں گناہ کی کیا بات ہے۔ مگر اس کے ساتھ ساتھ خطرے کی زندگی اور من چلے پن کا کام بھی میرے لئے ایک خاص کشش رکھتے تھے۔ مجھے اپنے والد کی طرح ہمیشہ جوا کھیلنے کا شوق رہا۔ پہلے روپے کا داؤ لگاتا تھا پھر زندگی کے بڑے بڑے مقاصد کی بازی لگانے لگا۔ ۱۹۰۶ء اور ۱۹۰۷ء میں ہندوستان کی سیاست سخت ہیجان کی حالت میں تھی اور میں اس میں بہادری سے حصہ لینے کی آرزو رکھتا تھا۔ ظہر ہے کہ یہ راہ کوئی آرام کی راہ نہیں تھی۔ ان ملی جلی خواہشوں کی وجہ سے جو کبھی کبھی آپس میں لڑ بھ جاتی تھیں میرے خیالات کچھ عجیب طرح سے گڈمڈ ہو گئے تھے مگر باوجود اس لئے کہ فیصلے کا زمانہ ابھی دور تھا۔ اس وقت تو میں جسمانی حیثیت سے بھی اور ذہنی حیثیت سے بھی

بڑی خوش گوار زندگی بسر کر رہا تھا۔ زندگی کے نئے نئے منظر میری نظر سے گزر رہے تھے۔ بہت کچھ کرنا تھا، بہت کچھ دیکھنا تھا، بہت سے کوچوں کی سیر کرنی تھی۔ ہم جاڑوں کی لمبی راتوں میں آگ کے گرد بیٹھے اطمینان سے بات چیت اور بحث و مباحثہ کیا کرتے تھے یہاں تک کہ آگ بجھنے لگتی تھی اور ہم کانپتے ہوئے بستروں میں جاگھستے تھے۔ کبھی کبھی بحث کے دوران میں ہماری ہموار آوازیں بلند ہو جاتی تھیں اور ہم جوش میں آکر جھگڑنے لگتے تھے مگر یہ سب جھوٹ موٹ کی باتیں تھیں۔ ہم انسانی زندگی کے مسئلوں سے مصنوعی بنجیدگی سے کھیلے تھے اس لئے کہ یہ بھی ہمارے لئے حقیقی مسئلے نہیں تھے اور ہم دنیا کے جھمیلوں میں نہیں پڑے تھے۔ یہ بیسویں صدی کے شروع کی، یعنی جنگ عظیم سے پہلے کی دنیا تھی۔ اس دنیا کا خاتمہ قریب تھا اور ایک دوسری دنیا پیدا ہونے کو تھی۔ ہلاکت اور تباہی اور مصیبت سے معمور، نوجوانوں کے دل کو دردِ عالم سے بھر دینے والی۔ مگر یہ انقلاب ابھی تک مستقبل کے پردے میں چھپا ہوا تھا اور ہمیں ہمیں اپنے آس پاس ترقی کا منظر دکھائی دیتا تھا جو بے فکروں کو خوش رکھنے کے لئے کافی تھا۔

میں نے لذت پرستی کا اور مختلف تصورات کا ذکر کیا ہے جن سے میں اس زمانے میں متاثر تھا۔ اس سے یہ نہ سمجھ لیجئے گا کہ میں ان چیزوں پر وضاحت سے غور کیا کرتا تھا۔ سچ پوچھئے تو مجھے اس کی ضرورت بھی نہیں معلوم ہوتی تھی کہ ان کا کوئی واضح اور معین تصور انسان کے ذہن میں ہو۔ یہ محض دھندلے سے خیالات تھے جو میرے دل میں آتے جاتے تھے اور اپنا تھوڑا بہت نقش چھوڑ جایا کرتے تھے۔ میں کبھی ان فکروں میں سر نہیں کھیلتا تھا۔ میرا سارا وقت پڑھائی کھیل اور تفریح میں گزرتا تھا اور میرے سکون میں خلل دالنے والی صرف ایک ہی چیز تھی یعنی ہندوستان کی سیاسی کشمکش۔ کیمبرج میں جن کتابوں کا اثر میرے سیاسی خیالات پر پڑا، ان میں ٹافسینڈ کی کتاب ”ایا اور یورپ“ بھی تھی۔

۱۹۰۷ء سے کئی سال تک ہندوستان میں ایک ہیجان کی سی کیفیت رہی۔ ۱۸۵۷ء کی شورش کے بعد پہلا موقع تھا کہ یہ ملک بدلیسی حکومت کے آگے چپ چاپ سر جھکانے کی بجائے اس سے لڑنے پر آمادہ تھا۔ تلک کی جدوجہد اور ان کا قید ہونا، آروند گھوش کی کوشش اور بنگال کے لوگوں کا سودیشی اور بائیکاٹ کا حلف اٹھانا، ان واقعات کی خبریں انگلستان پہنچتی تھیں اور ہم ہندوستانیوں کے دلوں کو جوش سے بھر دیتی تھیں ہم سب کے سب تلک کے پیرو تھے جو ہندوستان میں انتہا پسند کہلاتے تھے۔

کیمبرج کے ہندوستان کی ایک انجمن تھی جو ”مجلس“ کے نام سے مشہور تھی۔ اس میں ہم اکثر سیاسی مسئلوں پر بحث کرتے تھے مگر محض نمائش کے طور پر۔ ساری کوشش پارلیمنٹ اور یونیورسٹی یونین کے طور طریقوں کی نقل میں صرف ہوتی تھی اور بحث کے مضمون کی طرف بہت کم توجہ کی جاتی تھی۔ میں مجلس میں اکثر جایا کرتا تھا مگر تین برس کے زمانے میں شاید ہی کوئی تقریر کی ہو۔ میں اپنی جھک اور جھینپ کو کسی دور نہیں کر سکتا تھا۔ یہی مشکل مجھے اپنے کالج کی ڈیبنگ سوسائٹی The Magpie and stump میں پیش آتی تھی۔ وہاں یہ قاعدہ تھا کہ جو ممبر پوری ٹرم تقریر نہ کرے اسے جرمانہ دینا پڑتا تھا۔

چنانچہ میں نے اکثر جرمانہ دیا۔

مجھے یاد ہے کہ ایڈون مانیکو جو آگے چل کر وزیر ہند ہوئے اکثر کالج کی انجمن میں آیا کرتے تھے۔ وہ ٹرینیٹی کالج کے قدیم طالب علم تھے اور کیمبرج کی طرف سے پارلیمنٹ میں ممبر تھے۔ انہیں کی زبان سے میں نے پہلی بار عقیدے کی جدید تعریف سنی۔ یعنی اس چیز کا ماننا جسے عقل نہ مانتی ہو اس لئے اگر عقل نے اسے تسلیم کر لیا تو پھر عقیدے کا سوال ہی نہیں رہتا۔ مجھ پر سنسن اس کے مطالعے کا بہت اثر تھا اور اسی اثر کی وجہ سے میں اپنی رائے کو قطعی سمجھتا تھا، اس لئے کہ انیسویں صدی کے شروع

کی سائنس بخلاف آج کل کی سائنس کے اپنے آپ پر اور اپنی دنیا پر بڑا وثوق رکھتی تھی۔

”مجلس“ میں بھی اور نچ کی گفتگو میں بھی ہندوستانی طالب علم اپنے ملک کی سیاست کا ذکر کرتے وقت اکثر سخت سے سخت الفاظ استعمال کرتے تھے یہاں تک کہ بنگال والے جو تشدد کے کام شروع کر رہے تھے ان کی تعریف سے بھی نہیں چوکتے تھے۔ آگے چل کر میں نے دیکھا کہ یہی حضرات ہندوستان کی سول سروس کے ارکان، ہائی کورٹ کے جج، بہت متین اور ثقہ وکیل وغیرہ بن گئے۔ ان قالین کے شیروں میں بہت کم ایسے نکلے، جنہوں نے آگے چل کر ہندوستانی سیاست میں کچھ موثر حصہ لیا۔

اس زمانے کے بعض مشہور ہندوستانی سیاست دان ہمارے یہاں کیمبرج میں آئے۔ ہم لوگ ان سے ادب سے پیش آئے مگر اس میں ایک جھلک برتری کے احساس کی بھی تھی۔ ہم سمجھتے تھے کہ ہماری ذہنی تربیت کا دائرہ بڑا ہے اور ہم ہر چیز کو زیادہ وسیع نظر سے دیکھتے ہیں، جو حضرات ہمارے یہاں تشریف لائے، ان میں پن چندریال، لالہ جت رائے اور گوکھلے بھی تھے۔ پن پال سے ملنے کے لئے ہم میں سے کسی کی نشست کے کمرے میں ہندوستانی طالب علم جمع ہوئے ہماری تعداد ایک درجن سے زیادہ نہ تھی۔ مگر پن بابو اس طرح گرج رہے تھے جیسے دس ہزار کے مجمع میں تقریر کر رہے ہوں۔ آواز کا گھن اس قیامت کا تھا کہ میں ان کے الفاظ مشکل سے سمجھ سکتا تھا۔ لالہ جی کا انداز گفتگو زیادہ معقول تھا اور مجھ پر اس کا اثر ہوا۔ میں نے والد کو لکھا کہ مجھے لالہ جی کی تقریر پن پال کی تقریر سے زیادہ پسند آئی۔ وہ اس سے خوش ہوئے اس لئے کہ ان دنوں بنگال کی شورش پسند انہیں ذرا بھی نہ بھاتے تھے۔ گوکھلے نے کیمبرج میں عام جلسے میں تقریر کی اور مجھے اس جلسے کی جو بات خاص طور پر یاد ہے وہ عبدالحجید خواجہ کا ایک سوال تھا جو انہوں نے گوکھلے کی تقریر کے بعد

پوچھا۔ خوانہ نے ہال کے بیچ میں کھڑے ہو کر ایک طول طویل سوال چھیڑ دیا جس کا سلسلہ کسی طرح ختم ہی نہیں ہوتا تھا، یہاں تک کہ ہم میں سے اکثر یہ بھول گئے کہ بات کیا تھی اور شروع کیونکر ہوئی تھی۔

ہندوستانیوں میں ہر دیال کی بڑی شہرت تھی مگر وہ آکسفورڈ میں تھے اور وہ بھی میرے کیمبرج کے زمانے سے پہلے۔ جن دنوں میں ہیرو میں تھا ان سے ایک دو مرتبہ لندن میں ملاقات ہوئی۔

میرے کیمبرج کے ساتھیوں میں کئی آدمی تھے جنہوں نے آگے چل کر ہندوستان میں کانگریس کے کاموں میں نمایاں حصہ لیا۔ ج۔م۔ سین گپتا میرے کیمبرج پہنچنے کے تھوڑے دن بعد وہاں سے رخصت ہو گئے۔ سیف الدین کچلو، سید محمود اور تصدق احمد خاں شروانی کم و بیش میرے ہم عصر تھے۔ شاہ محمد سلیمان بھی جو اب الہ آباد ہائی کورٹ کے چیف جسٹس ہیں میرے زمانے میں وہاں پڑھتے تھے۔ میرے اور معصوم سروس کے رکن یا وزیر بن کر پھلے پھولے۔

لندن میں ہم شیمام جی کرشن ورما اور ان کے انڈیا ہاؤس کا ذکر سنا کرتے تھے مگر میری ان سے کبھی ملاقات نہیں ہوئی۔ کبھی کبھی ان کا رسالہ Indian Sociologist ہماری نظر سے گزرتا تھا۔ ایک عرصے کے بعد یعنی ۱۹۲۶ء میں مجھے شیمام جی سے جینوا میں ملنے کا اتفاق ہوا۔ ان کی جیب میں اب تک Indian Sociologist کی پرانی کاپیاں بھری ہوئی تھیں اور وہ ہر شخص کو جوان کے قریب آتا تھا، برطانوی حکومت کا جاسوس جانتے تھے۔ لندن میں ایک طالب علموں کا مرکز بھی تھا جو انڈیا آفس نے قائم کیا تھا۔ اس کو ہم سب لوگ ہندوستانی طالب علموں کی مخبری کا ایک ذریعہ سمجھتے تھے اور یہ خیال بڑی حد تک بجا تھا مگر بہت سے ہندوستانیوں کو چارونا چاراس سے واسطہ رکھنا پڑتا تھا، اس لئے کہ اس کی سفارش کے بغیر یونیورسٹیوں میں داخلہ قریب قریب ناممکن ہو گیا تھا۔

ہندوستان کی سیاسی حالت نے میرے والد کو بھی عملی سیاست میں کھینچ لیا۔ میں اس سے خوش تھا اگرچہ مجھے ان کے سیاسی اصولوں سے اتفاق نہیں تھا۔ وہ قدرتی طور پر اعتدال پسندوں کے ساتھ شریک ہو گئے۔ جن میں سے اکثر ان کے دوست اور وکالت میں ان کے رفیق کار تھے، انہوں نے اپنے صوبے کے ایک کانفرنس میں صدارت کی اور اپنی تقریر میں بنگال اور مہاراشٹر کے انتہا پسندوں کی بڑی سختی سے مخالفت کی۔ وہ صوبہ متحدہ کی کانگریس کمیٹی کے صدر بھی منتخب ہو گئے۔ ۱۹۰۷ء میں وہ سورت کے اجلاس میں موجود تھے، جس میں کانگریس درہم برہم ہو گئی اور اس کے بعد خالص اعتدال پسند جماعت بن گئی۔

سورت کے جلسے کے بعد ہی وہ نیو سن الہ آباد میں کچھ دن والد کے مہمان رہے اور انہوں نے جو کتاب ہندوستان کے متعلق لکھی اس میں والد کا ذکر ان الفاظ میں کیا ”سخاوت کے سوا وہ ہر معاملے میں اعتدال پسند ہیں،“ یہ اندازہ بالکل غلط تھا۔ والد کسی چیز میں اعتدال پسند نہ تھے بجز سیاست کے اور اس میں بھی ان کی طبعیت اپنا رنگ دکھا کر رہی یعنی رفتہ رفتہ یہ رہا سہا اعتدال بھی غائب ہو گیا۔ ان جیسا قومی جذبات، جو شیلے مزاج، مغرور طبعیت اور مضبوط ارادے کا آدمی اعتدال پسندی سے کوسوں دور تھا۔ پھر بھی ۱۹۰۷ء اور ۱۹۰۸ء میں اور اس کے کئی سال بعد تک وہ دھر کے اعتدال پسند اور انتہا پسندوں کے سخت مخالف رہے اگرچہ میرے خیال میں تک کے وہ قائل تھے۔

اس کی وجہ ظاہر ہے۔ ان کے ذہن کی تربیت قانون اور دستور کی بنیادوں پر ہوئی تھی اس لئے وہ قدرتی طور پر ہر چیز کو قانونی اور آئینی نظر سے دیکھتے تھے۔ اپنی معاملہ فہمی کی بدولت انہوں نے یہ بات سمجھ لی تھی کہ سخت اور شدید الفاظ بالکل بیکار ہیں جب تک کہ عمل بھی زبان کا اہم رنگ نہ ہو اور موثر عمل کی انہیں کوئی صورت نظر نہیں آتی تھی۔ سودیشی اور بائیکاٹ سے کچھ کام چلتا معلوم نہیں ہوتا تھا اور پھر ان

تحریکوں کی تہہ میں مذہبی رنگ کی قومیت تھی جو ان کی طبیعت کے بالکل خلاف تھی۔ وہ ہندوستان کی قدیم تہذیب کو زندہ کرنے کے حامی نہیں تھے۔ نہ وہ اسے سمجھ سکتے تھے اور نہ وہ اس سے ہمدردی رکھتے تھے۔ ان کے نزدیک ذات پات کی پابندی اور بہت سی اور قدیم رسمیں رجعت پسندی کی دلیل تھیں اور وہ انہیں سخت ناپسند کرتے تھے۔ ان کی نظر میں مغرب سمایا ہوا تھا۔ مغربی ممالک کی ترقی نے ان کے دل کو موہ لیا تھا اور ان کا یہ خیال تھا کہ انگلستان کے تعلق کی بدولت ہم بھی ترقی کر سکیں گے۔

سامانی حیثیت سے دیکھئے تو ۱۹۰۷ء میں ہندوستانی قومیت کا نئے سرے سے ابھرنا کھلی ہوئی رجعت پسندانہ تحریک تھی۔ جیسا کہ مشرق کے اور ملکوں میں ہوا تھا ہندوستان میں بھی قومیت کی نئی تحریک لازمی طور پر مذہبی چیز بن گئی۔ اعتدال پسندوں کی جماعت سماجی معاملات میں زیادہ آزاد خیال تھی۔ مگر اس میں صرف اونچے طبقے کے مٹھی بھر آدمی تھے جنہیں عام لوگوں سے کسی قسم کا تعلق نہیں تھا۔ یہ حضرات معاشی مسئلوں پر جو کچھ غور کرتے تھے وہ صرف اونچے اوسط طبقے کے لحاظ سے جس کے ایک حصے کے وہ نمائندے تھے اور جس کی ترقی انہیں مقصود تھی، وہ چھوٹی چھوٹی سماجی اصلاحوں کی کوشش کر رہے تھے تاکہ ذات پات کی بندشیں ڈھیلی ہوں اور پرانی رسمیں، جو ترقی کی راہ میں حائل ہیں۔ موقوف ہو جائیں۔

اعتدال پسندوں کے ساتھ شریک ہو کر والد نے جارحانہ طرز عمل اختیار کیا بنگال اور پونا کے چند لیڈروں کو چھوڑ کر اکثر انتہا پسند نوجوان تھے اور والد کو نہایت ناگور تھا کہ یہ کل کے چھوکرے الگ راہ پر چلنے کی جرات کرتے ہیں۔ وہ مخالفت کو برداشت نہیں کر سکتے تھے اور جن لوگوں کو احمق سمجھتے تھے ان کے ساتھ بھانا ان کے لئے غیر ممکن تھا۔ انہیں ان لوگوں سے لڑنے میں لطف آتا تھا اور جہاں موقع پایا حملہ کر دیتے تھے۔ مجھے یاد ہے کہ کیمبرج سے رخصت ہونے کے بعد میں نے ان کا ایک مضمون پڑھا جس سے مجھے بہت تکلیف ہوئی۔ میں نے انہیں کسی قدر گستاخی

کے لہجے میں خط لکھا جس میں چبھتا ہوا فقرہ تھا کہ برطانوی حکومت یقیناً آپ کے سیاسی کاموں سے بہت خوش ہوگی۔ یہی باتیں تھیں جنہیں انہیں بے حد طیش آ جاتا تھا۔ وہ مجھ سے خفا ہو گئے اور قریب تھا کہ مجھے فوراً انگلستان سے واپس آنے کا حکم دیں۔

کیمبرج کے قیام کے زمانے میں یہ سوال اٹھا کہ مجھے کونسا پیشہ اختیار کرنا چاہیے۔ کچھ دن انڈین سول سروس کا خیال رہا کیونکہ اس وقت تک یہ بڑی چیز سمجھی جاتی تھی مگر یہ تجویز نہ والد کو پسند تھی اور نہ مجھ کو اس کئے ترک کر دی گئی۔ میرے خیال میں اس کی اصل وجہ یہ تھی کہ میری عمر سوال سروس کے مقررہ معیار سے کم تھی اور اگر میں اس کا امتحان دینا چاہتا تو مجھے سند لینے کے بعد انگلستان میں تین چار برس اور قیام کرنا پڑتا۔ جب میں نے کیمبرج سے سند حاصل کی تو میری عمر تیس برس کی تھی اور سول سروس کے امتحان کے لئے اس زمانے میں ۲۲ سے ۲۴ سال تک کی قید تھی اور پھر کامیابی کے بعد ایک سال اور ٹھہرنا پڑتا تھا۔ میرے عزیز میرے انگلستان کے طویل قیام سے گھبرا گئے تھے اور چاہتے تھے کہ میں جلد لوٹ آؤں۔ ایک اور وجہ جو والد کے نزدیک اہمیت رکھتی تھی یہ تھی کہ اگر مجھے سول سروس میں جگہ ملتی تو گھر سے دور مختلف مقامات پر رہنا پڑتا۔ لیکن والد اور والدہ دونوں اتنے عرصے کی جدائی کے بعد مجھے اپنے پاس ہی رکھنا چاہتے تھے۔ غرض فیصلہ یہ ہوا کہ میں اپنا آبائی پیشہ، یعنی بیرسٹری اختیار کروں اور میں انرٹیمپل میں داخل ہو گیا۔

یہ عجب بات ہے کہ سیاست میں تو میری انتہا پسندی روز بروز بڑھتی جاتی تھی۔ مگر سول سروس کی ملازمت یعنی ہندوستان میں برطانوی حکومت کی مشین کا ایک پرزہ بن جانے کی تجویز مجھے کچھ ناپسند نہ تھی۔ چند سال کے بعد یہ خیال مجھے بہت مکروہ معلوم ہوتا۔

۱۹۱۰ء میں میں کیمبرج سے سند لے کر رخصت ہو گیا۔ میں نے سائنس کے سندی امتحان میں اوسط درجے کی کامیابی حاصل کی یعنی سیکنڈ کلاس آنرز پائے اس

کے بعد دو برس تک لندن میں مٹر گشت کرتا رہا۔ قانون کے مطالعے مجھے بہت کم وقت صرف کرنا پڑتا تھا۔ بیرسٹری کے امتحانات میں نے ایک ایک کر کے پاس کر لئے اور بہت اچھا نہیں تو بہت برا بھی نہیں رہا۔ اور باتوں کے لحاظ سے میری زندگی کسی خاص مقصد کے گزر رہی تھی۔ ادھر ادھر کی کتابیں پڑھ کر وقت کا نفا تھا۔ فین جماعت اور اشتراکیوں کی طرف توجہ رہا کرتی تھی۔ آئرستان کے مسئلے اور عورتوں کے ووٹ کی تحریک سے مجھے خاص طور پر دلچسپی تھی۔ ۱۹۱۰ء میں گرمی کی تعطیل میں آئرستان جانے کا اتفاق ہوا اور سن فین جماعت کا جوئی نئی قائم ہوئی تھی، اثر دل پر لے کر آیا۔

لندن میں ہیرو کے چند پرانے دوست مل گئے اور ان کی صحبت میں فضول خرچی کی عادت پڑ گئی۔ میرے والد مجھے بہت معقول جیب خرچ دیتے تھے مگر میں اکثر اس سے زیادہ خرچ کر ڈالتا تھا۔ میرے والد بہت گھبرائے کہ لڑکا تباہی کے گڑھے میں گر رہا ہے مگر میں اصل میں یہ کارنمایاں انجام نہیں دے رہا تھا بلکہ صرف ان گانھ کے پورے آنکھ کے اندھے انگریزوں کی تقلید کی کوشش کر رہا تھا جو ”لندن کے چھیلے“ کہلاتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ عیش و آرام کی اس بے معنی زندگی سے مجھے کسی قسم کا فائدہ نہیں پہنچا۔ میرا جوش بہت جلد ٹھنڈا ہو گیا۔ البتہ میری خود بینی اور بڑھ گئی۔

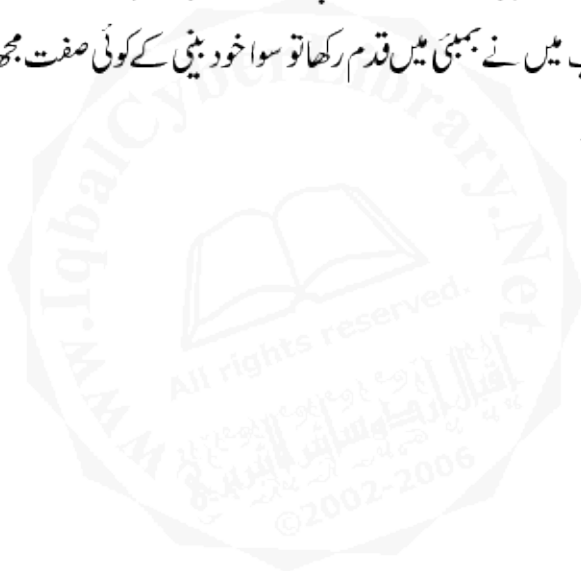
تعطیل کے زمانے میں کبھی کبھی میں یورپ کے اور ملکوں کا سفر بھی کیا کرتا تھا۔ ۱۹۰۹ء کی گرمیوں میں جب کاؤنٹ زیمپلن، فریڈریش ہافن سے اپنے نئے ہوائی جہاز میں اڑ کر برلن آئے تو میں اور والد برلن میں موجود تھے۔ میرے خیال میں یہ ریلپن کی پہلی لمبی اڑان تھی اسی لئے اس کے اعزاز میں بڑا زبردست مظاہرہ کیا گیا اور خود قیصر نے باضابطہ طور پر اس کا استقبال کیا۔ بہت بڑا مجمع جس کا اندازہ دس لاکھ اور بیس لاکھ کے درمیان کیا جاتا تھا۔ برلن کے ٹیمپل ہوف کے میدان میں اکٹھا تھا۔

زیتھلن مقررہ وقت پر پہنچا اور خوبصورتی کے ساتھ ہمارے سروں پر منڈلاتا رہا۔ ہوٹل آدلان نے اس زور اپنے ہر مہمان کو کاؤنٹ زیتھلن کی ایک نہایت عمدہ تصویر تحفے کے طور پر دے اور میرے پاس یہ تصویر اب تک موجود ہے۔ اس کے دو مہینے کے بعد ہم نے پیرس میں ایک طیارے کو پہلے پہلے سارے شہر کا چکر لگاتے اور ایفل ٹاور کے گرد منڈلاتے دیکھا۔ اس کے چلانے والے کا نام میرے خیال میں کونت دو لامیر تھا اتفاق سے اٹھارہ برس بعد جب لنڈ برگ بحر اوقیانوس کو پار کر کے چمکتے ہوئے تیر کی طرح پیرس پہنچا تو میں پھر وہیں موجود تھا۔

ایک بار بار دے میں بال بال بچ گیا۔ ۱۹۱۰ء میں کیمبرج سے سند لینے کے بعد وہاں ایک جماعت کے ساتھ سیر کرنے گیا تھا۔ ایک روز کا ذکر ہے کہ ہم لوگ ایک پہاڑی خطے میں پیدل سفر کر رہے تھے۔ دن بھر تھکے ماندے اور گرمی سے پریشان ہم اپنی منزل پر یعنی ایک چھوٹے سے ہوٹل میں پہنچے اور پہنچتے ہی یہ کہا کہ ہم نہانا چاہتے ہیں۔ وہاں نہانے کا کسی نے نام بھی نہیں سنا تھا اور ہوٹل میں اس کا کوئی انتظام نہیں تھا۔ البتہ یہ معلوم ہوا کہ وہاں قریب ایک چشمہ ہے اور ہم چاہیں تو اس میں غسل کر سکتے ہیں چنانچہ ایک انگریز اور میں دو آدمی میز کی چادریں یا شاید ہاتھ منہ پونچھنے کے تولیے جو ہوٹل والوں نے اپنی فیاضی سے عنایت کئے تھے لے کر وہاں پہنچے۔ یہ ایک پرشور نالہ تھا جو ایک قریب کی برف کی چٹان سے نکلتا تھا۔ میں نے اس میں قدم رکھا تو معلوم ہوا کہ پانی گہرا نہیں مگر برف کی طرح ٹھنڈا ہے اور اس کی تہہ میں غضب کی پھسلن ہے۔ میں پھسل کر گر ا اور سردی سے بیہوش ہو گیا یعنی نہ تو کچھ حس باقی رہی اور نہ ہاتھ پاؤں پر قابو رہا۔ میں نے قدم جمانا چاہا مگر نہیں جما اور پانی مجھے تیزی سے بہا کر لے چلا۔ میرا انگریز ساتھی کسی نہ کسی طرح پانی سے نکلا اور چشمے کے کنارے کنارے دوڑتا رہا یہاں تک کہ اس نے میری ٹانگ پکڑ پائی اور مجھے کھینچ کر باہر نکالا۔ ہمیں اپنے خطرے کا اندازہ بعد میں ہوا۔ اس لئے کہ کوئی دو تین سو گز

کے فاصلے پر یہ پہاڑی چشمہ بہت بڑی بلندی سے نیچے گرتا تھا اور ایک آبشار بن جاتا تھا جو اس مقام کے دلچسپ مناظر میں شمار ہوتا تھا۔

۱۹۱۲ء کی گرمی میں، میں نے بیرسٹری کی سند حاصل کر لی اور اسی سال خزاں کے موسم میں سات برس کے قیام کے بعد انگلستان سے ہندوستان روانہ ہوا۔ اس عرصے میں دو مرتبہ تعطیل میں گھر آچکا تھا۔ مگر اب کی بار مستقل طور پر واپس آ رہا تھا۔ جب میں نے بمبئی میں قدم رکھا تو سوا خود بینی کے کوئی صفت مجھ میں نظر نہیں آتی تھی۔



انگلستان سے واپسی

اور زمانہ جنگ کی سیاست

۱۹۱۲ء کے آخر میں سارے ہندوستان پر خاموشی چھائی ہوئی تھی تلک جیل میں تھے۔ انتہا پسند اچھی طرح کچلے جا چکے تھے اور ان کی حالت بے چرواہے کی بھیڑوں کی سی تھی۔ تقسیم بنگال کو منسوخ کرانے کی کوشش میں ناکامی ہونے کے بعد بنگال میں بھی ایک سناٹا چھا گیا تھا اور اعتدال پسند جماعت مننومار لے اسکیم کے نفاذ کے بعد کونسلوں کے جال میں پھنس چکی تھی۔ البتہ ان ہندوستانیوں کا کچھ خیال لوگوں کو ضرور تھا جو بیچارے پردیس میں پڑے تھے۔ خاص کر جنوبی افریقہ کے ہندوستان کا۔ کانگریس بھی اس زمانے میں معتدل خیال کی جماعت تھی۔ بس سال کے سال جلسہ ہو جاتا اور چند بے جان سے تجویزیں منظور ہو جاتیں غرض اس میں بھی کوئی کشش نہ تھی۔

۱۹۱۲ء میں بانکپور کانگریس کے جلسے میں ڈیلی گیٹ کی حیثیت سے میں بھی شریک ہوا تھا۔ اس وقت یہ انگریزی داں اعلیٰ طبقے کے لوگوں کا ایک میلہ معلوم ہوتی تھی۔ جدھر دیکھو بس کوٹ پتلونوں کی نمائش تھی۔ اس پر کسی سیاسی جلسے کا شبہ تک نہ ہوتا تھا۔ نہ کوئی جوش و خروش تھا اور نہ کشاکش۔ معلوم ہوتا تھا کہ دوستوں کی بے تکلف صحبت ہے۔ گو کھلے جو اسی زمانے میں افریقہ سے واپس آئے تھے اس جلسے میں موجود تھے اور سب سے نمایاں تھے وہ بے چین طبیعت کے آدمی تھے۔ سرگرمی اور جوش عمل کے پتلے معلوم ہوتے تھے۔ اس سارے مجمع میں وہی ایک ایسے شخص تھے جو سیاست کی سچ مچ کوئی اہمیت سمجھتے تھے اور قومی کام کو کام کی طرح کرنا چاہتے تھے بہر حال میں ان سے متاثر ہوا۔

جب وہ بانکپور سے روانہ ہوئے تو بڑا دلچسپ واقعہ پیش آیا۔ وہ اس وقت

پبلک سروس کمیشن کے رکن تھے، اس لئے سفر میں فرسٹ کلاس کا ایک پورا ڈبہ انہیں مل جاتا تھا۔ ان کی طبیعت کچھنا ساز تھی۔ اوریوں بھی وہ ناموس صحبت سے گھبراتے تھے اس لئے چاہتے تھے کہ تنہائی میں ذرا سکون مل جائے۔ کانگریس کی مصروفیت کے بعد انہیں امید تھی کہ ریل میں یہ سکون میسر آجائے گا۔ بہر حال انہیں ایک اکیلا ڈبہ مل گیا۔ لیکن باقی گاڑی کلمتہ جانے والے ڈیلی گیٹوں سے کھچا کھچ بھری تھی۔ تھوڑی دیر بعد مسٹر بھوپندر ناتھ باسو جو بعد میں انڈیا کونسل کے ممبر رہے ہیں ان کے پاس تشریف لائے اور باتوں باتوں میں ان سے اسی ڈبے میں آجانے کی اجازت چاہی۔ مسٹر گوکھلے گوگمو میں پڑ گئے۔ وہ جانتے تھے کہ مسٹر باسو بڑے باتونی ہیں۔ لیکن بیچارے آخر کرتے کیا۔ اخلاقاً اجازت دینا پڑی چند منٹ بعد مسٹر باسو پھر آئے اور پوچھا کہ اگر کوئی مضائقہ نہ ہو تو میں اپنے ایک دوست کو بھی ساتھ لیتا آؤں۔ مسٹر گوکھلے کو ناچار پھر ہاں کرنا پڑی۔ گاڑی روانہ ہونے سے پہلے مسٹر باسو یہ بھی کہہ گزرے کہ مجھے اور میرے دوست کو اوپر والے گدے پر سونے میں بڑی تکلیف ہوگی اس لئے اگر زحمت نہ ہو تو آپ اوپر چلے جائیں۔ تاکہ ہم دونوں نیچے کے گدوں پر لیٹ سکیں۔ غالباً یہ صورت طے ہوئی اور بے چارے گھوکھلے کو ساری رات بڑی بے چینی سے اوپر گزارنی پڑی۔

میں نے ہائی کورٹ میں وکالت شروع کر دی اور اس نئے کام میں میرا تھوڑا بہت جی بھی لگنے لگا۔ یورپ سے واپسی پر شروع شروع میں چند مہینے تو لطف سے کئے۔ کیونکہ مجھے وطن واپس آنے اور بچھڑے ہوؤں سے ملنے کی بڑی خوشی تھی لیکن رفتہ رفتہ یہ زندگی جو میں اپنے ہم جنسوں کے ساتھ گزار رہا تھا بے کیف معلوم ہونے لگی اور یہ محسوس ہونے لگا کہ لایعنی اور بے مقصد زندگی کے جنجال میں پھنس گیا ہوں۔ شاید میری دورخی تعلیم اس بے اطمینانی اور پریشانی کا باعث نہ ہو۔ میں نے انگلستان میں سات برس تک رہا تھا اس لئے مجھ پر وہاں کی تہذیب و تمدن کا کافی اثر

تھا۔ ممکن ہے اسی وجہ سے میرا یہاں دل نہ لگتا ہو۔ خوش قسمتی سے گھر کی فضا کچھ غنیمت تھی اس لئے یہاں مجھے سکون ملتا تھا لیکن سارے دن گھر ہی میں تو رہتا تھا۔ اکثر وقت بار لاہریری اور کلب میں گزرتا تھا۔ یہاں دونوں جگہ زیادہ تر وکیل ہی ہوتے تھے اور ان میں ہر وقت بس اپنے پیشے اور قانون کی باتیں چھڑی رہتی تھیں۔ غرض ذہنی نشوونما کی کوئی صورت نہ تھی اور نہ تفریح یا دل بہلانے کا کوئی معقول انتظام تھا اس لئے میری طبیعت پر ایک اداسی سی طاری رہنے لگی۔

ای۔ ایف۔ فارسٹر نے حال ہی میں جی۔ لوئس۔ کنسن کے متعلق ایک کتاب لکھی ہے اس میں وہ لکھتے ہیں کہ ایک مرتبہ ڈکنسن نے ہندوستان کے متعلق یہ الفاظ فرمائے تھے کہ ”ان دونوں قوموں میں میل جول کیوں نہیں ہو سکتا؟ محض اس لئے کہ ہندوستانی انگریزوں پر اجبرن ہو جاتے ہیں یہ ایک صاف اور صریح حقیقت ہے۔“ بہت ممکن ہے کہ اکثر انگریزوں کا یہی خیال ہو اور یہ کوئی عجیب بات نہیں۔ فارسٹر اپنی ایک دوسری کتاب میں لکھتے ہیں ”کہ ہندوستان کا رہنے والا ہر انگریز یہ سمجھتا ہے کہ اور صحیح سمجھتا ہے کہ وہ ایک فاتح فوج کا سپاہی ہے چنانچہ اسی کے مطابق وہ اپنا رویہ بھی رکھتا ہے۔ ایسی صورت میں ان قوموں کے درمیان باہمی مراسم اور بے تکلفی کیسے بڑھ سکتی ہے۔ انگریز اور ہندوستانی قوموں کے درمیان باہمی مراسم اور بے تکلفی کیسے بڑھ سکتی ہے۔ انگریز اور ہندوستانی دونوں ایک دوسرے کے سامنے بنتے ہیں اس لئے انہیں ایک دوسرے کی صحبت کھل جاتی ہے۔ ہر ایک دوسرے پر بار ہوتا ہے اس لئے وہ چاہتا ہے کہ اس سے جس قدر جلد چھٹکارا مل جائے اچھا ہے تا کہ اطمینان کا سانس لے اور آزادی سے اٹھ بیٹھ سکے۔“

عموماً انگریزوں کو ایک ہی قسم کے ہندوستانیوں سے ملنے کا اتفاق ہوتا ہے یعنی سرکاری لوگوں سے۔ باندق اور معقول ہندوستانیوں کی صحبت انہیں کہاں نصیب ہوتی ہے اور اگر ہوتی بھی ہے تو وہ انہیں اس ڈھب پر نہیں لاسکتا کہ گل مل کر باتیں

کریں۔ برطانوی حکومت نے ہمارے یہاں سرکاری طبقہ کو چاہے وہ انگریز ہو یا ہندوستانی سماجی حیثیت سے بھی بہت زیادہ اہمیت دے دی ہے لیکن یہ طبقہ بے انتہا تنگ نظر اور مردہ دل واقعہ ہوا ہے۔ نوجوان اور ہونہارا انگریز بھی ہندوستان آتے ہی ذہنی اور علمی اعتبار سے مجہول بن جاتا ہے اور زندہ دلی سے بالکل محروم ہو جاتا ہے۔ دن بھر وہ دفتر کی ان مسلوں میں سرکھپاتا ہے جو ہمیشہ گشت میں رہا کرتی ہیں اور کبھی ختم ہونے کو نہیں آتیں اس کے بعد ہوتھوڑی سی ورزش کرتا ہے پھر اپنے ہم جنسوں کے پاس کلب میں چلا جاتا ہے وہاں وہ سکی پیتا ہے اور بیچ اور لندن کے دوسرے ہفتہ وار رسائل پڑھتا ہے۔ یہی اس کا روز کا معمول ہے۔ کتابیں تو وہ شاید ہی کبھی پڑھتا ہو۔ اور اگر کبھی جی چاہا تو اپنی کوئی پرانی محبوب کتاب اٹھا لیتا ہے اور تھوڑی دیر اس سے دل بہلاتا ہے۔ پھر جب رفتہ رفتہ اس کا دماغ شل اور ذہن کند ہو جاتا ہے تو ہندوستان کو الزم دیتا ہے۔ یہاں کی آب و ہوا کو کوست ہے اور شورش کرنے والوں کی اس جماعت کو برا بھلا کہتا ہے جو اس کی پریشانیوں میں اضافہ کر دیتی ہے لیکن وہ یہ محسوس نہیں کرتا کہ اس ذہنی اور دماغی تنزل کی اصل وجہ ہندوستان کا بے لگام استبدادی طرز حکومت ہے اور وہ خود اس مشین کا ایک چھوٹا سا پرزہ ہے۔

انگریز افسروں کو یورپ جانے کے لئے جلد جلد رخصت ملتی رہتی ہے اس کے باوجود اگر ان کی یہ کیفیت ہے تو مجھ لیجئے کہ ان کے ہمسریا ماتحت ہندوستانی افسروں کی کیا حالت ہوگی جو انہی کے نقش قدم پر چلنے کی کوشش کرتے ہیں۔ اگر آپ کو کبھی نئی دہلی کے انگریز اور ہندوستانی اعلیٰ حکام کی صحبت میں اٹھنے بیٹھنے کا اتفاق ہوا ہے اور ترقی، تبادلہ، رخصت اور اسی قسم کے لغویات ملازمت ان کی رام کہانی سنی ہے تو آپ کو اندازہ ہوگا کہ شاید ہی کوئی دوسری چیز اس سے زیادہ سوہان روح ہوتی ہو۔ ہندوستان کے متوسط طبقے خاص کر انگریزی جاننے والوں کی زندگی پر اس سرکاری فضا نے کافی اثر کیا اور اس سانچے میں اے ڈھال دیا۔ کلکتہ، بمبئی جیسے

بڑے شہر تو ایک حد تک اس سے محفوظ ہیں۔ باقی ہر جگہ کے غیر سرکاری لوگ یعنی وکیل ڈاکٹر وغیرہ بھی اس کا شکار ہو گئے ہیں حتیٰ کہ نیم سرکاری یونیورسٹیوں کی ادبی فضا بھی اس سے مسموم نظر آتی ہے۔ یہ سب لوگ باقی دنیا سے بالکل الگ تھلک رہتے ہیں اور عوام سے حتیٰ کے متوسط طبقے کے نسبتاً نیچے درجے کے لوگوں سے بھی انہیں کوئی تعلق نہیں رہتا۔ سیاسیات متوسط طبقے کے اونچے لوگوں تک محدود تھی۔ ۱۹۰۶ء کے بعد سے بنگال میں قومی تحریک نے پہلے پہل اس کفر کو توڑا۔ اور اس طبقے کے ادنیٰ درجے کے لوگوں میں بلکہ ایک حد تک عوام میں بھی نئی روح پھونک دی۔ یہ رفتار آگے چل کر گاندھی جی (۱) کی رہبری میں زیادہ تر ہو گئی۔ قومی تحریک اگرچہ حیات بخش ہو ہے لیکن اس کا سطح نظر نہایت محدود ہوتا ہے اور اس میں اتنی قوت عمل اور توجہ صرف کرنی پڑتی ہے کہ دوسرے کاموں کے لئے مہلت نہیں ملتی۔

انہی وجوہ سے انگلستان سے واپسی کے بعد چند سال تک میں بہت دل برداشتہ رہا۔ اپنے پیشے میں مجھے پورا اظہاک پیدا نہیں ہوا تھا اور سیاسیات میں اس وقت مجھے اپنے خیالات کو عملی جامہ پہنچانے کا موقع نہ تھا کیونکہ میرے نزدیک سیاسیات کا مفہوم صرف یہ تھا کہ غیر ملکی حکومت کے خلاف جارہا نہ کاروائی کی جائے یا اس ہمہ میں کانگریس میں داخل ہو گیا اور کبھی کبھی اس کے جلسوں میں شریک ہوتا رہا۔ جب کوئی خاص موقع پیش آتا تھا مثلاً ہندوستانی مزدوروں کو اقرار نامے لکھوا کرنی جی لے جانے کے خلاف جدوجہد کرنے کا سوال یا جنوبی افریقہ کے ہندوستانیوں کا مسئلہ تو میں سرگرمی سے اس میں کود پڑتا تھا اور دل و جان سے کوشش کرتا تھا۔ لیکن یہ سب کچھ محض دفع الوقتی تھی کوئی مستقل شغل نہ تھا۔

مجھے سیر و شکار کی طرف کچھ رغبت تھی لیکن کوئی خاص شوق نہیں تھا۔ دراصل میں صحرا نوردی کی خاطر شکار کو جاتا تھا۔ جانوروں کو ہلاک کرنا مقصد نہ تھا۔ میں خاص طور پر اس کے لئے مشہور تھا کہ شکار میں میں نے کبھی خون نہیں بہایا البتہ ایک مرتبہ

کشمیر میں اتفاق سے ایک ریچھ ضرور مارا تھا۔ بالآخر ایک ہرن کا ایسا واقعہ پیش آیا تھا کہ شکار کا یہ تھوڑا بہت شوق بھی ختم ہو گیا۔ ہوا یہ کہ ایک مرتبہ یہ بیچارہ بے ضرر جانور زخمی ہو کر میرے پاؤں کے قریب آ کر گر پڑا اور آنسوؤں سے دہل بانی ہوئی بڑی بڑی آنکھیں اٹھا کر نہایت حسرت سے میری طرف دیکھا۔ یہ پرغم اور غمگین آنکھیں اب تک مجھے یاد ہیں اور عرصے تک ان کا تصور مجھے ستاتا رہا۔

اس زمانے میں مسٹر گوکھلے کی سروس آف انڈیا سوسائٹی سے میں بہت متاثر تھا۔ میں نے کبھی اس میں شریک ہونے کا خیال نہیں کیا کیونکہ اول تو ان کا سیاسی نقطہ نظر میرے معیار سے بہت کم تھا۔ دوسرے اس وقت تک میرا ارادہ وکالت ترک کرنے کا نہیں تھا۔ لیکن میرے دل میں اس سوسائٹی کے اراکین کی بڑی عزت تھی کیونکہ انہوں نے اپنی زندگی ملک کی خدمت کے لئے وقف کر دی تھی اور محض گزارے کے لائق تھوڑا سا معاوضہ قبول کر لیتے تھے۔ میرا خیال تھا کہ یہاں بالکل صحیح اصولوں پر نہ بھی سہی لیکن کم سے کم یکسوئی سے ٹھوس اور مسلسل کام تو ہوتا ہے۔

ہاں ایک مرتبہ مسٹر سرینواس شاستری کی ایک بات سے مجھے بڑا صدمہ پہنچا۔ اگرچہ اس کا سیاست سے کوئی تعلق نہ تھا۔ انہوں نے الہ آباد میں طالب علموں کے ایک جلسے میں تقریر فرمائی اور انہیں نصیحت کی کہ ہمیشہ اپنے استادوں کی عزت و فرماں برداری اور حاکم وقت کے بنائے ہوئے تمام قواعد و ضوابط کی سختی سے پابندی کیا کرو۔ باتیں تو یہ بڑے مزے کی تھیں لیکن مجھ پر ان کا کوئی اثر نہیں ہوا بلکہ اقتدار پرستی پر جو غیر معمولی زور دیا گیا تھا اس کی وجہ سے یہ مجھے کچھ نا مناسب اور لچر سی معلوم ہوئیں۔ میں اس نتیجہ پر پہنچا کہ یہ شاید اس نیم سرکاری فضا کا اثر ہے جو ہندوستان پر چھائی ہوئی ہے۔ مسٹر شاستری نے اس پر بس نہیں کیا بلکہ لڑکوں سے یہ خواہش بھی کہ وہ اپنے ساتھیوں کی حرکتوں کی فوراً اپنے افسروں کو اطلاع دیا کریں۔ دوسرے معنوں میں وہ گویا ایک دوسری کی مخبری کیا کریں اور خفیہ پولیس کی

خدمت انجام دیں۔ مسٹر شاستری نے کھلے کھلے الفاظ میں یہ نہیں کہا تھا لیکن ان کی منشا یہی تھا۔ اس لئے میں اس جلیل القدر لیڈر کے دوستانہ مشورے کو حیرت سے سن رہا تھا۔ میں حال ہی میں انگلستان سے واپس آیا تھا۔ وہاں اسکول اور کالج میں یہ بات ہمارے ذہن نشین کرائی گئی تھی کہ اپنے ساتھی کو کبھی دغا نہ دینا۔ وہاں کی تہذیب میں اس سے بڑھ کر کوئی گناہ نہ تھا کہ اپنے ساتھی کا راز معلوم کر کے پھر خبری کی جائے اور اس طرح اسے پریشانی میں مبتلا کیا جائے لیکن یہاں اس کے بالکل برعکس بات سن کر میں حیران رہ گیا اور میں نے یہ سمجھ لیا کہ مسٹر شاستری کے اخلاق نظریہ میں اس نظر یہ میں جس کی مجھے انگلستان میں تعلیم دی گئی تھی زمین آسمان کا فرق ہے۔

جنگ عظیم شروع ہوتے ہی ہماری توجہ کا رخ ادھر پھر گیا۔ چونکہ یہ لڑائی بہت دور ہو رہی تھی اس لئے شروع شروع میں ہم پر اس کا زیادہ اثر نہیں پڑا اور سچ پوچھئے تو ہندوستان کو اس کی تباہ کاریوں کا پورا اندازہ ہی نہیں ہوا۔ بہر حال اس کی وجہ سے سیاسی تحریک رک گئی اور اس کی اہمیت کم پڑ گئی۔ قانون تحفظ ہند نے سارے ملک کو اپنی آہنی گرفت میں جکڑ لیا۔ جنگ کے دوسرے سال سے ملک میں گولیاں چلنے کی اور طرح طرح کی سازشوں کی خبریں آنے لگیں اور یہ معلوم ہوا کہ پنجاب میں رنگروٹ بھرتی کرنے میں انتہائی جبر و تشدد سے کام لیا جا رہا ہے۔

اگرچہ گلا پھاڑ پھاڑ کر برطانیہ کے ساتھ وفاداری کا اعلان کیا جاتا تھا لیکن یہ واقعہ ہے کہ اس کے ساتھ دلی ہمدردی کسی کو نہ تھی۔ جرمنی کی فتوحات سن سن کر جتنی خوشی انتہا پسندوں کو ہوتی تھی اتنی ہی اعتدال پسندوں کو۔ جرمنی سے کسی کو الفت نہ تھی۔ محض یہ جذبہ کام کرتا تھا کہ اپنی آنکھوں سے اپنے فاتح کو ذلیل ہوتے ہوئے دیکھیں۔ یہ گویا کمزور اور بیکس شخص کے انتقام کا جذبہ تھا۔ میرا خیال ہے کہ اس جنگ کے متعلق بیشتر ہندوستانیوں کے دلوں میں طرح طرح کے جذبات موجود تھے۔

مجھے قوموں سے زیادہ فرانس سے ہمدردی تھی۔ اتحادیوں کی طرف سے برابر نہایت مہربانی سے پروپیگنڈا ہو رہا تھا۔ اور اگرچہ ہم اس کا زیادہ اعتبار نہیں کرتے تھے پھر بھی اس کا کچھ نہ کچھ اثر ضرور ہوتا تھا۔

رفتہ رفتہ سیاسی بیداری پھر شروع ہو گئی۔ لوگمانیہ تلک جیل سے رہا ہو کر آگئے اور ایک ہوم رول لیگ انہوں نے اور ایک مسز بینٹ نے قائم کی۔ میں دونوں میں شریک ہو گیا۔ لیکن زیادہ تر کام مسز بینٹ کی لیگ میں کیا۔ ہندوستانی سیاست میں مسز بینٹ کی سرگرمیاں برابر بڑھتی گئیں۔ کانگریس کے سالانہ جلسوں میں بھی کچھ جوش و خروش نظر آنے لگا اور مسلم لیگ بھی کانگریس کے قدم بہ قدم چلنے لگی۔ معلوم ہوتا تھا کہ ساری فضا میں بجلی کی ایک لہری دوڑ گئی ہے۔ ہم نوجوان عموماً بہت مسرور تھے کیونکہ ہمیں یہ امید تھی کہ بہت جلد کچھ نہ کچھ ہونے والا ہے۔ مسز بینٹ کی نظر بندی سے تعلیم یافتہ طبقے میں اور زیادہ جوش پیدا ہو گیا اور سارے ملک میں ہوم رول کی تحریک کو اس سے بہت تقویت پہنچی۔ ان دنوں لیگوں میں نہ صرف وہ پرانے انتہا پسند شریک ہوئے تھے جو ۱۹۰۷ء کے بعد کانگریس سے کنارہ کش ہو گئے تھے بلکہ متوسط طبقے کے نئے نئے کارکن بھی شامل ہو گئے لیکن عوام تک ابھی ان کا اثر نہیں پہنچا تھا۔

مسز بینٹ کی نظر بندی سے بوڑھوں اور اعتدال پسندوں میں بھی ہيجان پیدا ہو گیا تھا۔ مجھے یاد ہے کہ اس نظر بندی سے کچھ پہلے جب میں اخباروں میں مسٹر سرنو اس شاستری کی زوردار تقریریں پڑھا کرتا تھا تو میں بے انتہا متاثر ہوتا تھا۔ لیکن نظر بندی سے چند روز پہلے یا شاید چند روز بعد مسٹر شاستری نے یکا یک خاموشی اختیار کر لی۔ جب عمل کا وقت آیا تو وہ ہمارا ساتھ چھوڑ گئے اس لئے ان کی اس خاموشی پر بہت زیادہ مایوسی اور ناراضگی کا اظہار کیا گیا۔ کیونکہ اس وقت صحیح رہبری کی سب سے زیادہ ضرورت تھی۔ شاید اسی کے بعد سے یہ بات میرے دل پر نقش ہو

گئی ہے کہ مسٹر شاستری عملی آدمی نہیں ہیں اور معرکہ آرائی سے ان کی طبیعت کو کوئی مناسبت نہیں ہے۔

بہر حال دوسرے اعتدال پسند رہنما اس وقت برابر شریک رہے لیکن کچھ عرصے بعد بعض تو پیچھے ہٹ گئے اور بعض نے جو قدم بڑھایا تھا اس پر قائم رہے۔ حکومت ہند نے اس زمانے میں یورپ کے نمونے پر متوسط طبقے میں سے ایک انڈین ڈیفنس فورس ترتیب دینا شروع کیا تھا۔ مجھے یاد ہے کہ اس پر بہت بحثیں ہوا کرتی تھیں۔ بہت سی صورتوں میں یورپین فورس کے مقابلے میں ہندوستانی فورس کے ساتھ خراب سلوک روا رکھا گیا تھا۔ اس لئے ہم میں سے اکثر حضرات کا یہ خیال تھا کہ جب تک یہ ذلت آمیز امتیاز نہ اٹھ جائے ہمیں تعاون نہ کرنا چاہیے۔ بالآخر بہت کچھ بحث مباحثہ کے بعد یو۔ پی میں ہم نے طے کیا کہ ہمیں بھی شریک ہو جانا چاہیے۔ کیونکہ خیال یہ تھا کہ کچھ بھی سہی ہمارے نوجوان کو فوجی تعلیم تو حاصل ہوگی۔ میں نے بھی اس فورس میں نام لکھانے کے لئے اپنی نوجوان کو فوجی تعلیم تو حاصل ہوگی۔ میں نے ابھی اس فورس میں نام لکھانے کے لئے اپنی درخواست بھیج دی اور اس تجویز کو عملی جامہ پہنانے کے لیے ہم نے الہ آباد میں ایک کمیٹی قائم کی۔ اتفاق سے اسی زمانے میں مسز بسیٹ کی نظر بندی کی خبر ملی۔ بس اس وقتی جوش و خروش سے فائدہ اٹھا کر میں نے کمیٹی کو جس کے رکن والد، ڈاکٹر تیج بہادر سپرو اور مسٹری وائی چٹنامنی تھے اس پر آمادہ کر لیا کہ وہ حکومت کے اس رویہ کے خلاف احتجاج کے طور پر اپنا جلسہ اور ڈیفنس فورس کے متعلق تمام کارروائی منسوخ کر دے۔ چنانچہ فوراً اس قسم کا اعلان شائع کر دیا گیا۔ میرا خیال ہے کہ بعض دستخط کرنے والوں کو بعد میں اس کا افسوس ہوا ہوگا کہ جنگ کے زمانے میں انہوں نے ایسی مخالفانہ حرکت کیوں کی۔

مسز بسیٹ کی نظر بندی سے متاثر ہو کر میرے والد اور دوسرے اعتدال پسند

رہنما بھی ہوم رول لیگ میں شریک ہو گئے۔ چند مہینے کے بعد ان میں سے اکثر حضرات مستعفی ہو گئے۔ لیکن میرے والد بدستور اس میں شریک رہے اور الہ آباد کی شاخ کے صدر منتخب ہوئے۔

رفتہ رفتہ میرے والد کو اعتدال پسند جماعت کے عقائد سے نفرت ہوتی جاتی تھی۔ انہیں یہ ہرگز گوارا نہ تھا کہ جو حکومت ہماری کوئی پروا نہ کرتی ہو اور ہم سے حقارت کا برتاؤ کرے ہم خواہ مخواہ اس کی تابعداری اور خوشامد کریں لیکن پرانے انتہا پسند فرقے کی طرف بھی ان کا رجحان نہ تھا کیونکہ ان کے الفاظ میں سختی و اطریت کا رنگ نہیں تھا۔ اور یہ دونوں باتیں اس وقت انہیں پسند نہ تھیں۔ سز، بیعت کی نظر بندی اور اس کے بعد کے واقعات سے وہ بہت زیادہ متاثر ہوئے تھے۔ لیکن مستقل طور پر آگے قدم بڑھانے میں انہیں تامل تھا۔ اس زمانے میں وہ اکثر کہا کرتے تھے کہ اعتدال پسند جماعت کی ترکیبیں محض بیکار ہیں لیکن کیا کیا جائے۔ جب تک ہندو مسلم قضیہ طے نہیں ہوتا تمام کوششیں بے سود ہیں چنانچہ وہ فرماتے تھے کہ اگر یہ مسئلہ حل ہو جائے تو میں تیز قدم سے قدم نوجوانوں کے دوش بدوش چلنے کو تیار ہوں۔ ۱۹۱۲ء میں لکھنؤ کانگریس نے کانگریس اور لیگ کی مشترکہ اسکیم منظور کر لی۔ اس کا خاکہ ال انڈیا کانگریس کمیٹی نے ہماری ہی گھر میں بیٹھ کر تیار کیا تھا۔ والد کو اس سے بے انتہا مسرت ہوئی کیونکہ اس سے متحدہ جدوجہد کے دروازے کھل گئے تھے۔ اب وہ خوشی خوشی آگے بڑھنے کو تیار تھے چاہے اعتدال پسند جماعت کے پرانے رفقا کا انہیں ساتھ چھوڑنا پڑے پھر بھی وزیر ہند کی حیثیت سے ایڈورڈ مانیگو کے ہندوستان آنے تک اور ان کے دورے کے زمانے میں بھی والد ان کے ساتھ رہے۔ اصل اختلاف تو مانیگو چیمفورڈ اسکیم کے شائع ہونے کے بعد شروع ہوا اور بالکل قطع تعلق اس وقت ہو گیا جب ۱۹۱۸ء کی گرمیوں میں یو۔ پی کی اسپیشل کانفرنس کا جلسہ میرے والد کی صدارت میں لکھنؤ میں منعقد ہوا۔ اعتدال پسندوں نے یہ سمجھ کر

کہ یہ کانفرنس مانینگو چیمسفورڈ اسکیم کی سخت مخالفت کرے گی۔ پہلے ہی سے اس کا بائیکاٹ کر دیا۔ اس کے بعد اس اسکیم پر غور کرنے کے لئے کانگریس کا جو خاص اجلاس ہوا اس میں بھی یہ لوگ شریک نہیں ہوئے۔ بس اس زمانے سے اعتدال پسند کانگریس سے علیحدہ ہیں۔

اعتدال پسندوں کی یہ حرکت کہ وہ ہر موقع پر چپکے سے کنارہ کشی اختیار کر لیتے کانگریس کے اجلاس اور دوسرے عام جلسوں میں شرکت کرنے سے گریز کرتے اور اگر اکثریت مخالف ہو تو اپنا نقطہ نظر پیش کرتے اور اس کے لئے لڑنے کی ہمت بھی نہ کر سکتے۔

میرے نزدیک قومی کام کرنے والوں کو کسی طرح زیب نہ دیتی تھی۔ جہاں تک میرا اندازہ ہے، ملک کے اکثر حضرات کی یہی رائے تھی اور مجھے یقین ہے کہ ان کی یہ جھجک اور بزدلی بھی ایک حد تک انہیں ہندوستانی سیاسیات سے خارج کرنے کا باعث ہوئی۔ جب اعتدال پسندوں کی جماعت نے کانگریس کا بائیکاٹ کر دیا تو پرہان میں سے کوئی شخص اس کے جلسوں میں شریک نہیں ہوا۔ البتہ کچھ عرصے صرف مسٹر شاستری شریک ہوتے رہے اور تنہا اپنا نقطہ نظر پیش کرتے رہے۔ اسی سبب سے لوگوں کی نظروں میں ان کی وقعت بڑھ گئی۔

جنگ کے ابتدائی زمانے تک میں سیاسی اور قومی کاموں میں کھل کر حصہ نہ لیتا تھا خاص کر جلسوں میں تقریر کرنے سے بچتا تھا کیونکہ عام مجمع میں زبان کھولتے ہوئے ابھی مجھے خوف اور جھجک سی معلوم ہوتی تھی۔ ایک دوسری وجہ بھی تھی۔ میرا خیال تھا کہ عام جلسوں میں انگریزی میں تقریریں نہ ہونا چاہیے اور اپنے متعلق مجھے یہ اطمینان نہ تھا کہ میں ہندوستانی میں اچھی طرح بول سکوں گا۔ بہر حال الہ آباد میں پہلی مرتبہ میں نے تقریر کی۔ اس وقت کا ایک معمولی سا واقعہ اب تک مجھے یاد ہے۔ غالباً یہ ۱۹۱۵ء کا ذکر ہے لیکن مجھے صحیح تاریخوں کا خیال نہیں ہے اور واقعات کا سلسلہ

بھی میرے ذہن میں کچھ غلط غلط سا ہے۔ اس وقت حکومت نے پریس کا گلا دبانے کے لئے ایک نیا قانون بنایا تھا اس کے خلاف احتجاج کرنے کے لئے ایک جلسہ کیا گیا۔ اسی جلسے میں میں نے مجبوراً انگریزی میں نہایت مختصر تقریر کی۔ جلسہ ختم ہوتے ہی ڈاکٹر تیج بہادر سپرو نے ڈانس ہی پر مجھے گلے لگالیا اور بھر جمع میں پیار کرنا شروع کیا۔ میں گھبرا اٹھا۔ ڈاکٹر سپرو نے جوش کی یہ وجہ نہ تھی کہ میں نے کوئی بڑی بات کہی تھی یا اچھے انداز سے کہی تھی بلکہ اصل وجہ یہ تھی کہ اس زمانے میں قومی کام تقریروں تک ہی محدود تھا اس لئے وہ پھولے نہ ساتے تھے کہ میں نے مجمع کے سامنے زبان تو کھولی۔ گویا قومی کام کے لئے ایک نیا کارکن ہا تھا آ گیا۔

مجھے خیال ہے کہ الہ آباد کے اکثر نوجوانوں کو اس وقت تھوڑی سی یہ امید تھی کہ شاید ڈاکٹر سپرو سیاسیات میں آگے قدم بڑھائیں۔ اعتدال پسندوں کی ساری جماعت میں انہی سے یہ توقع تھی کیونکہ وہ جذباتی آدمی تھے اور کبھی کبھی جوش میں آجاتے تھے۔ ان کے مقابلے میں میرے والد بہت ٹھنڈی مٹی کے معلوم ہوتے تھے لیکن اس راکھ کے نیچے کافی آگ دبی ہوئی تھی۔ شروع شروع میں تو ہم ان کی قوت ارادی کی وجہ سے ان سے مایوس ہو چکے تھے اور ان کے مقابلہ میں ڈاکٹر سپرو سے زیادہ امیدیں رکھتے تھے۔ پنڈت مدن موہن مالویہ کی قومی خدمات بھی بہت زیادہ تھیں اس لئے ہماری نظریں ان کی طرف بھی بڑھتی تھیں۔ ہم ان سے گھنٹوں بات چیت کرتے اور اس پر زور دیتے کہ اس وقت ملک کی معقول رہبری فرمائیے۔

اس زمانے میں ہمارے گھر میں سیاسی مسائل پر خوب گرم گرم بحثیں ہوتی تھیں۔ او جہاں یہ ذکر چھڑا فوراً جھڑپ ہو جاتی تھی والد نہایت غور سے اس چیز کا مطالعہ کر رہے تھے کہ میرا رجحان انتہا پسندی کی طرف ہے اور میں سیاست میں باتیں بنائے کا سخت مخالف اور عملی کام کرنے کا حامی ہوں۔ میں کیا عملی کام چاہتا تھا

یہ اس وقت واضح نہ تھا لیکن کبھی کبھی والد کو یہ خیال ہوتا تھا کہ بنگال کے بعض نوجوانوں کی طرح میں بھی تشدد کی طرف جا رہا ہوں۔ اس سے انہیں بڑی تشویش ہوتی تھی حالانکہ میرا حجام اس طرف قطعی نہ تھا۔ صرف یہ خیال ہر وقت پریشان کیا کرتا تھا کہ موجودہ صورت ہمیں بزدلی کے ساتھ گوارا نہ کرنی چاہیے بلکہ اب کچھ نہ کچھ کرنا چاہیے لیکن کوئی ایسی نتیجہ خیز کاروائی جس سے قوم کا بڑا پارہا پارہا آسان نہ تھی۔ تاہم میرے نزدیک ہماری انفرادی اور قومی عزت کا تقاضا یہی تھا کہ ہم غیر ملکی حکومت کے خلاف زیادہ جارحانہ کاروائی کریں۔ والد بھی اعتدال پسندوں کے نظریہ سے دل برداشتہ تھے اور ان کے دماغ میں بھی خاموش کش کش جاری تھی۔ لیکن ان میں ایک خاص آن تھی جب تک انہیں یقین نہ ہو جاتا کہ اب کوئی دوسرا راستہ نہیں رہا وہ اپنی جگہ سے ہرگز نہ ہٹتے۔ ہر نیا قدم وہ خوب سوچ سمجھ کر اٹھاتے اور جو قدم آگے بڑھ جاتا اس کا پیچھے ہٹنا ناممکن تھا ان کا ہر فعل وقتی جوش کا نہیں بلکہ انتہائی غور و خوج کا نتیجہ ہوتا تھا اور ایک مرتبہ طے کر لینے کے بعد پھر ان کی غیرت اس کی اجازت بھی نہ دیتی تھی کہ وہ پیچھے مڑ کر دیکھیں۔

ان کے سیاسی عقائد میں ظاہری تبدیلی مسز بینسٹ کی نظر بندی کے بعد سے شروع ہوئی۔ اس وقت سے وہ درجہ بدرجہ برابر آگے بڑھتے گئے اور اپنے اعتدال پسند رفقا کو بہت پیچھے چھوڑ دیا حتیٰ کہ ۱۹۱۹ء میں حادثہ پنجاب کے بعد انہوں نے اپنی قدیم معاشرت اور اپنا پیشہ سب کچھ تھج دیا اور گاندھی جی کے شروع کی ہوئی تحریک میں تن من دھن سے شریک ہو گئے۔

لیکن یہ تو ابھی بہت بعد کا ذکر ہے۔ ۱۹۱۵ء اور ۱۹۱۷ء کے درمیان انہوں نے یہ طے نہیں کیا تھا کہ کیا کرنا چاہیے۔ کچھ تو ان کے دل میں ابھی شکوک باقی تھے اور کچھ وہ میری طرف سے بہت پریشان تھے۔ اس لئے حالات حاضری پر وہ سکون کے ساتھ گفتگو نہ کر سکتے تھے۔ اکثر و بیشتر ہماری گفتگو اس طرح یکا یک ختم ہو جاتی

تھی کہ وہ بگڑنے لگتے۔

گانڈھی جی سے میں پہلے پہل ۱۹۱۲ء میں لکھنؤ کانگریس میں ملا تھا۔ جنوبی افریقہ میں انہوں نے حکومت جا جس دلیری سے مقابلہ کیا تھا ہم سب اس کے معترف اور مداح تھے لیکن ہم نوجوانوں کو وہ عجیب و غریب شخص اور کچھ غیر سیاسی آدمی معلوم ہوتے تھے۔ انہوں نے اس وقت کانگریس یا ملک کی سیاست میں حصہ لینے سے انکار کر دیا اور صرف جنوبی افریقہ کے ہندوستانیوں کے معاملے تک اپنی سرگرمیوں کو محدود رکھا۔ اسکے کچھ عرصے بعد ہی انہوں نے چمپارن میں چائے کے کاشتکاروں کی حمایت میں جو معرکے فتح کئے ان سے ہم میں ایک نیا جوش پیدا ہو گیا۔ ہمیں یہ دیکھ کر اطمینان ہوا کہ وہ ہندوستان میں بھی اپنی طریق کار پر عمل کرنے کو تیار ہیں اور اس سے کامیابی کی امید بھی ہوتی ہے۔

لکھنؤ کانگریس کے بعد مسز سروجنی نائیڈو نے الہ آباد میں چند پر جوش تقریریں کیں۔ یہ تقریریں حب الوطنی کے جذبے سے لبریز تھیں۔ مجھے یاد ہے کہ میں ان سے بہت متاثر ہوا کیونکہ میں بھی اس وقت خالص قوم پرست تھا اور کالج کے زمانے کے اشتراکی خیالات کب کے دب چکے تھے۔ ۱۹۱۲ء میں روجر کیس منٹ نے اپنے مقدمے کے دوران میں جو حیرت انگیز تقریر کی اس سے پوری طرح یہ اندازہ ہوا کہ گلام قوم کے ایک فرد کے کیا احساسات ہونا چاہیے۔ پھر آئرلینڈ میں ایسٹر کے زمانے میں ایک بغاوت ہوئی اور ناکام رہی۔ لیکن اس ناکامی میں بھی ایک خاص سبق اور ایک خاص کشش تھی کیونکہ حقیقی جرات ہمیشہ ناکامیوں پر ہنسا کرتی ہے اور پکار پکار کر کہتی ہے کہ کسی قوم کی روح کو جسمانی قوت سے کچلا نہیں جا سکتا۔

اس وقت میرے یہ خیال تھے لیکن مطالعہ ابھی جاری تھا اس لئے میرے دماغ میں اشتراکی چنگاریاں کبھی کبھی روشن ہو جاتی تھیں۔ ابھی یہ باتیں بہت مبہم سی تھیں

ان کی کوئی علمی بنیاد نہ تھی بلکہ یہ محض قیاسی اور نوع انسانی کے مفاد سے متعلق تھیں۔
جنگ کے زمانے میں اور ان کے بعد میرا محبوب مصنف برٹریڈ رسل تھا۔

ان عقائد کی وجہ سے میرے اندر ایک عجیب کش کش بڑھتی جا رہی تھی۔ اس کا
لازمی نتیجہ یہ تھا کہ مجھے وکالت کے پیشے سے نفرت ہوتی جاتی تھی لیکن بالفعل میں
نے اسے جاری رکھا کیونکہ وکالت چھوڑ دینے کے بعد کوئی کام ہی نہ تھا۔ بہر حال یہ
مجھے روز بروز یقین ہوتا جاتا ہے کہ قومی کام خاص کر جارحانہ قسم کے قومی کام کے
ساتھ جس کا میں حامی تھی، وکالت نبھ نہیں سکتی۔ اس وجہ سے نہیں کہ ان میں آپس
میں کوئی بیر ہے بلکہ اس لئے کہ دونوں کے لئے پورے وقت اور زور کی ضرورت
ہوتی ہے۔ کلکتہ کے مشہور وکیل سر اس بھاری گھوش نہ جانے کیوں مجھ سے بڑی
محبت کرتے تھے۔ انہوں نے مجھے وکالت میں کامیابی حاصل کرنے کے سلسلہ میں
بہت سے نصیحتیں کیں اور خاص طور پر یہ مشورہ دیا کہ اپنی پسند کو کوئی قانونی موضوع
لے کر اس پر کتاب لکھ دالو۔ ان کا خیال تھا کہ ایک مبتدی وکیل کی تربیت کا یہ سب
سے بہتر طریقہ ہے۔ انہوں نے یہ بھی وعدہ کیا کہ میں اس کتاب کے لئے تمہے
کافی مواد دوں گا اور اس پر نظر چانی بھی کر دوں گا۔ لیکن میری وکالت کی کامیابی کے
لئے ان کے یہ سب نیک مشورے بیکار تھے۔ کیونکہ میرے نزدیک اس سے بڑی
کوئی حماقت نہ تھی، کہ میں اپنا وقت اور سارا زور قانونی کتابیں لکھنے پر صرف کر
وں۔

بڑھاپے میں سر اس بھاری گھوش بڑے بد مزاج اور چڑچڑے ہو گئے تھے اور
ان کے شاگرد وکیل ان سے خائف رہتے تھے لیکن اس کے باوجود میں انہیں پسند
کرتا تھا کیونکہ ان کی کمزوریوں میں بھی کچھ بانکپن ضرور تھا۔ ایک مرتبہ والد اور میں
شملہ میں ان کے مہمان تھے۔ غالباً یہ ۱۹۱۸ء کا ذکر ہے۔ اس زمانے میں ناننگو
چیمسفورڈ اسکیم شائع ہوئی تھی۔ ایک دن انہوں نے چند دوستوں کی دعوت کی۔ ان

میں مسٹر کھاپڑے بھی تھے۔ یہ دونوں سیاسیات میں بالکل متضاد خیالات رکھتے تھے غرض جب کھانے کے بعد بحث شروع ہوئی تو ان دونوں میں خوب تقاتی ہو گئی۔ سر اس بہاری کے اعتدال پسند تھے اور مسٹر کھاپڑے اس زمانے میں تلک کے خاص پیرو تھے جاتے تھے۔ بعد میں تو وہ ایسے نرم ہو گئے کہ اعتدال پسند بھی ان سے ہزار درجے بہتر تھے۔ مسٹر کھاپڑے نے مسٹر گوکھلے پر (جنہیں انتقال کئے ابھی چند سال ہوئے تھے) اعتراض کرنا شروع کئے اور کہا کہ وہ تو انگریزوں کے مضر تھے اور لندن میں خود میرے خلاف انہوں نے مخری کی۔ سر اس بہاری بھلا یہ کب برداشت کر سکتے تھے۔ وہ پھر گئے اور کہا کہ مسٹر گوکھلے بہترین شخص اور میرے خاص دوست تھے میں انکے خلاف ایک لفظ بھی سننا گوارا نہیں کر سکتا۔ اس پر مسٹر کھاپڑے نے مصتر سری نو اس شاستری کی طرف رخ بدل دیا۔ سر اس بہاری نے اگرچہ اسے بھی اچھے کانوں نہیں سنا۔ لیکن کچھ زیادہ غصہ نہ ہوئے کیونکہ وہ مسٹر شاستری کے ایسے معتقد نہ تھے جیسے مسٹر گوکھلے کے۔ بلکہ انہوں نے اس کا اقرار کیا کہ جب تک مسٹر گوکھلے زندہ رہے وہ برابر سرفٹس آف انڈیا سوسائٹی کی مالی امداد کرتے رہے لیکن ان کے انتقال کے بعد سے اپنا چندہ بند کر دیا۔ اس کے بعد مسٹر کھاپڑے تلک کی تعریف کرنے لگے۔ انہوں نے فرمایا تلک ایک عظیم الشان ہستی اور حیرت انگیز شخصیت کے مالک تھے۔ وہ تو پورے سادھو تھے۔ ”سادھو“ سر اس بہاری نے جھلا کر فوراً جواب دیا۔ ”سادھوں سے مجھے نفرت ہے۔ مجھے ان سے کیا واسطہ!“

(۱) میں نے اس کتاب میں اکثر جگہ مسٹر گاندھی یا مہاتما گاندھی کو گاندھی جی لکھا ہے کیونکہ وہ خود اپنے نام کے ساتھ مہاتما کا استعمال پسند نہیں کرتے اور ”جی“ کو ترجیح دیتے ہیں۔ لیکن انگریز مصنفوں کے مضامین اور کتابوں میں اکثر اس کی عجیب عجیب تاویلیں میری نظر سے گذری ہیں۔ بعض کا خیال ہے کہ یہ محبت کا کلمہ ہے یعنی گاندھی جی کے معنی ہیں۔ ”اچھے پیارے گاندھی“ یہ بالکل لغو ہے اور ہندوستانی تہذیب سے

ناواقفیت کی دلیل ہے۔ ہمارے یہاں ”جی“ ہر شخص کے نام کے ساتھ عام طور پر لگایا جا سکتا ہے۔ چاہے وہ مرد ہو یا عورت، لڑکا ہو یا لڑکی یا بچہ۔ اس سے محض احترام ظاہر ہوتا ہے جیسے مسٹر۔ مسز یا مس وغیرہ سے۔ ہندوستانی زبان میں القاب و آداب اور اعزازی خطابوں کی کمی نہیں ہے۔ ”جی“ ان میں سب سے معمولی اور تکلف سے پاک ہے لیکن اپنے مفہوم کے لحاظ سے بالکل مکمل ہے۔ میرے بہنوئی آر۔ ایس پنڈت نے مجھے بتلایا کہ لفظ ”جی“ نہایت قدیم اور دقیق تاریخ رکھتا ہے۔ یہ سنسکرت کے لفظ آریہ سے مشتق ہے جس کے معنی ہیں معزز یا شریف النسل (وہ مفہوم نہیں جو نازی اس لفظ کا سمجھتے ہیں) رنتہ رنتہ پر اکرت میں آریہ بگڑ کر اجا ہو گیا۔ اور پھر اجا صرف ”جی“ رہ گیا۔



میری شادی اور ہمالیہ کا سفر

میری شادی دہلی میں ۱۹۱۶ء میں ہوئی۔ بسنت چُنچی کا دن تھا جو ہندوستان میں موسم بہار کی آمد آمد کی کبر دیتا ہے۔ اس سال کی گرمیوں میں چند مہینے کے لئے کشمیر گیا۔ اپنے کنبہ کے لوگوں کو تو میں نے نیچے وادی میں چھوڑا اور خود ایک رشتے کے بھائی کے ساتھ کئی ہفتے پہاڑوں پر گھومتا رہا اور لدراچ والی سڑک پر بہت دور تک گیا۔

میں نے ان تنگ اور سنسان وادیوں کو جو دنیا میں سب سے اونچے ہیں اور جن کا سلسلہ تبت سطح مرتفع تک چلا گیا ہے اپنی عمر میں پہلی مرتبہ دیکھا تھا۔ درہ زوجیلہ کی چوٹی پر سے ایک طرف ہرے بھرے پہاڑ نظر آتے تھے اور دوسری طرف سر بنفلک پہاڑ تھے جن کی چوٹیاں برف سے ڈھکی ہوئی تھیں اور برف کے چشنے ہمارے استقبال کے لئے بڑھ رہے تھے۔ اس کی سرد ہوا تیر کی طرح لگتی تھی۔ دن میں دھوپ بھی خاصی تیز ہوتی تھی اور فضا اتنی صاف تھی کہ ہمیں اکثر چیزوں کے فاصلے کے متعلق دھوکا ہو جاتا تھا یعنی دور کی چیزیں بھی بالکل نزدیک معلوم ہوتی تھیں۔ ویرانی بڑھتی جاتی تھی یہاں تک کہ آگے چل کر سبزے اور درختوں نے بھی ہمارا ساتھ چھوڑ دیا صرف کھری پہاڑیاں رہ گئیں یا برف۔ البتہ کہیں کہیں پھول نظر آتے تھے جن کو دیکھ کر دل خوش ہو جاتا۔ مجھے فطرت کے ان ویران اور سنسان رمنوں میں عجیب لطف آتا تھا۔ میری رگوں میں زندگی کا خون دوڑ رہا تھا اور وجد کا عالم طاری تھا۔

اس سفر میں ایک عجیب ہیجان خیز واقعہ پیش آیا۔ جب ہم درہ زوجیلہ سے آگے بڑھے تو ایک مقام پر جسے شاید متلیاں کہتے ہیں یہ معلوم ہوا کہ امر ناتھ کا غار یہاں سے صرف آٹھ میل ہے۔ اگرچہ بیچ میں ایک برف پوش پہاڑ حائل تھا اور اسے عبور کرنا تھا لیکن ہم نے سوچ کہ آٹھ میل کی بھلا کیا حقیقت ہے۔ اپنے جوش اور

تا تجربہ کاری کی بنا پر دل میں ٹھان لی کہ وہاں ضرور پہنچنے کی کوشش کرنا چاہیے۔ ہم اپنے کمپ سے (جو ساڑھے گیارہ ہزار فٹ کی بلندی پر تھا) روانہ ہو گئے اور ایک چھوٹی سے جماعت کے ساتھ پہاڑ پر چڑھنا شروع کیا۔ اسی جگہ کا ایک چرواہا ہمارا رہبر تھا۔

ہماری کمر میں رسی بندھی تھی اور اس کی مدد سے ہم برف کی چٹانوں پر چڑھتے چلے جا رہے تھے۔ رفتہ رفتہ ہماری مشکلیں بڑھنی شروع ہوئیں اور سانس لینا بھی دوہر ہو گیا۔ قلیوں پر اگرچہ کم بوجھ تھا لیکن ان میں سے بعض خون تھوکنے لگے۔ اب برف پڑنی شروع ہوئی اور پہاڑوں پر بری طرح پیر پھسلنے لگے۔ ہم تھک کر پست ہو چکے تھے اور ایک ایک قدم اٹھانے کے لئے خاص کوشش کرنا پڑتی تھی۔ پھر بھی ہم اس احتمالہ حرکت سے باز نہ آئے۔

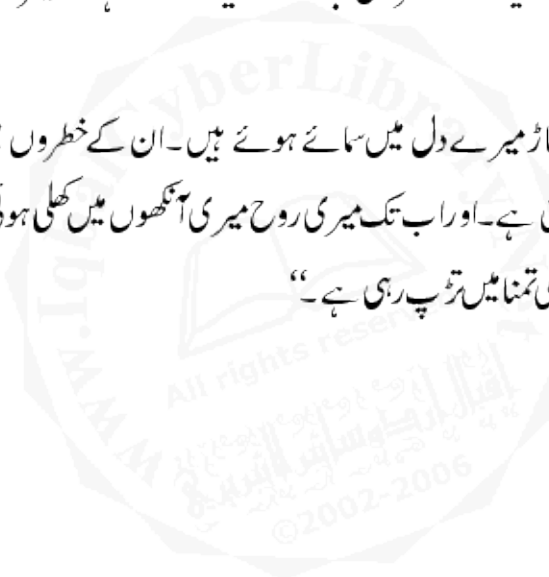
ہم اپنی کمپ سے صبح ۴ بجے روانہ ہوئے تھے۔ بارہ گھنٹے کی مسلسل چڑھائی کے بعد برف سے ڈھکا ہوا ایک وسیع میدان نظر پڑا۔ اس کا نظارہ بڑا دلکش تھا کیونکہ برف کی چوٹیاں اس کے چاروں طرف سر نکالے کھڑی تھیں۔ یہ معلوم ہوتا تھا کہ ہمالیہ کے سر پر موتیوں کا تاج رکھا ہے یا دیوتاؤں کا گول گھر ہے، جس میں بیٹھ کر وہ دنیا کا تماشہ دیکھتے ہیں۔ برف اور کھر کی وجہ سے بہت جلد یہ منظر ہماری نظروں سے پوشیدہ ہو گیا۔ معلوم نہیں کہ جس مقام پر ہم تھے اس کی بلندی کیا تھی؟ غالباً ۱۵ یا ۱۶ ہزار فٹ سے کم نہ ہوگی۔ کیونکہ امرنا تھ کی غار سے ہم بہت اونچائی پر تھے۔ اب ہمیں اس برف کے میدان کو جو آدھ میل کے قریب تھا عبور کرنے کے بعد دوسری طرف اتر کر امرنا تھ پہنچنا تھا۔ ہم نے خیال کیا کہ اب چڑھائی ختم ہوگئی اس لئے ہماری مصیبتوں کا بھی خاتمہ ہو گیا۔ چنانچہ گو ہم تھک کر چور ہو گئے تھے لیکن کامیابی کی خوشی میں ہم نے سفر کی یہ دوسری منزل بھی شروع کر دی۔ اب بڑی نازک صورت پیش تھی کیونکہ قدم قدم پر کھڈتے اور تازہ برف سے بہت سے خطرے کی

جگہیں ڈھک گئی تھیں۔ ایک دفعہ تو اس نے برف نے میری جان ہی لی ہوتی کیونکہ جیسے ہی میں نے اس پر قدم رکھا وہ دھنس گئی اور میں ایک خوفناک کھڈ میں جا پڑا۔ یہ اتنا زبردست اور گہرا تھا کہ اگر کوئی چیز اس کی تک پہنچ جائے تو ہزار سال تک وہاں محفوظ رہ سکتی تھی لیکن میری کمر میں رسی بندھی تھی۔ دوسرے کھڈ کی دیوار سے چٹ گیا تھا۔ غرض بڑی مشکل سے مجھے باہر کھینچا گیا۔ اگرچہ اس حادثے سے ہماری ہمتوں نے بہت کچھ جواب دے دیا تھا پھر بھی ہم اپنے ارادے پر قائم رہے اور آئے قدم بڑھایا۔ لیکن اب یہ کھڈ تعداد میں جتنے زیادہ بڑھتے جاتے تھے، اتنی ہی ان کی وسعت اور گہرائی میں اضافہ ہوتا جاتا تھا۔ ہمارے پاس انہیں عبور کرنے کا کوئی سامان نہ تھا۔ اس لئے مجبوراً ہم تھکے ہارے اور مایوس واپس آئے اور امرنا تھکے غار کو دیکھنے کی حسرت ہی رہ گئی۔

کشمیر کی ان اونچی اونچی وادیوں اور پہاڑوں میں میرا دل کچھ ایسا موہ لیا کہ میں نے ایک بار پھر یہاں آنے کا فیصلہ کر لیا۔ اس کے بعد میں نے بارہا کشمیر جانے کی تجویزیں کیں اور طرح طرح سے سفر کے منصوبے باندھے لیکن کوئی پورا نہ ہوا۔ ایک مرتبہ یہ سوچا کہ تبت کی حیرت انگیز جھیل مانسر دو راور کی تلاش پہاڑ کو جو اس کے نزدیک ہی ہے۔ دیکھنے چلیں گے۔ اس خیال ہی سے میں نے پھولا نہ سات تھا۔ لیکن آج اسے کوئی اٹھارہ برس ہو گئے ہیں ارباب بھی میں مانسر دو راور کی تلاش سے اتنا ہی دور ہوں جتنا پہلے تھا۔ بلکہ اس قدر اشتیاق کے باوجود کشمیر جانا بھی نصیب نہ ہوا کیونکہ سیاسی اور قومی کاموں کے ہجوم میں گھرتا چلا گیا۔ پہاڑوں پر چڑھنے یا سمندروں کا پار کرنے کے بجائے میری جہاں گردی کی خواہش مجھے جیل خانے لے آئی لیکن اب بھی میں وہاں کے خیال سے اپنا دل بہلایا کرتا ہوں کیونکہ اس سے بھی ایک مسرت حاصل ہوتی ہے اور پھر اس کے سوا جیل خانے میں کام ہی کیا ہے۔ میں اس دن کا تصور کیا کرتا ہوں جب میں ہمالیہ کی سیر کرتا پھروں گا اور اسے پار کر کے

اپنی محبوب جھیل اور پہاڑ پر پہنچ جاؤں گا۔ مگر اس عرصے میں زندگی کی دھوپ کہیں سے کہیں پہنچی۔ جوانی ڈھل چی ہے اور ابھی اس سے بدتر وقت آنے والا ہے اس لئے کبھی کبھی تو دل میں یہ مایوس کن خیال آنے لگتا ہے کہ کیلاش اور مانسر دور دیکھنا میری قسمت میں نہیں ہے۔ شاید بڑھاپا اس کی اجازت نہ دے گا لیکن چاہے منزل مقصود نظر آئے یا نہ آئے سفر میں بجائے خود ایک لذت ہے۔ والیٹر ڈے لامبر نے سچ کہا ہے۔

”یہ پہاڑ میرے دل میں سمائے ہوئے ہیں۔ ان کے خطروں میں شام کے شفق کی رنگینی ہے۔ اور اب تک میری روح میری آنکھوں میں کھلی ہوئی۔ تمہاری پرسکون برف کی تمنا میں تڑپ رہی ہے۔“



سیاست میں گاندھی جی کی آمد

ستیاگرہ اور امرتسر

جنگ عظیم کے خاتمے کے وقت ہندوستان میں ایک خاص بے چینی پائی جاتی تھی اگرچہ بہت دبی ہوئی تھی۔ صنعتوں کو کافی فروغ ہو چکا تھا اور سرمایہ داروں کی بدولت اور اقتدار حاصل ہو گیا تھا۔ چوٹی کے یہ مٹھی بھر آدمی اس جنگ کی بدولت خوب پھلے پھولے تھے۔ قوت حاصل کرنے کی دھن میں ان کی ہوس بڑھ گئی تھی اور وہ اپنے منافع کو کسی کام میں لگانے اور اپنی دولت میں اضافہ کرنے کے موافق ڈھونڈ رہے تھے لیکن ملک کی اکثریت اتنی خوش نصیب نہ تھی۔ وہ تو اس بوجھ کے ہاکا ہونے کی آس لگائے بیٹھی تھی جو اسے کچلے ڈالتا تھا۔ اوسط طبقے میں ہر جگہ یہ امید پائی جاتی تھی کہ بہت کچھ آئینی تبدیلیاں ہونے والی ہیں جس سے اپنے ملک کی حکومت کی باگ ڈور بڑی حد تک خود ہمارے ہاتھوں میں آجائے گی۔ گویا ہمارے سامنے ترقی کی نئی نئی راہیں کھل جائیں گی اور اس طرح ہمارے دن پھر جائیں گے۔ سیاسی جدوجہد نہایت پر امن اور آئینی طریقے پر برابر بڑھ رہی تھی اور لوگ وثوق کے ساتھ حکومت خود اختیاری کا ذکر کرنے لگے تھے۔ اس بے چینی کے کچھ نہ کچھ آثار عوام میں اور خاص کر کسانوں میں بھی پائے جاتے تھے۔ پنجاب کے دیہات میں جبر یہ بھرتی کی تلخیوں کو یاد کر کے اب تک لوگوں کے دل بے چین ہو جاتے تھے۔ حکومت نے کوما گٹا مارو، وغیرہ کے لوگوں کو سازشی مقدمات کے ذریعے جس بے دردی سے کچلا تھا اس سے عام طور پر ناراضی کا جذبہ پیدا ہو گیا تھا۔ جو سپاہی محاذ جنگ سے واپس آئے تھے وہ پہلے کی طرح کل کے آدمی نہیں رہے تھے۔ ذہنی اعتبار سے ان میں کافی تبدیلی ہو گئی تھی اس لئے ان میں بھی بے اطمینانی کے آثار موجود تھے۔

اتحادیوں نے شرائط صلح میں ترکوں کے ساتھ بہت ذلت کا برتاؤ کیا تھا۔ اور خلافت کا تو قلع قمع کر دیا۔ مسلمانوں میں اس پر غم و غصہ کا اظہاری کیا جا رہا تھا۔ اور ہیجان بڑھ رہا تھا۔ ابھی صلح نامہ پر دستخط نہیں ہوئے تھے لیکن آثار برے نظر آتے تھے۔ بہر حال مسلمان سہ چہ بہت برہم تھے لیکن ہوا کا رخ دیکھ رہے تھے۔

اس وقت سارے ہندوستان پر شدید انتظار اور امید و بیم کی کیفیت طاری تھی۔ لوگوں کو حکومت سے بڑی امیدیں تھیں لیکن ان میں شک اور تشویش کی جھلک موجود تھی۔ یہی وہ زمانہ تھا جب رولٹ بل شائع ہوا۔ اس کی رو سے حکومت کو اندھا دھند مقدمے چلانے اور گرفتاریاں کرنے کا اختیار دیا گیا تھا۔ اور قانون میں عام طور پر جو احتیاط ہوتی ہے اور جو ضابطے برتے جاتے ہیں اس بل میں ان کا نام تک نہ تھا۔ اس کے شائع ہوتی ہی سارے ہندوستان میں غصہ کی ایک لہر دوڑ گئی۔ حتیٰ کہ اعتدال پسند جماعت بھی اس تحریک میں شریک ہو گئی اور بل کی مخالفت کرنے میں اس نے بھی کوئی کسر اٹھانہ رکھی۔ سچ پوچھئے تو ملک کے گوشہ گوشہ سے ہر خیال کے ہندوستانیوں نے عام طور پر اس کی مخالفت کی۔ پھر بھی ارباب حکومت نے اسے منظور کر لیا اور یہ قانون بن گیا۔ البتہ اتنی عنایت کی گئی کہ اس کی معیاد صرف تین سال مقرر کی گئی۔

آج پندرہ سال بعد اس بل پر ایک نظر ڈالئے اور اس کی وجہ سے جو طوفان اٹھا تھا اس پر ذرا غور کیجئے تو بہت کچھ سبق مل سکتا ہے۔ یہ قانون نافذ تو ہو گیا لیکن جہاں تک مجھے یاد ہے اس کی معیاد کے تین برس میں ایک مرتبہ بھی اس سے کام نہیں لیا گیا حالانکہ تین سال کا یہ زمانہ امن اور سکون سے نہیں گزرا بلکہ ۱۹۵۷ء کے غدر کے بعد سب سے زیادہ شورش کا زمانہ تھا۔ غرض حکومت برطانیہ نے عام مخالفت کے باوجود ایک ایسا قانون نافذ کر دیا جس سے اس نے کبھی کوئی کام نہ لیا اور خواہ مخواہ چھیڑ کر شورش پیدا کی۔ اگر یہ خیال ہو تو بے جا نہیں کہ شاید اس قانون کا مقصد ہی

ہنگامہ پیدا کرنا تھا۔

یہ بھی ایک دلچسپ بات ہے کہ آج پندرہ برس بعد یہاں ایسے متعدد قانون جو رولٹ بل سے کہیں زیادہ سخت ہیں نافذ ہیں اور ان پر آئے دن عمل بھی ہوتا رہتا ہے اگر موجودہ قوانین اور ہنگامی فرمانوں سے جن کے زیر سایہ ہم برطانوی حکومت کی برکتوں کا لطف اٹھا رہے ہیں، رولٹ بل کا مقابلہ کیا جائے تو وہ آزادی کا پروانہ معلوم ہوگا۔ ہاں ایک فرق ضرور ہے اس وقت ملک کے نظم و نسق میں ہمارا زیادہ ہاتھ نہ تھا۔ لیکن اب ۱۹۱۹ء کے بعد ہمیں نام نہاد حکومت خود اختیاری کی بہت بڑی قسط جسے ماسیکو جیمس فورڈ اسکیم کہتے ہیں مل چکی ہے اور یہ کہا جاتا ہے کہ اس سے بھی بڑی ایک اور قسط ملنے والی ہے۔ یعنی ہم ترقی کر رہے ہیں۔

گانڈھی جی اوائل ۱۹۱۹ء میں بہت بیمار پڑ گئے۔ انہوں نے بستر علالت ہی پر سے وائسرائے سے درخواست کی کہ وہ رولٹ بل پر اپنی منظوری صادر نہ فرمائیں، لیکن حسب معمول یہ درخواست بھی ٹھکرا دی گئی اور گانڈھی جی نے ایک حد تک اپنی مرضی کے خلاف ملک کی عام تحریک کی رہبری پہلے پہل اختیار کی۔ انہوں نے سیتا گرہ سبھا کی بنیاد ڈالی۔ اسکے ممبروں کو یہ عہد کرنا ہوتا تھا کہ اگر رولٹ ایکٹ ہم پر نافذ ہوا تو ہم اس کی خلاف ورزی کریں گے۔ اس کے علاوہ ان قوانین کو بھی جنہیں سبھا وقتاً فوقتاً قابل اعتراض قرار دے گی تسلیم نہ کریں گے۔ دوسرے لفظوں میں گویا انہیں کھلم کھلا اور جان بوجھ کر قید گوارا کرنی تھی۔

جب پہلی مرتبہ اخباروں میں یہ تجویز میری نظر سے گزری تو اسے دیکھتے ہی جیسے میرے دل کا بوجھ ہلکا ہو گیا۔ میں نے خیال کیا کہ بالآخر ہماری مشکل کا ایک حل نکل آیا یعنی ایک ایسا طریقہ عمل معلوم ہو گیا جو سیدھا اور سچا بھی ہے اور ممکن ہے موثر بھی ثابت ہو۔ میں جوش سے دیوانہ ہو رہا تھا اور چاہتا تھا کہ فوراً سیتا گرہ سبھا میں شامل ہو جاؤں مجھے کبھی یہ خیال نہ آیا کہ قانون شکنی کے نتیجے میں جیل جانا ہو

گائے۔ یا اگر آیا بھ تو میں نے اس کی کوئی پروا نہ کی۔ یکا یک میرا تمام جوش و
 خروش ٹھنڈا پڑ گیا۔ اور میں نے محسوس کیا کہ یہ اتنا آسان کام نہیں ہے جتنا میں سمجھتا
 تھا کیونکہ ولد پر اس نئی تحریک کا کوئی اثر نہیں ہوا تھا۔ وہ نئی نئی تجویزوں کی رو میں بہنے
 کے عادی نہ تھی بلکہ جب کوئی نیا قدم اٹھاتے تھے تو ہمیشہ اس کے نتائج کو اچھی طرح
 سوچ سمجھ لیتے تھے۔ چنانچہ جب انہوں نے سیتا گرہ سبھا اور اسکے پروگرام پر غور کیا تو
 انہیں یہ چیز بالکل پسند نہیں آئی۔ وہ فرماتے تھے کہ آخر چند آدمیوں کے جیل جانے
 سے کیا فائدہ ہو گا اور حکومت پر اس کا کیا اثر پڑ سکتا ہے۔ اصول مخالفت کے علاوہ
 دراصل ذاتی مصلحتوں سے زیادہ متاثر تھے۔ انہیں یہ گوارا نہ تھا کہ میں جیل جاؤں۔
 جیل میں جانے کا دستور ابھی تک عام نہیں تھا۔ اس لئے قید کے خیال سے ہی لوگوں
 کو وحشت ہوتی تھی۔ والد کو اپنی اولاد سے غیر معمولی محبت تھی۔ وہ اپنے جذبات کو
 ظاہر نہیں کرتے تھے لیکن س ضبط کے پردے میں محبت کے خزانے چھپے ہوئے تھے۔
 ایک مدت تک وہ ذہنی کش مکش میں مبتلا رہے۔ چونکہ ہم دونوں کو اس کا احساس
 تھا کہ ایسے اہم مسائل درپیش ہیں جن سے ہماری زندگیوں میں ایک انقلاب ہو
 جائے گا اس لئے جہاں تک ہو سکتا تھا ہم ایک دوسرے کا بہت لحاظ کرتے تھے۔ ان
 کی پریشانی کھلی ہوئی تھی اور میں چاہتا تھا کہ اگر میرے بس کی بات ہو تو میں اسے
 ضرور رفع کر دوں لیکن یہ میں دل میں ٹھان چکا تھا کہ سیتا گرہ کا راستہ ضرور اختیار
 کروں گا۔ غرض ہم دونوں بڑی مصیبت میں تھے۔ راتوں کو تنہا ٹہلا کرتا تھا اور اسی
 ادھیڑ پن میں رہتا کہ اس مشکل کے حل ہونے کی کوئی صورت نکلے۔ بعد میں مجھے
 معلوم ہوا کہ والد نے فرش پر سونا بھی شروع کر دیا تھا۔ وہ جانتے تھے کہ جیل خانے
 میں مجھے زمین ہی پر سونا پڑے گا اس لئے وہ اس کی تکلیف کا اندازہ کرنا چاہتے تھے۔
 والد کی دعوت پر گاندھی جی الہ آباد شریف لائے۔ ان دونوں میں گھنٹوں باتیں
 ہوتی تھیں لیکن میں وہاں موجود نہ ہوتا تھا۔ اس گفتگو کا یہ نتیجہ ہوا کہ گاندھی جی نے

مجھے پیش قدمی کرنے سے منع کر دیا اور یہ نصیحت کی کہ ایسی کوئی حرکت نہ کرنا جس سے تمہارے والد پریشان ہوں۔ مجھے ان کی یہ بات کس طرح پسند نہ آئی لیکن اس سے پیشتر کہ میں کچھ طے کروں ہندوستان میں چند واقعات ایسے پیش آئے جن سے تمام صورت حال ہی بدل گئی اور سیتا گرہ سبھا کو اپنی سرگرمیاں بند کرنا پڑیں۔

سیتا گرہ کا دن منایا گیا۔ سارے ملک میں مکمل ہڑتال ہوئی اور تمام کاروبار بند رہا۔ دہلی اور امرتسر میں پولیس اور فوج نے عوام پر گولی چلائی اور بہت سے بے گناہ ہلاک ہوئے امرتسر اور احمد آباد میں بلوہ ہوا۔ جلیانوالے باغ میں قتل عام ہوا۔ پھر پنجاب کا صوبہ باقی ہندوستان سے اس طرح جدا کر دیا گیا جیسے اس پر ایک بھاری پردہ پڑا ہوا اور باہر والوں کو اندر کی کوئی چیز نظر نہ آئے۔ وہاں سے کوئی خبر بھی نہ آتی تھی۔ نہ وہاں کے لوگ باہر آ سکتے تھے اور نہ باہر والوں کو وہاں جانے کی اجازت تھی۔

اکا دکا کوئی شخص جو اس آت سے نکل بھاگتا تھا وہ اتنا بدحواس ہوتا تھا کہ وہاں کو کوئی حال بیان نہ کر سکتا تھا۔ ہم باہر والے نیکیسی اور لاچاری میں ذرا ذرا سی خبروں کا آسرا لگائے بیٹھے رہتے تھے اور نفرت ہمارے دلوں میں گھر کر رہی تھی۔ ہم میں سے بعض لوگ اس پر تلے ہوئے تھے کہ کھلم کھلا پنجاب کے مصیبت زدہ علاقے میں جائیں اور مارشل لاء کے ضابطوں کی خلاف ورزی کریں لیکن ہمیں برابر روکا جاتا تھا۔ اسی اثنا میں تحقیقات کرنے اور مظلوموں کو امداد پہنچانے کے لئے ایک بہت بڑا ادارہ قائم ہوا۔

حکومت نے خاص خاص علاقوں سے مارشل لا اٹھالیا اور باہر والوں کو وہاں جانے کی اجازت ہوئی تو بڑے بڑے کانگریسی لیڈر اور دوسرے کارکن چاروں طرف سے پنجاب پہنچ گئے اور انہوں نے امداد اور تحقیقات کے کام کے لئے اپنی خدمات پیش کیں۔ امدادی کام تو بیشتر پنڈت مدن موہن جی مالویہ اور سوامی شردھا

مندجی کی رہبری میں ہوا اور تحقیقاتی کام زیادہ تر میرے والد اور مسٹر آرداس نے انجام دیا۔ گاندھی جی اس کام میں خاص طور پر دلچسپی لے رہے تھے اور اکثر کام کرنے والوں کو مشورے دیتے تھے۔ دلش بندھو داس نے امرتسر کے علاقے کی تحقیقات اپنے ذمے لے اور میں ان کے ساتھ کیا گیا تا کہ ان کا ہاتھ بٹاؤں۔ یہ پہلا موقع تھا کہ میں نے ان کے ساتھ اور ان کی ماتحتی میں کام کیا اور اس طرح مجھے جو تجربہ حاصل ہوا میں اس کی دل سے قدر کرتا ہوں۔ ان کی خوبیوں کو دیکھ کر میرے دل میں ان کی عزت بہت بڑھ گئی۔ جلینا نوالا باغ اور اس بد نصیب گلی کے متعلق جہاں انسانوں کے پیٹ کے بل ریگنے پر مجبور کیا گیا تھا۔ زیادہ تر شہادتیں ہماری موجودگی میں گزریں۔ یہ شہادتیں بعد کو کانگریس کی تحقیقاتی کمیٹی کی رپورٹ میں شائع ہو گئیں۔ اس سلسلے میں ہم بار بار جلینا نوالا باغ بھی گئے اور اس کے چپے چپے کا نہایت غور سے جائز لیا۔

جہاں تک مجھے خیال ہے ایک مرتبہ مسٹر ایڈورڈ تھامسن نے جنرل ڈائر کی حمایت میں ایک عجیب توجیہ کی تھی۔ یعنی جنرل ڈائر کو یہ گمان تھا کہ باغ میں نکاس کے دوسرے راستے بھی ہیں اس لئے وہ اتنی دیر تک گولی چلاتے رہے۔ مانا کہ جنرل ڈائر کو یہ غلط فہمی تھی یا واقعی وہاں دوسرے دو رازے موجود بھی تھے لیکن ان کی ذمہ داری میں کوئی فرق نہیں آتا۔ بہر حال ان کا یہ خیال کچھ سمجھ میں نہیں آتا تھا۔ کوئی شخص اگر اس بلند جگہ پر کھڑا ہو جہاں وہ کھڑتے تھے تو باغ کی ساری زمین اس کی نظر کے سامنے ہوگی اور اسے یہ صاف دکھائی دے گا کہ وہ چاروں طرف سے کئی کئی منزل کے مکانوں سے گھرا ہوا ہے۔ صرف ایک جگہ کوئی سوفٹ کے قریب مکان نہیں ہیں بلکہ پانچ فٹ کی ایک نیچی سی دیوار بنی ہے۔ ایک تو گولیوں کا قاتلانہ بوچھا رکشتوں کے پشتے لگا رہتھی۔ دوسرے باہر نکلنے کا کوئی راستہ نہ تھا اسلئے ہزاروں آدمی اس دیوار پر ٹوٹ پڑے اور اسے پھانسنے کی کوشش کرنے لگے۔ یہ

دیکھ کر مشین گن کا رخ اس طرح کر دیا گیا تاکہ لوگ زندہ نہ بچنے پائیں۔ یہ بات ہماری فراہم کردہ شہادتوں سے اور اس دیوار پر گولی کے بے شمار نشانوں سے ثابت ہوتی ہے اس کا ثبوت بھی موجود ہے کہ جب سارا قصہ ختم ہو گیا تو دیوار کے دونوں طرف مردوں اور زخمیوں کے ڈھیر لگے تھے۔

۱۹۱۹ء کے آخر میں مجھیء رات کی گاڑی سے امرتسر سے دہلی جانے کا اتفاق ہوا۔ میں جس ڈبے میں داخل ہوا وہ بالکل بھرا ہوا تھا۔ اوپر کے ایک گدے کے سوا سب مسافر سو رہے تھے۔ چنانچہ میں اس خالی گدے پر لیٹ گیا۔ صبح اٹھ کر معلوم ہوا کہ میرے سب ہم سفر فوجی افسر ہیں۔ وہ زور زور سے ایک دوسرے سے باتیں کر رہے تھے جو خواہ مخواہ میرے کانوں میں پڑتی تھیں۔ ان میں سے ایک شخص بڑے فاتحانہ انداز سے گفتگو کر رہا تھا۔ مجھے بہت جلد معلوم ہو گیا کہ جلیانوالہ باغ کے سو رما جزل ڈائر یہی ہیں اور اپنے امرتسر کے مشاہدات بیان کر رہے ہیں۔ انہوں نے اپنی دونوں میں فرمایا کہ اس وقت سارا سرکش شہر میرے رحم و کرم پر تھا اگر میں چاہتا تو اسے جلا کر خاک سیاہ کر دیتا لیکن میں نے رحم کھا کر چھوڑ دیا۔ وہ لاہور میں ہنٹر کمیٹی کے روبرو اپنی شہادت دے کر واپس آرہے تھے۔ مجھے ان کی گفتگو سن کر اور ان کی یہ شکاوت دیکھ کر بڑا صدمہ ہوا۔ وہ دہلی کے اسٹیشن پر گلابی دھاری کا پاجامہ اور ڈریسنگ گون پہنے ہوئے اتر گئے۔

پنجاب کی اس تحقیقات کے دوران میں گاندھی جی کو میں نے بہت کچھ دیکھا اور سمجھا۔ اکثر ہماری کمیٹی کو ان کی تجویزیں عجیب و غریب معلوم ہوتی تھیں۔ شروع میں وہ انہیں پسند بھی نہ کرتی تھی۔ لیکن گاندھی جی ہمیشہ اس طرح بحث کرتے اور ایسی ایسی ولیدین پیش کرتے کہ انہیں تسلیم کر کے چھوڑتے پھر بعد کے واقعات سے یہ ثابت ہو جاتا کہ ان کا مشورہ واقعی نہایت معقول تھا۔ اس طرح ان کی سیاسی بصیرت پر مجھے اعتماد ہو گیا۔

والد پر پنجاب کے حادثہ اور اس کی تحقیقات کا بہت گہرا اثر پڑا۔ ان چیزوں نے جیسے ان کے قانونی اور آئینی خیالات کی بنیادیں ہلا ڈالیں۔ اور ان کا دماغ رفتہ رفتہ اس انقلاب کے لئے تیار ہو گیا جو ایک سال بعد ان کی زندگی میں لانے والا تھا۔ وہ اعتدال پسندی کے پرانے عقیدے کو تو کب کا ترک کر چکے تھے۔ سب سے بڑے اعتدال پسند اخبار لیڈر (الہ آباد) سے دل برداشتہ ہو کر انہوں نے اوائل ۱۹۱۹ء میں الہ آبادہ سی ایک دوسرا روزنامہ انڈیپینڈینٹ کے نام سے نکالا۔ اس اخبار کو بہت زیادہ کامیابی حاصل ہوئی لیکن شروع ہی سے اس کا انتظام بہت خراب تھا اور اس کی ذمہ داری کسی نہ کسی حد تک ڈائریکٹر، ایڈیٹر، میجر اور ان کے عملے، سب پر عائد ہوتی تھی۔ میں بھی اس کا ڈائریکٹر تھا حالانکہ مجھے اس کام کا کوئی تجربہ نہ تھا۔ اس کے جھگڑے قضیوں سے میری رات کی نیند حرام ہو گئی تھی۔ بہر حال اس کی جاری ہونے کے تھوڑے ہی دنوں بعد مجھے اور والد دونوں کو پنجاب جانا پڑا۔ ہماری اس طویل غیر موجودگی میں اخبار کی حالت اور بھی ابتر ہو گئی اور وہ مالی مشکلات میں پھنس گیا۔ اس مصوبیت سے پھر وہ کبھی نہ نکل سکا۔ اگرچہ ۱۹۲۰ء اور ۱۹۲۱ء میں اس نے کچھ سنبھالا لیکن ہمارے جیل جانے کے بعد تو رہا سہا شیرازہ بھی بکھر گیا اور ۱۹۲۳ء میں وہ بالکل بند ہو گیا۔ اخبار کی ملکیت کے اس تلخ تجربے نے میرے ایسے اوساط خطاکئے کہ اس کے بعد پھر کبھی میں نے کسی اخبار کا ڈائریکٹر بننا منظور نہ کیا۔ اس کے علاوہ میں یہ بار کیسے اٹھا سکتا تھا۔ کیونکہ یا تو میں جیل میں رہتا تھا یا اگر باہر ہوتا تو اور کام کیا کم تھے۔

۱۹۱۹ء کے آخری ہفتہ میں والد نے امرتسر کانگریس کی صدارت فرمائی۔ انہوں نے اعتدال پسند یا لبرل لیڈروں کے نام (جنہوں نے اب یہ لقب اختیار کر لیا تھا) ایک دردناک اپیل شائع کی اور ان سے درخواست کی کہ مارشل لاء کی تباہ کاریوں نے جوئی صورت حالات پیدا کر دی ہے اس کا لحاظ کر کے آپ اس اجلاس میں

ضرور شریک ہوں۔ اس اپیل میں والد نے لکھا تھا کہ پنجاب کا دل جو زخموں سے چور چور ہے آپ کو پکار رہا ہے۔ کیا آپ اس کی آواز پر لبیک نہ کہیں گے؟ لیکن انہوں نے والد کی حسب منشا جواب نہیں دے اور شرکت سے انکار کر دیا۔ ان کی امیدیں تو ان نئی اصلاحات کی طرف لگنی ہوئی تھیں جو مسٹر مانگیو اور لارڈ چیمفورڈ کی سفارشوں کی بنا پر نافذ ہونے والی تھیں۔ اس انکار سے والد کو بہت صدمہ ہوا اور ان کے اور لبرل جماعت جو خلیج حائل ہو چکی تھی وہ زیادہ وسیع ہو گئی۔

امر ترس کانگریس گویا پہلی گاندھی کانگریس تھی۔ لوکمانیہ تلک بھی اس میں شریک ہوئے اور اس کی کاروائی میں نمایاں حصہ لیا۔ لیکن اس میں کوئی شک نہیں کہ مندوبین کی اکثریت کی، اور ان سے زیادہ اس مجمع کی، جو باہر موجود تھا۔ رہنمائی کے لئے گاندھی جی پر نظر پڑتی تھی۔ اس وقت ہندوستان کے سیاسی مطلع پر ”مہاتما گاندھی کی بے“ کانعرہ چھا رہا تھا۔ علی برادران اسی زمانے میں نظر بندی سے رہا ہوئے اور فوراً کانگریس کی شرکت کے لئے امر ترس پہنچ گئے۔ اب قومی تحریک نے ایک نئی صورت ارونی حیثیت اختیار کرنا شروع کر دی۔

مولانا محمد علی اس کے بعد ہی خلافت کا وفد لیکر یورپ چلے گئے۔ ہندوستان میں خلافت کمیٹی پر روز بروز گاندھی جی کا اثر بڑھتا گیا اور اس نے ان کے پر امن ترک موالات کے اصولوں سے کھیلنا شروع کر دیا۔ مجھے خلافت کے رہنماؤں اور علماء کا ایک ابتدائی جلسہ یاد ہے جو دہلی میں جنوری ۱۹۲۰ء میں ہوا تھا۔ خلافت کا ایک وفد انسرائے کی خدمت میں حاضر ہونے والا تھا اور گاندھی جی بھی اس میں شریک ہونے کو تھے۔ لیکن گاندھی جی کے دہلی پہنچنے سے پہلے مجوزہ ایڈریس کی ایک نقل حسب رواج وائسرائے کو بھیج دی گئی۔ جب گاندھی جی نے آکر مسودہ پڑھا تو اسے سخت ناپسند کیا اور یہاں تک کہا کہ اگر اس میں معقول ترمیم نہ کی گئی تو میں وفد میں شریک نہ ہوں گا۔ ان کا اعتراض یہ تھا کہ یہ ایڈریس نہایت مبہم ہے اور اس میں

محض لفاظی سے کام لیا گیا ہے اور مسلمانوں کے کم سے کم مطالبوں کو واضح طور پر پیش نہیں کیا ہے۔ گاندھی جی کا خیال تھا کہ نہ وائسرائے کے ساتھ انصاف ہے نہ برطانوی حکومت کے ساتھ، نہ قوم کے ساتھ اور نہ خود اپنے ساتھ۔ وہ کہتے تھے کہ آپ کو ایسے لمبے چوڑے مطالبے پیش نہ کرنا چاہیں جن پر زور دینے کے لیے آپ تیار نہ ہوں بلکہ ایسے الفاظ میں جن میں شک و شبہ کی گنجائش نہ ہو، وہ مطالبے صاف صاف پیش کر دینا چاہیے۔ اگر محض باتیں بنانا مقصود نہیں ہے اور سچ مچ آپ کوئی کام کرنا چاہتے ہیں تو صرف یہی باعزت اور سیدھا سچا راستہ ہے۔

ہندوستان کے سیاسی اور غیر سیاسی حلقوں میں یہ خیال بالکل نیا تھا۔ ہم لوگ تو مبالغے اور لفاظی کے عادی تھے اور ہمیشہ ہمارے دماغ میں سودا چکانے کا خیال رہتا تھا۔ بہر حال گاندھی جی اپنے خیال پر جمے رہے اور وائسرائے کے پرائیوٹ سکرٹری کو ایک خط لکھا کہ مجوزہ ایڈریس مبہم اور ناقص ہے اور اس کے ساتھ چند نئے پیرہ گراف اضافہ کرنے کے لئے بھیجے جن میں کم سے کم مطالبے درج کر دیئے تھے۔ وائسرائے نے بہت دلچسپ جواب دیا۔ انہوں نے یہ نئے پیرہ گراف شامل کرنے سے انکار کر دیا اور یہ کہا کہ اصل ایڈریس ہی میری رائے میں مناسب ہے۔ گاندھی جی کو یہ اطمینان ہو گیا کہ اس مراسلت کے بعد مجھ پر اور خلافت کمیٹی پر اب کوئی ذمہ داری نہیں رہی اس لئے وہ وفد میں شریک ہو گئے۔

یہ ظاہر ہے کہ حکومت خلافت کمیٹی کے مطالبات پورے کرنے والی نہ تھی اور لڑائی یقینی تھی اس لئے علماء سے ترک موالات اور خصوصاً عدم تشدد پر طول طویل بحثیں ہوا کرتی تھیں۔ گاندھی جی نے ان سے یہ کہا کہ میں آپ کی خدمت کے لئے دل و جان سے حاضر ہوں لیکن شرط یہی ہے کہ آپ عدم تشدد اور اس کے تمام لوازم کو پوری طرح تسلیم کریں۔ یہ نہ ہو کہ دل میں شبہ باقی رہے اور آگے چل کر اس اصول کی پابندی میں ڈھیل ڈال دی جائے یا ٹال مٹول سے کام لیا جائے۔

عدم تشدد کا اصول علماء کی سمجھ میں آسانی سے نہیں آ سکتا تھا۔ بہر حال وہ اس پر رضامند ہو گئے، لیکن یہ واضح کر دیا کہ ہم اسے عقیدے کی حیثیت سے نہیں بلکہ سیاسی مصلحت کے طور پر اختیار کرتے ہیں، کیونکہ ہمارا مذہب حق کی حمایت میں تشدد کی اجازت دیتا ہے۔

۱۹۲۰ء میں سیاسی تحریک اور خلافت کی تحریک نے ساتھ ساتھ قوت پکڑی دونوں ایک ہی راستے پر چلنے لگیں۔ آخر جب کانگریس نے گاندھی جی کے پر امن ترک موالات کا اصول تسلیم کر لیا تو دونوں بالکل مل گئیں۔ خلافت کمیٹی پہلے ہی یہ اصول تسلیم کر چکی تھی اور یکم اگست اس لڑائی کے شروع کرنے کے لئے مقرر کر گئی تھی۔

سال کے آغاز میں اس طریقہ کار پر غور کرنے کے لئے مسلمانوں کا ایک جلسہ (شاید یہ مسلم لیگ کونسل کا جلسہ تھا) الہ آباد میں سید رضا علی کے مکان پر منعقد ہوا۔ مولانا محمد علی ابھی یورپ سے واپس نہ آئے تھے البتہ مولانا شوکت علی موجود تھے۔ مجھے اس جلسہ کا منظر یاد ہے کیونکہ اسے دیکھ کر مجھے انتہائی مایوسی ہوئی تھی۔ مولانا شوکت علی تو واقعی سر تا پا جوش تھے لیکن ان کے سوا باقی سب لوگ بہت افسردہ اور گھبرائے ہوئے تھے۔ بظاہر وہ کوئی سخت کارروائی کرنے کو تیار نہ تھے لیکن مخالفت کرنے کی بھی ان کی ہمت نہ تھی۔ میں نے اپنے دل میں سوچا کیا یہ لوگ ایک انتہائی تحریک کی رہنمائی کریں گے اور سلطنت برطانیہ کا مقابلہ کریں گے؟ گاندھی جی نے ان کے سامنے تقریر کی۔ معلوم ہوتا تھا کہ اس تقریر کو سن کو وہ پہلے سے زیادہ خود زدہ ہو گئے۔ انہوں نے اپنے خاص حکیمانہ انداز میں تقریر کی۔ انکی گفتگو میں کافی انکسار لیکن ہیرے کی سی صفائی اور سختی تھی۔ ان کا لہجہ خوشگوار اور نرم تھا لیکن انتہائی صداقت اور استقلال کو ظاہر کرتا تھا۔ ان کی آنکھوں میں نرمی اور گہرائی تھی لیکن ان سے طوفان خیز سرگرمی اور عزم کے شرارے نکل رہے تھے۔ انہوں نے

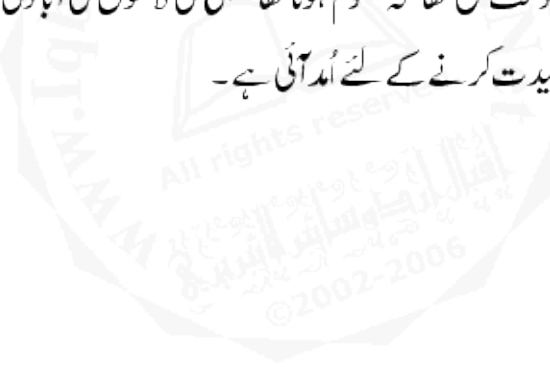
فرمایا۔ ”ایک زبردست دشمن سے بہت بڑی جنگ چھڑنے والی ہے۔ اگر آپ اس جنگ میں شریک ہونا چاہتے ہیں تو آپ کو ہر چیز قربان کرنے کو تیار ہو جانا چاہیے اور اپنے آپ کو عدم تشدد اور انضباط کا نہایت سختی سے خوگر کرنا چاہیے۔ جب جنگ چھڑتی ہے تو فوجی قانون نافذ ہوتا ہے اس لئے اگر ہمیں فتح حاصل کرنا ہے تو ہماری پر امن جگہ منیں بھی مختار کل کی حکومت اور فوجی قانون کا دور دورہ ہوگا۔ آپ کو پورا اختیار ہے کہ جب چاہیں اور جس طرح چاہیں مجھے نکال باہر کریں مجھے سزا دیں یا میرا سراڑا دیں۔ لیکن جب تم آپ مجھے اپنا سپہ سالار تسلیم کریں آپ کو میری شرائط ماننا پڑیں گی۔ یعنی مختار کل کے حکم کی تعمیل اور فوجی ضابطے کی پابندی کرنا پڑے گی۔ مگر یہ حکومت آپ کی خوشنودی اور رضامندی پر منحصر ہوگی اور اس میں آپ کے اشتراک عمل کی ضرورت ہوگی اس لئے جس وقت آپ کا مجھ سے جی بھر جائے مجھے نکال دیجئے گا۔ کچل ڈالنے کا یقین کیجئے کہ میں شکایت کا ایک حرف بھی زبان پر نہ لاؤں گا۔

غرض کہ اس قسم کی کچھ باتیں گاندھی جی نے کیں۔ ان فوجی اصطلاحوں سے اور کہنے والے کے اٹل جوش صداقت سے اکثر سامعین کے رونگٹے کھڑے ہو گئے لیکن مولانا شوکت علی وہاں موجود تھے تاکہ قدم نہ اکھڑنے دیں۔ چنانچہ جب رائے شماری کا وقت آیا تو اکثریت نے شرماء حضوری میں چپ چاپ اس تجویز، یعنی جنگ کے حق میں رائے دے دی۔

جلسے سے واپس ہوتے وقت میں نے گاندھی جی سے پوچھا کہ کیا جنگ اسی طرح شروع کی جاتی ہے۔ مجھے تو جوش و خروش کی توقع تھی، ولولہ انگیز تقریریں سننے کی امید تھی۔ میں آنکھوں سے شعلے نکلتے دیکھنا چاہتا تھا، لیکن اس کے خلاف وہاں تو ادھیڑ عمر کے ضعیف القلب حضرات کا بے ضرور اجتماع تھا۔ مگر انہی لوگوں کو رائے عامہ سے مجبور ہو کر اعلان جنگ کرنا پڑا۔ دراصل ان میں سے بہت تھوڑے حضرات

بعد کو میدان میں آئے۔ بہتوں نے سرکاری عہدوں کی پناہ لے لی۔ مسلم لیگ نہ اس وقت مسلمانوں کی رائے عامہ کی کوئی معقول نمائندگی کرتی تھی اور نہ اب کرتی ہے۔ البتہ ۱۹۲۰ء کی خلافت کمیٹی زیادہ نمائندہ اور با اثر جماعت تھی اور یہی جماعت پورے جوش و خروش کے ساتھ جنگ میں شریک ہوئی۔

عدم تعاون کے افتتاح کے لئے مہاتما جی نے یکم اگست مقرر کی تھی۔ اگرچہ کانگریس نے ابھی باضابطہ اس تجویز کو تسلیم نہیں کیا تھا۔ اسی روز لوہمانیہ تلک کا بمبئی پہنچے۔ میں بھی ان کے ساتھ تھا اور اس عظیم الشان مظاہرے میں شریک ہوا جس میں اس قدر زبردست مجمع تھا کہ معلوم ہوتا تھا بمبئی کی لاکھوں کی آبادی اپنے محبوب رہنما سے اظہار عقیدت کرنے کے لئے اُمد آئی ہے۔



میرا مسوری سے شہر بدر ہونا

اور اس کے نتیجے

شروع میں میرے سیاسی خیالات بھی وہی تھے جو شہری اوسط طبقے کے ہوتے ہیں کیونکہ میں اسی طبقے سے تعلق رکھتا تھا۔ سچ پوچھئے تو اس زمانے میں (بلکہ بڑی حد تک اب بھی) متوسط طبقہ ملکی سیاست پر حاوی تھا۔ اعتدال پسند اور انتہا پسند دونوں اسی طبقے کی نمائندگی اور مختلف صورتوں سے انہی کی بہتری کی کوشش کرتے تھے۔ اعتدال پسند تو خاص کر متوسط طبقے کے اونچے درجے کے ان مٹھی بھر لوگوں کے نمائندے تھے جو برطانوی دور میں پھلے پھولے ہیں۔ اس لئے وہ ایسی فوری تبدیلی گوارا نہیں کر سکتے تھے جس سے ان کی موجودہ حیثیت اور ذاتی مفاد خطرے میں پڑ جائے۔ برطانوی حکومت اور زمینداروں کے اعلیٰ طبقے سے ان کے گہرے تعلقات تھے۔ رہے انتہا پسند تو وہ بھی متوسط طبقے کے نیچے درجے کے لوگوں کے نمائندے تھے۔ کارخانے کے مزدوروں میں جن کی تعداد جنگ کی وجہ سے کافی بڑھ گئی تھی بعض بعض جگہ محض مقامی طور پر تنظیم تھی اور ان کا اثر بہت ہی کم تھا۔ کسان پچارے نا سمجھ فلاکت زدہ اور مصیبتوں کا شکار تھے، وہ اپنی بد نصیبی پر صابر و شاکر رہتے تھے اور حکومت، زمیندار، مہاجن، ادنیٰ عہدے دار، پولیس، وکیل، مذہبی پیشوا غرض ہر ایک انہیں کچلتا اور لوٹتا تھا۔

کوئی اخباریں شخص مشکل سے اس کو تصور کر سکتا تھا کہ ہندوستان میں لاکھوں کسان اور مزدور بھی بستے ہیں یا کوئی اہمیت رکھتے ہیں۔ اینگلو انڈین اخبارات تو اعلیٰ افسروں کے مشاغل کی خبروں سے بھرے ہوتے تھے۔ ان میں بڑے بڑے شہروں اور پہاڑوں کے رہنے والے انگریزوں کی تفریحوں کا ان کی دعوتوں، ناچ رنگ کی محفلوں اور کھیل تماشوں کا حال خوب تفصیل سے لکھا جاتا تھا۔ ہندوستانی نقطہ نظر

سے کوئی تذکرہ نہ کرتا تھا حتیٰ کہ کانگریس کے اجلاسوں کا حال بھی کسی پچھلے صفحے پر چند سطروں میں لکھ کر ختم کر دیا جاتا تھا۔ دراصل اس قسم کی خبروں کو وہ کوئی اہمیت ہی نہ دیتے تھے۔ ہاں اگر کوئی ہندوستانی خواہ معروف ہو یا غیر معروف کانگریس کا مذاق اڑاتا تھا یا اس پر نکتہ چینی کرتا تھا تو اسے خوب بڑھا چڑھا کر لکھتے تھے۔ کبھی کبھی کسی ہڑتال کا مختصر اسفا ذکر ہوتا تھا اور دیہی علاقے صرف اس وقت نمایاں ہوتے تھے جب وہاں کوئی بلوہ ہو جاتا تھا۔

ہندوستانی اخبار اپنے اینگلو انڈین معاصرین کی نقل کرتے تھے۔ لیکن قومی تحریکوں کو ذرا زیادہ اہمیت دیتے تھے۔ ویسے انہیں بھی چھوٹے بڑے عہدوں پر ہندوستانیوں کے تقرر اور ان کے تبادلے اور ترقیوں سے دلچسپی تھی۔ جب کبھی کسی افسر کا تبادلہ ہوتا تو الوداعی پارٹی کا ہوان لازمی تھا اور ایسے موقعوں پر ہمارے اخبارات یہ ضرور لکھتے کہ ”بڑے جوش و خروش کا اظہار کر گیا“، اگر کسی زرعی علاقے کا نیا بدوبست ہوتا جس سے ہمیشہ حکومت کی مالگذاری میں اضافہ ہوا کرتا ہے تو یہ اخبار ضرور کچھ شور مچاتے کیونکہ اس کا اثر زمیندار کی جیب پر پڑتا تھا۔ غرض اس موقع میں غریب کسان کہیں نظر نہ آتا۔ عموماً ان اخباروں کے مالک زمیندار یا کارخانے دار ہوتے تھے اس لئے وہی ان کی پالیسی پر حاوی ہوتے تھے۔ یہ تھی ان اخباروں کی حقیقت جسے ”قومی پریس“ کے نام سے تعبیر کیا جاتا ہے۔

اپنے ابتدائی زمانے میں خود کانگریس برابر مطالبہ کیا کرتی تھی کہ ان علاقوں میں بھی استمراری بندوبست کر دیا جائے جہاں اب تک نہیں ہے۔ اس کا مقصد یہی تھا کہ زمینداروں کے حقوق مسلم ہو جائیں۔ کسانوں کا کوئی خیال نہ تھا۔

لیکن پچھلے بیس برس میں قومی تحریک کی وجہ سے حال بدل گئی ہے اب تو اینگلو انڈین اخبار بھی ہندوستانی سیاسیات کے لئے جگہ نکالنے پر مجبور ہیں ورنہ ہندوستانی نہیں ہرگز نہ خریدیں۔ لیکن وہ ہندوستانی مسائل کو اپنے رنگ میں پیش کرتے ہیں

ہندوستانی اخباروں کی نظر بھی کچھ وسیع ہو گئی ہے۔ اب وہ بھی مزدوروں اور کسانوں کا تذکرہ مربیانہ انداز میں کرتے ہیں کیونکہ یہ بھی ایک فیشن ہو گیا ہے۔ اسکے علاوہ ان کے خریداروں کو دیہی اور صنعتی معاملات سے زیادہ دلچسپی ہوتی جاتی ہے۔ لیکن حقیقت میں جیسے وہ پہلے اپنے مالکوں یعنی سرمایہ داروں اور زمینداروں کے مفاد کی حمایت کرتے تھے اسی طرح اب بھی کرتے ہیں۔ بہت سے والیان ریاست بھی اخباروں میں روپیہ لگانے لگے ہیں۔ وہ اس ترکیب سے پورا فائدہ اٹھاتے ہیں اور اپنی کوڑی کوڑی وصول کر لیتے ہیں۔ اکثر اخباروں کے مالک اور نگران کانگریس کا نام لوگوں میں بہت مقبول ہے اس لئے بہت سے افراد اور بہت سی جماعتیں اس سے ناجائز فائدہ اٹھاتی ہیں۔ کچھ اخبار ایسے بھی ہیں جو زیادہ آزاد خیالی سے کام لیتے ہیں لیکن انہیں مطالبہ کے سخت قوانین اور سنسر کا ڈر لگ رہا ہے کہ کہیں اخبار بند نہ کر دیا جائے یا ضمانت نہ طلب کر لی جائے۔

۱۹۲۰ء میں مجھے کھیتوں یا کارخانوں کی حالت کا بالکل علم نہ تھا کیونکہ میرے سیاسی خیالات کی مصیبت میں گرفتار ہے اس لئے آزادی حاصل ہوتے ہی سب سے پہلے اس مسئلے کو حل کرنے کی کوشش کرنا چاہیے۔ لیکن یہ میں اچھی طرح سمجھتا کہ آزادی کے بعد متوسط طبقہ ملک کی سیاست پر حاوی ہو جائے گا۔ چمپارن (بہار) اور کیرا (گجرات) میں گاندھی جی کی زرعی تحریکوں کے بعد مجھے کسانوں کے مسئلے سے بھی کچھ دلچسپی ہو گئی تھی۔ لیکن ۱۹۲۰ء کے سیاسی ہنگاموں اور ترک موالات کی تحریک سے جو شروع ہونے والے ہی تھی۔ مجھے اتنی فرصت کہاں تھی کہ اس طرف کچھ توجہ کرتا۔

اس زمانے میں مجھے ایک نئی چیز سے دلچسپی پیدا ہو گئی جو آگے چل کر میری زندگی میں خاص اہمیت اختیار کرنے والی تھی، یعنی تقریباً بلا ارادے مجھے کسانوں سے سابقہ پڑا اور اس کی عجیب صورت ہوئی۔

میری ماں اور میری بیوی کملا دونوں کچھ بیمار تھیں اس لئے مئی ۱۹۲۰ء کے پہلے ہفتے میں، میں انہیں مسوری لے گیا۔ میرے والد اس وقت ایک بڑی ریاست کے مقدمے کی پیروی کر رہے تھے اور مسٹری۔ آر۔ داس دوسرے فریقے کے وکیل تھے۔ ہم مسوری کے سیوائے ہوٹل میں جا کر اترے۔ امان اللہ خاں کے تحت نشین ہونے کے بعد افغانستان اور برطانیہ میں ۱۹۱۹ء میں ایک مختصر سی جنگ ہو گئی تھی۔ اس زمانے میں ان دونوں حکومتوں کے نمائندے مسوری میں موجود تھے اور مصالحت کی گفتگو ہو رہی تھی۔ افغانی نمائندے سیوائے ہوٹل میں ٹہرے ہوئے تھے لیکن وہ سب سے الگ تھلک رہتے تھے۔ الگ بیٹھ کر کھانا کھاتے اور ہوٹل کے عام کمرے میں کبھی قدم نہ رکھتے۔ مجھے ان سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ ایک مہینے کے قیام میں ان میں سے کسی شخص کو میں نے دیکھا تک نہ تھا یا اگر دیکھا بھی ہو تو پہچانتا نہ تھا۔ یکا یک ایک دن شام کے وقت سپرنٹنڈنٹ پولیس ہمارے یہاں پہنچے اور صوبہ متحدہ کی حکومت کا ایک خط مجھے دکھایا، جس میں مجھ سے اس قسم کے اقرار نامہ کا مطالبہ کیا تھا کہ میں افغانی وفد سے کوئی راہ و رسم یا تعلق نہ رکھوں گا۔ یہ بات مجھے عجیب سی معلوم ہوئی۔ کیونکہ پچھلے ایک مہینہ کے قیام میں، میں ان میں سے کسی سے نہیں ملا تھا نہ آئندہ اس کی کوئی امید تھی۔ سپرنٹنڈنٹ موصوف بھی یہ بات اچھی طرح جانتے تھے۔ کیونکہ وہ ان کی خاص نگرانی کر رہے تھے اور ان کے پیچھے خفیہ پولیس کے سینکڑوں آدمی لگے ہوئے تھے۔ بہر حال اس طرح کا اقرار نامہ لکھنا میری طبیعت کے خلاف تھا اس لئے میں نے صاف انکار کر دیا۔ انہوں نے فرمایا کہ اگر آپ دہرہ کے ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ سے مل لیں تو اچھا ہو، میں نے ان کی اس تجویز کو منظور کر لیا اور ان سے ملا لیکن چونکہ میں اقرار نامہ لکھنے سے برابر انکار کرتا رہا اس لئے مجھے حکم دیا گیا کہ میں چوبیس گھنٹے کے اندر دہرہ دودن کے ضلع سے باہر نکل جاؤں۔ اس کا یہ مطلب تھا کہ مسوری سے میں چند گھنٹے کے اندر روانہ ہو جاؤں۔ میرا دل تو نہ چاہتا

تھا کہ اپنی بیماریاں اور بیوی کو چھوڑ کر چلا جاؤں۔ لیکن اس وقت سول نافرمانی شروع نہیں ہوئی تھی اس لئے میں نے اس حکم کی خلاف ورزی کرنا مناسب نہ سمجھا اور مسوری سے روانہ ہو گیا۔

اس زمانے میں سر ہارکورت ہٹلر صوبہ متحدہ کے گورنر تھے۔ میرے والد انہیں اچھی طرح جانتے تھے۔ اس لئے والد نے انہیں ایک دوستانہ خط لکھا جس میں یہ خیال ظاہر کیا کہ بے اطمینانہ حکم یقیناً آپ نے جاری نہ کیا ہوگا بلکہ شملہ کے کسی حضرت کی یہ کارستانی ہے۔ سر ہارکورت نے جواب دیا کہ یہ حکم تو بالکل بے ضرر سا تھا اور اگر جواہر لال اس کی تعمیل کر دیتے تو اس میں ان کی کوئی بے عزتی نہ ہوتی۔ والد نے انہیں پھر خط لکھا اور ان کی اس رائے سے اختلاف کیا۔ اس کے ساتھ یہ بھی لکھ دیا کہ بالفعل اگرچہ اس حکم کی خلاف ورزی کرنے کا کوئی ارادہ نہیں ہے لیکن اس کی والدہ یا بیوی کی علالت کی وجہ سے کوئی ضرورت محسوس ہوئی تو وہ اس حکم کی ذرا پروا نہ کرے گا اور ضرور مسوری جائے گا۔ اتفاق سے میری والدہ کی طبیعت زیادہ خراب ہو گئی۔ یہ اطلاع پاتے ہی والد اور میں دونوں فوراً مسوری کو روانہ ہو گئے۔ لیکن روانگی سے ذرا پہلے ہمیں حکومت کا تار ملا کہ وہ حکم منسوخ کر دیا گیا ہے اور تمہیں مسوری جانے کی آزادی ہے۔

دوسرے دن صبح ہم مسوری پہنچے تو ہوٹل کے صحن میں سب سے پہلے ہماری نظر ایک افغان پر پڑی جو میری ننھی بچی کو گود میں لئے کھلا رہا تھا۔ دریافت کرنے پر معلوم ہوا کہ یہ افغانستان کے وزیر اور اس وفد کے رکن ہیں۔ پھر یہ بھی پتہ چلا کہ میرے شہر بدر کئے جانے کے بعد ہی افغانیوں نے اخبار میں یہ خبر پڑھی اور انہیں ہم لوگوں سے اتنا تعلق خاطر ہو گیا کہ سالاروند روزانہ میری ماں کو پھلوں اور پھولوں کی ایک ٹوکری بھیجا کرتے۔

اس کے بعد والد اور میں وفد کے دو ایک اراکین سے ملے اور ان لوگوں نے

ہمیں افغانستان آنے کی دعوت دی۔ افسوس ہے کہ ہمیں وہاں جانے کا موقع نہ ملا۔ معلوم نہیں کہ وہاں کے جدید انقلابات کے بعد بھی ان کی وہ دعوت قائم ہے یا اب منسوخ ہوگئی۔

مسوری سے شہر بدر کئے جانے کے بعد میں دو ہفتہ تک الہ آباد میں رہا اس زمانے میں کسانوں کی تحریک سے مجھ کچھ لگاؤ پیدا ہو گیا۔ اس کے بعد یہ لگاؤ بڑھتا گیا اور اس سے میری ذہنیت پر بہت کچھ اثر پڑا۔ اکثر مجھے یہ خیال آتا ہے کہ اگر میں مسوری سے نکال نہ گیا ہوتا اور اس زمانے میں الہ آباد میں بیکار نہ ہوتا تو اس وقت میرا کیا رنگ ہوتا۔ بہر حال کبھی نہ کبھی تو کسانوں کی تحریک سے مجھے ضرور سابقہ پڑتا لیکن شاید اس کی نوعیت مختلف ہوتی ور مجھ پر اس کا اثر بھی کچھ اور ہوتا۔

جہاں تک مجھے یاد ہے ۱۹۲۰ء کے پہلے ہفتہ میں کوئی دوسو کسان ضلع پاتاب گڈھ سے پچاس میل چل کر الہ آباد پہنچے تا کہ مقتدر رہنماؤں کو اپنے حال زار کی طرف توجہ دلائیں۔ رام چند نامی ایک شخص ان کا رہبر تھا۔ یہ خود کوئی مقامی کسان نہ تھا۔ مجھے معلوم ہو کہ یہ لوگ جمن گھاٹ پر زمین پر بیٹھے ہوئے ہیں۔ میں چند دوستوں کے ساتھ انہیں دیکھنے گیا۔ انہوں نے ہمیں بتایا کہ حلقہ داران سے اتنا وحشیانہ سلوک کرتے ہیں اور اس بری طرح لوٹتے ہیں کہ اب پانی سر سے اونچا ہو گیا ہے۔ انہوں نے ہم سے منتیں کیں کہ ہمارے ساتھ چل کر تحقیقات کیجئے اور ہمیں تعلقہ داروں کے غضب سے بچائیے کیونکہ وہ اس بات سے اور زیادہ ناراض ہو گئے ہیں کہ ہم ان کی شکایت کرنے الہ آباد کیوں آئے۔ ہم نے لاکھ عذر کیا مگر یہ کسان کسی طرح نہیں مانے اور سچ مچ ہم سے چٹ گئے۔ آخر مجھے ان سے وعدہ کرنا پڑا کہ دو تین دن بعد میں ضرور آؤں گا۔

میں اپنے چند ساتھیوں کے ہمراہ وہاں گیا اور ریل اور پکی سڑک سے بہت دور تین دن گاؤں میں گزارے۔ اس دورے سے ہماری آنکھیں کھل گئیں۔ ہم نے

دیکھا کہ سارے دیہات جوش و خروش سے بھرے ہوئے ہیں اور ان میں عجیب
 ہیجان برپا ہے۔ زبانی اطلاع پر دم بھر میں ہزاروں لاکھوں آدمی جمع ہو جاتے تھے۔
 ایک گاؤں دوسرے کو خبر کرتا تھا اور دوسرا تیسرے کو اسی طرح انا فانا تمام گاؤں خالی
 ہو جاتے اور مرد، عورتیں اور بچے چاروں طرف جلسہ گاہ کی طرف بھاگتے نظر آتے۔
 اس سے زیادہ تیزی سے ”سیتارام“ کا نعرہ کام کرتا تھا۔ جہاں یہ نعرہ بلند ہوا اس کی
 آواز فضا میں پھیلی، فوراً دوسرے گاؤں کے لوگ یہی نعرہ لگاتے ہوئے اُٹھ آتے
 تھے بلکہ بعض تو تیزی سے دوڑتے تھے۔ عورتوں اور مردوں، سب کی چھتھڑے لگے
 تھے۔ لیکن ان کے چہرے جوش سے متماتے تھے اور ان کی آنکھوں میں ایک خاص
 چمک نمودار تھی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا انہیں یقین ہے کہ کوئی معجزہ ہونے والا ہے جس
 سے ان کی مصیبتوں کا خاتمہ ہو جائے گا۔

انہوں نے ہم پر الفت و محبت کی بارش کر دی۔ وہ ہمیں ایسی امید و محبت بھری
 نظروں سے دیکھتے جیسے ہم راحت و مسرت کا پیام لے کر آئے ہیں یا وہ خضر راہ ہیں
 جو انہیں ”منزل موعود“ پر پہنچا دیں گے۔ ان کی مصیبتوں اور اتھاہ محبتوں کو دیکھ کر
 افسوس اور شرم سے میری گردن جھک گئی۔ شرم تو مجھے خود اپنی عیش و آرام کی زندگی پر
 اور شہروں کی اس ادنیٰ سیاست پر محسوس ہوئی جو وطن کے ان نیم برہنہ بیٹوں اور
 بیٹیوں کی اتنی بڑی جماعت کی طرف نگاہ اٹھا کر بھی نہیں دیکھتی اور رنج سے اس لئے
 کہ ہندوستان کی مفلسی اور تنزل کو دیکھ کر دل پھٹا جاتا تھا۔ اب میری نظروں کے
 سامنے مادر وطن کا ایک نیا تصور قائم ہو گیا۔ یعنی ننگی۔ بھوی۔ ستم رسیدہ اور تباہ حال!
 غرض ان لوگوں کو ہم پر جو دور کے ایک شہر سے سرسری طور پر یہاں آئے تھے غیر
 معمولی بھروسا تھا۔ اسے دیکھ دیکھ کر مجھے گھبراہٹ ہوتی تھی اور ایسی نئی ذمہ داری کا
 بار محسوس ہوتا تھا جس کے خوف سے میں کانپا جاتا تھا۔

میں نے ان کے مصیبتوں کی ان گنت کہانیاں سنیں اور مجھے معلوم ہوا کہ وہ

لگان کے روزافزوں بوجھ سے دبے جا رہے ہیں۔ ناجائز طور پر ان سے زبردستی روپیہ وصول کیا جاتا ہے۔ انہیں کھیت سے بیدخل کیا جاتا ہے اور ان کی جھونپڑیاں تک چھین لی جاتی ہیں۔ پھر اوپر سے مار پڑتی ہے۔ غرض چاروں طرف سے خونخوار گدھ (یعنی زمینداروں کے کارندے، مہاجن اور پولیس وغیرہ) ان پر ٹوٹ پڑے ہیں اور ان کی بوٹیاں نوچ نوچ کر کھا رہے ہیں۔ وہ پچارے سارے دن محنت کرتے ہیں۔ چوٹی سے ایڑی تک پسینہ بہا تھیں۔ لیکن شام کو انہیں پتہ چلتا ہے کہ ہم نے جو کچھ کیا وہ ہماری چیز نہیں ہے۔ ہمارا انعام تو صرف ٹھوکریں اور گالیاں ہیں اور فاقے ہماری قسمت میں لکھے ہیں۔ جو لوگ وہاں موجود تھے ان میں سے اکثر کے پاس کاشت کے لئے ایک چپہ زمین نہ تھی۔ زمینداروں نے انہیں بیدخل کر دیا تھا۔ نہ ان کے پاس کھیت تھا کہ وہ اس پر گزر کر سکیں اور نہ جھونپڑی کہ وہاں جا کر پڑ رہیں۔ زمین خوب زرخیز ہے، لیکن اس بار بہت زیادہ ہے۔ جوت کا رقبہ کم ہے اور بہت سے لوگ اس کے خواستگار ہیں۔ زمین کی اس مانگ کو دیکھ کر زمیندار ان سے ناجائز نذرانے وصول کرتے ہیں کیونکہ از روئے قانون وہ لگان نہیں بڑھا سکتے اور آسامی کے پاس کوئی چارہ کار ہی نہیں ہے اس لئے وہ مہاجن سے روپیہ قرض لیتا ہے اور زمیندار کی نذر کرتا ہے۔ پھر جب یہ نوبت آتی ہے کہ نہ تو وہ قرض ادا کر سکتا ہے اور نہ لگان، تو بیدخل کر دیا جاتا ہے اور ہاتھ جھاڑ کر کھڑا ہو جاتا ہے۔

یہ صورت عرصے سے جاری تھی اور رعیت کا افلاس روز بروز بڑھ رہا تھا پھر اب کوئی ایسی بات ہوئی کہ معاملہ اس حد تک پہنچ گیا اور سب دیہات یکا یک اٹھ کھڑے ہوئے۔ معاشی حالت یقیناً خراب تھی لیکن یہ تو تمام اودھ میں یکساں تھی۔ پھر ۲۰ء کی کسانوں کی ہلچل صرف پر تاب گدھ رائے بریلی اور فیض آباد کے اضلاع تک کیوں محدود رہی۔ دراصل یہ جوش و خروش ایک حیرت انگیز شخص رام چندر کی بدولت پیدا ہوا۔ جسے لوگ عام طور پر بابا رام چندر کہا کرتے تھے۔

رام چندر مہاراشٹر کا رہنے والا تھا اور پابند مزدور کی حیثیت سے بنی ہو آیا تھا۔ وہاں سے واپسی پر اس نے رفتہ رفتہ اودھ کے ان اصنافِ کارخ کیا۔ وہ یہاں کے دیہات میں گشت لگاتا۔ تلسی داس کی رامائن گا گا کر سناتا اور کسانوں کی تکلیفیں ہمدردی سنا کرتا تھا۔ وہ کچھ ایسا پڑھا لکھا نہ تھا اور کسی حد تک کسانوں سے اس نے ناجائز فائدہ بھی اٹھایا۔ لیکن اس میں تنظیم کی غیر معمولی قوتیں تھیں۔ اس نے کسانوں کو مل بیٹھنا اور اپنی مصیبتوں پر غور و بحث کرنا سکھایا۔ گویا ان میں اتحادِ عمل کا ایک جذبہ پیدا کر دیا۔ کبھی کبھی بڑے بڑے جلسے بھی ہوتے تھے اور اس طرح کسانوں کو اپنی قوت کا احساس ہوتا تھا۔ ’سیتا رام‘ بہت پرانا اور عام نعرہ ہے لیکن اس نے اسے جنگی اہمیت دے دی۔ یہ کسی حادثے یا ہم واقعے کی اطلاع کا نشان اور مختلف دیہات میں اتحاد کا ایک ذریعہ ہو گیا فیض آباد، پرتاپ گڈھ اور رائے بریلی میں رام چندر اور سیتا کے پرانے فسانے بہت عام ہیں۔ کیونکہ یہ اصنافِ سلطنتِ اجودھیا میں شامل تھے اور تلسی داس کی کتاب ہندی رامائن عوام میں بہت مقبول ہے۔ اکثر لوگوں کو اس کی بہت سی نظمیں زبانی یاد ہیں۔ رام چندر اس کتاب کے اقتباسات نہایت موقع موقع سے سنایا کرتا تھا۔ اس میں اسے بہت ملکہ حاصل تھا۔ کسانوں کی تھوڑی بہت تنظیم کرنے کے بعد اس نے ان سے طرح طرح کے وعدے کئے۔ اگرچہ وعدے نہایت مبہم تھے۔ لیکن بھولے بھالے کسانوں کو ان سے بڑی بڑی امیدیں ہو گئی تھیں۔ رام چندر کے سامنے کوئی باضابطہ لائحہ عمل نہ تھا، اس لئے جب اس نے دیکھا کہ جوش اپنے پورے شباب پر پہنچ گیا ہے تو اپنی ذمہ داری دوسروں کے سر ڈالنے کی کوشش کی۔ اسی مقصد سے وہ بہت سے کسانوں کو الہ آباد لایا تا کہ دوسرے لوگوں کو اس تحریک سے دلچسپی پیدا ہو جائے۔

رام چندر ایک سال اور کسانوں کی تحریک میں نمایاں حصہ لیتا رہا اور دو تین مرتبہ جیل بھی گیا۔ لیکن بعد میں معلوم ہوا کہ وہ نہایت غیر ذمہ دار اور ناقابلِ اعتماد شخص

تھا۔

کسانوں کی تحریک کے لئے اودھ کا علاقہ خاص طور پر موزوں تھا۔ یہ تعلقداروں کا ملک ہے جو اپنے آپ کو ”اودھ کے نواب“ کہتے ہیں۔ زمینداری کے نظام کی سب سے مکروہ صورت یہاں نظر آتی ہے۔ تعلقداروں کی زیادتیاں ناقابل برداشت ہوتی جاتی تھیں اور ایسے کسانوں کی تعداد روز بروز بڑھتی جاتی تھی، جن کے پاس کاشت کے لئے ایک چپہ زمین نہ تھی اور مزدوری پر ان کی گذراوقات تھی۔ وہاں صرف ایک قسم کے آسامی تھے۔ اس لئے متحدہ جدوجہد آسانی سے ممکن تھی۔

زرعی اعتبار سے ہندوستان کو سرسری طور پر دو حصوں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے۔ یعنی بڑے بڑے زمینداروں کا علاقہ اور ان چھوٹے چھوٹے کاشتکاروں کا علاقہ جو اپنی آراضی کے خود مالک ہیں۔ کہیں کہیں یہ دونوں خط لفظ بھی ہیں۔ بنگال، بہار اور صوبہ جات متحدہ میں زمینداری کا طریقہ رائج ہے۔ اکثر ان کسانوں کی حالت جو خود اپنی آراضی کے مالک ہیں نسبتاً بہتر ہوتی ہے لیکن بعض جگہ وہ بھی بڑی مصیبت میں ہیں۔ عام طور پر پنجاب اور کجرات کے کسان (جنہیں مالکانہ حقوق حاصل ہیں) زمینداری کی بہت سے قسمیں ہوتی ہیں۔ مثلاً ذیل کار وغیرہ ذیل کار، کاشتا کر شکمی کاشتا کر وغیرہ۔ ان کے مفاد ایک دوسرے سے ٹکراتے ہیں۔ اس لئے یہ لوگ متحد اور متفق ہو کر کوئی کام نہیں کر سکتے۔ لیکن ۱۹۲۰ء میں اودھ میں نہ تو ذیل کاشتا کر تھے اور نہ موروثی صرف معیادی کاشتا کر تھے اور جہاں زمینداروں کو کسی دوسرے شخص نے زیادہ نذرانہ دینے کا وعدہ کیا فوراً انہیں بے دخل کر دیا جاتا تھا۔ چونکہ یہاں ایک ہی قسم کے کاشتا کر تھے اس لئے انہیں منظم کرنا زیادہ آسان تھا۔

عملاً اودھ میں معیادی کاشتا کاروں کو معیاد کے اندر ہی بیدخل کر دینے کی کوئی روک ٹوک نہ تھی۔ عام طور پر زمیندار وصول شدہ زر لگان کی رسید نہیں دیتے تھے۔

اس لئے با آسانی اس سے انکار کر کے آسامی کو بیدخل کر سکتے تھے اور وہ بیچارہ کوئی ثبوت پیش نہ کر سکتا تھا۔ زر لگان کے علاوہ بہت سی ناجائز وصولیاں بھی ہوتی تھیں۔ ایک تعلقہ میں تو مجھے معلوم ہوا کہ کوئی پچاس مختلف ناموں سے کسانوں سے زبردستی روپیہ وصول کیا جاتا ہے۔ ممکن ہے اس تعداد میں مبالغہ سے کام لیا گیا ہو لیکن یہ تو سب جانتے ہیں کہ تعلقہ دار اپنے ہر کام کے لئے اسامیوں سے روپیہ وصول کرتے ہیں تعلقہ دار کے خاندان میں اگر کوئی شادی ہے تو آسامی روپیہ دیں۔ اس کا لڑکا اگر غیر ممالک میں تعلیم پا رہا ہے تو آسامی اس کا بار برداشت کریں۔ گورنر صاحب یا کسی اعلیٰ افسر کو پارٹی دینا ہے تو اس کے اخراجات بھی اسامیوں کے ذمہ۔ تعلقہ دار صاحب موٹر یا ہاتھی خریدنا چاہتے ہیں تو قیمت اسامیوں سے وصول کی جائے۔ ان وصولیائیوں کے خاص نام بھی ہوتے تھے مثلاً موثرانہ (یعنی موٹر کی خریداری کا ٹیکس) ہاتھیانہ (یعنی ہاتھی کی خریداری کا ٹیکس) وغیرہ وغیرہ۔

اس لئے اودھ کے کسانوں میں ہلچل پیدا ہو گئی تو کوئی تعجب نہیں البتہ یہ بات قابل تعجب ضرور تھی کہ شہر والوں کی مدد یا سیاسی کارکنوں کی مداخلت کے بغیر یہ تحریک خود بخود زور پکڑ گئی۔ کسانوں کی اس تحریک کو نہ کانگریس سے کسی قسم کا تعلق تھا نہ ترک موالات سے، جو اسی زمانے میں شروع ہوئی تھی، کوئی واسطہ تھا۔ ہاں یہ کہا جاسکتا ہے کہ شاید ان دونوں عام اور زبردست تحریکوں کی بنیادی وجوہ یکساں تھیں۔ یہ بھی واقعہ ہے کہ کسانوں نے گاندھی جی کی ۱۹۱۹ء کی ہڑتالوں میں پورا حصہ لیا تھا اور اس کے بعد گاندھی جی کا نام ان پر جادو کا سا اثر کرتا تھا۔

مجھے اس بات سے اور زیادہ حیرت ہوئی کہ شہر والے کسانوں کی اس زبردست تحریک سے بالکل ناواقف تھے۔ کسی اخبار میں اس کے متعلق ایک سطر بھی نہ نکلی تھی۔ انہیں دیہات سے کوئی دلچسپی اور تعلق ہی نہ تھا مجھے اس شدت سے کبھی یہ احساس نہ ہوا تھا کہ ہم عوام سے اس قدر دور اپنی چھوٹی سی دنیا میں مگن رہتے ہیں اور ہماری ساری جدوجہد اپنی ذات کے لئے ہوتی ہے۔

دیہات میں گشت

تین دن دیہات میں گزرا کر میں الہ آباد واپس آیا اور کچھ دن کے بعد پھر وہاں گیا۔ ان مختصر دوروں میں ہم گاؤں گاؤں پھرے۔ کسانوں کے ساتھ کھانا کھایا ان ہی کی جھونپڑیوں میں رہے۔ گھنٹوں ان سے باتیں کیں اور اکثر چھوٹے بڑے جلسوں میں تقریریں بھی کیں۔ ہم ایک چھوٹی سی موٹر میں گئے تھے اور کسان ہمارے اتنے مشتاق تھے کہ ہر رات بھر میں انہوں نے کھیتوں میں کچی سڑکیں بنا ڈالیں۔ تاکہ ہماری موٹر آسانی سے ہر جگہ پہنچ سکے۔ اکثر ہماری موٹر دلدل میں پھنس گئی اور بیسیوں آدمیوں نے بڑے خلوص و محبت کے ساتھ آن کی آن میں ہاتھوں ہاتھ اسے اٹھ کر رکھ دیا۔ آخر کار ہم نے موٹر چھوڑ دی اور باقی دورہ پیدل طے کیا۔ جہاں کہیں ہم جاتے تھے معمولی پولیس اور خفیہ پولیس والے اور لکھنوء کے ایک ڈپٹی کلکٹر صاحب سایہ کی طرح ہمارے پیچھے لگے رہتے تھے۔ میرا خیال ہے کہ ہم نے انہیں بہت پریشان کیا کیونکہ ہم سارے سارے دن کھیتوں کھیتوں پھرا کرتے تھے۔ وہ تھک کر پست ہو جاتے تھے۔ اس لئے شاید ہم سے اور کسانوں سے عاجز آ گئے تھے۔ ڈپٹی کلکٹر صاحب لکھنوء کے ایک نوجوان تھے ان میں کچھ زمانہ پن سا پایا جاتا تھا۔ آپ پینٹ لیدر کا پپ پہن کر تشریف لائے تھے۔ بارہا انہوں سے ہم نے التجا کی کہ خدا کے لئے اپنی اس سرگرمی کو ذرا کم کر دیجئے۔ میرا خیال ہے کہ بعد میں وہ ہمارا ساتھ نہ دے سکے اور ہار کر بیٹھ رہے۔

یہ جون کا مہینہ تھا جب ہندوستان میں سے سے زیادہ گرمی پڑتی ہے اور برسات کی آمد آمد ہوتی ہے۔ دھوپ کی شدت سے بدن جھلسا جاتا تھا اور آنکھوں کے نیچے اندھیر آ جاتا تھا۔ میں دھوپ میں نکلنے کا کبھی عادی نہ تھا۔ اور جب انگلستان سے واپس آیا تھا گرمیاں برابر پہاڑ پر گذارتا تھا۔ لیکن اب میں بھری دوپہر اور چلچلاتی دھوپ میں گھومتا تھا اور میرے سر پر ہیٹ بھی نہ ہوتا تھا۔ صرف ایک چھوٹی

سے تولیہ لپیٹ لیتا تھا۔ میں دوسرے کاموں میں ایسا کھویا ہوا تھا کہ گرمی کی اس شدت کا خیال بھی نہ آتا تھا۔ البتہ جب میں الہ آباد واپس آیا اور دیکھا کہ میرا رنگ کس قدر سنا ہوا ہو گیا ہے تو اس کا احساس ہوا کہ مجھ پر کیا دور گزر گیا لیکن یہ خیال کر کے مجھے بڑی خوشی ہوئی کہ میں بھی اپنے ملک کے جفاکش لوگوں کی طرح گرمی کی کلفتیں برداشت کر سکتا ہوں اور اب تک میں اس سے خواہ مخواہ ڈرتا تھا۔ اب مجھے اطمینان ہو گیا، کہ میں سخت سے سخت گرمی اور سردی دونوں آسانی سے جھیل سکتا ہوں اور یہ جفاکشی میرے معمولی مشاغل ہیں اور قید کے زمانے میں بہت کام آئی۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ میرے قوائے بہت اچھے تھے اور میں روزانہ ورزش کیا کرتا تھا۔ ورزش کا سبق میں نے اپنے والد سے سیکھا تھا۔ انہیں ورزشی کھیلوں کا تھوڑا بہت شوق تھا اور عام ورزش تو انہوں نے مرتے دم تک نہیں چھوڑی۔ ان کے سارے بال سفید ہو گئے تھے۔ چہرے کی جھریاں پڑنی تھیں۔ دیکھنے میں بہت بوڑھے اور فکروں کے مارے ہوئے معلوم ہوتے تھے۔ لیکن ان کا جسم ایسا گٹھا ہوا تھا کہ مرنے سے ایک دو سال پہلے تک دیکھنے والے ان کی عمر بیس سال کم ہی جانتے تھے۔

جون ۱۹۲۰ء میں پرتاب گڈھ جانے سے پہلے بھی مجھے اکثر دیہات سے گذرنے کا اور وہاں ٹھہر کر کسانوں سے بات چیت کرنے کا اتفاق ہوا تھا۔ بڑے بڑے میلوں میں گنگا کے کنارے ان کے لاکھوں کے مجمعے دیکھے تھے اور ان میں ہوم رول کی پرچار کی کوشش بھی کی تھی۔ لیکن اب تک مجھے اس کا پوری طرح احساس نہ ہوا تھا کہ وہ کیا ہیں اور ملک میں ان کی کیا اہمیت ہے۔ اوروں کی طرح میں بھی یہی سمجھتا تھا کہ انہیں اچھی طرح جانتا ہوں۔ حقیقت کا انکشاف تو مجھ پر پرتاب گڈھ کے اس دورے میں ہوا۔ اس کے بعد سے جب میں ہندوستان کا تصور کرتا ہوں تو ہمیشہ ان ہی ننگے اور بھوکے لوگوں کی تصویر آنکھوں میں پھر جاتی ہے۔ شاید ان دونوں فضا میں کوئی برقی طاقت کام کر رہی تھی یا شاید میرا ذہن اس وقت اتنا اثر پذیر

تھا کہ جو منظر میں نے دیکھے اور جو تاثرات حاصل مئے وہ ہمیشہ ہمیشہ کے لئے میرے دل و دماغ پر نقش ہو کر رہ گئے۔

ان کسانوں نے میرے حجاب کو دور کر دیا اور مجھے عام مجمعے میں بولنا سکھایا اس سے پہلے میں نے شاید ہی مجمع میں تقریر کی ہو۔ عام جلسوں میں عموماً ہندوستانی میں تقریر کرنی پڑتی تھی اس وجہ سے میں اور بھی گھبراتا تھا۔ لیکن ان کسانوں کے جلسوں میں مجھے پے در پے تقریریں کرنی پڑیں اور ان بھولے بھالے غریبوں کے سامنے شرمانے کی کوئی وجہ بھی نہ تھی۔ میں فن خطابت سے واقف نہ تھا اس لئے میں ان کے سامنے اس طرح تقریر کرتا جیسے کوئی بات چیت کرتا ہے اور جو کچھ میرے دل و دماغ میں ہوتا وہ سیدھے سادے الفاظ میں ان سے کہہ دیتا۔ چاہے جلسے میں تھوڑے سے آدمی ہوتے یا ہزاروں لاکھوں کا مجمع ہوتا۔ لیکن میں اپنا بات چیت کا اندازہ ترک نہ کرتا۔ بہر حال مجھے تجربے سے یہ معلوم ہوا کہ میری تقریر میں خواہ کتنی ہی خامیاں کیوں نہ ہوں میرا کام اچھی طرح چل جاتا تھا۔ میرے بیان میں روانی کی کمی نہ تھی۔ شاید ان میں سے بہت سے لوگ جو کچھ میں کہتا تھا اس کا بہت سا حصہ سمجھ بھی نہ سکتے تھے۔ میری زبان اور میرے خیالات ان کے لئے آسان نہ تھے اور جب مجمع بہت زیادہ ہوتا تھا تو ان میں سے اکثر لوگ میری آواز بھی نہ سن سکتے تھے لیکن انہیں اس کی کچھ زیادہ پرواہ نہ تھی کیونکہ جب یہ لوگ کسی پر اعتماد کر لیتے ہیں تو ان چھوٹی چھٹی باتوں کا خیال نہیں کرتے۔

میں اپنی ماں اور بیوی کے پاس مسوری چلا گیا لیکن میرا دل انہی کسانوں میں پڑا تھا اور میں پھر ان کے پاس پہنچنے کے لئے بے چین تھا۔ وہاں سے واپس آنے کے بعد وہ میں نے دیہات میں گشت شروع کر دیا اور دیکھا کہ کسانوں کی تحریک برابر زور پکڑتی جا رہی ہے۔ ان مظلوموں کو بھاب اپنے اوپر اعتماد پیدا ہو چلا تھا اور یہ سراسر اونچا کر کے چلنے لگے تھے۔ زمیندار کے کارندوں اور پولیس کا خوف اب

ان کے دل سے کم ہوتا جاتا تھا۔ جب کبھی کوئی کسان بے دخل کیا جاتا تھا تو دوسرا کسان اس زمین کو لینے کے لئے آگے نہ بڑھتا تھا۔ زمیندار کے ملازم اب مار پیٹ کرتے بھی ڈرتے تھے اور ناجائز لوٹ بھی کم ہو گئی تھی۔ اگر کبھی اس قسم کے واقعات ہوتے تو فوراً اس کی اطلاع کی جاتی اور تحقیقات شروع ہو جاتی۔ اس وجہ سے پولیس اور زمیندار کی ملازم دونوں اپنی حرکتوں سے باز رہتے۔ تعلقدار بھی ڈرتے تھے اور حملے کی بجائے اب مدافعت کی فکر میں تھے۔ صوبہ کی حکومت نے بھی وعدہ کر لیا تھا کہ وہ اودھ کے قانون لگان میں ترمیم کر دے گی۔

تعلقدار اور بڑے بڑے زمیندار جو خدا کی زمین کے مالک ہونے کا دعویٰ کرتے ہیں اور اپنے آپ کو بڑے فخر سے ”رعیت کا قدرتی لیڈر“ کہتے ہیں، برطانوی حکومت کے لاڈ میں بگاڑے ہوئی بیٹھے ہیں اور حکومت نے ایک خاص قسم کی تعلیم و تربیت دیکر یا معقول تعلیم و تربیت کا انتظام نہ کر کے انیں مجموعی طور پر ذہنی حیثیت سے بالکل نکما کر دیا ہے۔ دوسرے ملکوں میں زمیندار اپن رعایا کے لئے تھوڑا بہت کرتے بھی رہے مگر ان لوگوں نے کچھ بھی نہ کیا۔ اس لئے یہ رفتہ رفتہ زمین کے اور رعایا کی طفیلی بن کر رہ گئے۔ ان کا خاص کام یہ ہے کہ مقامی افسروں کی خوشامد کئے جائیں جن کی نظر عنایت کے بغیر وہ زیادہ عرصے تک زندہ نہیں رہ سکتے اور اپنے حقوق و مراعات کے تحفظ کا برابر مطالبہ کرتے لفظ ”زمیندار“ سے بہت کچھ غلط فہمی پیدا ہونے کا امکان ہے۔ ہر شخص کو یہی خیال ہو گا کہ ہر زمیندار بہت بڑی زمین کا مالک ہوتا ہے لیکن ایسا نہیں ہے جن صوبوں میں رعیت داری کا نظام رائج ہے وہاں ان کسانوں کو زمیندار کہتے ہیں جو اپنی آراضی کے خود مالک ہیں اور ان صوبوں میں جہاں زمیندار کہلاتے ہیں۔ اور لاکھوں وہ لوگ بھی جو انتہائی مفلسی میں بسر کرتے ہیں اور جن کی حالت معمولی کسانوں سے کسی صورت میں بہتر نہیں ہے۔ جہاں تک مجھے یاد ہے صوبہ جات متحدہ میں تقریباً پندرہ لاکھ اشخاص کا شمار زمینداروں کے

مالکوں کی تعداد سارے صوبے میں پانچ ہزار سے زیادہ نہ ہوگی اور ان میں سے زیادہ سے زیادہ پانچ سو ایسے ہوں گے جنہیں واقعی بڑا زمیندار یا تعلقدار کہا جاسکتا ہے۔ بعض مثالیں تو ایسی موجود ہیں کہ بڑے کاشتکاروں کی حالت چھوٹے زمینداروں سے کہیں بہتر ہے۔ یہ چھوٹے اور اوسط درجے کے زمیندار دونوں اگرچہ ذہنی اعتبار سے بہت پست ہیں لیکن بحیثیت مجموعی بڑے اچھے لوگ ہیں اور ان میں اتنی اہلیت موجود ہے کہ اگر انہیں معقول تعلیم و تربیت دی جائے تو یہ بہترین شہری بن سکتے ہیں۔ انہوں نے قومی تحریک میں بھی نمایاں حصہ لیا۔ لیکن چند مشہور افراد کے علاوہ بڑے بڑے زمینداروں اور تعلقداروں نے اس سے کوئی سروکار نہیں رکھا۔ ان لوگوں میں روسا کی شان اور ان کی خوبیاں مطلق نہیں ہیں۔ ان کی ساری جماعت جسمانی اور دماغی ہر اعتبار سے تنزل پذیر ہے۔ گویا وہ اپنی زندگی کے دن پورے کر چکی ہے اور اسی وقت تک زندہ ہے جب تک برطانوی حکومت جیسی کوئی بیرونی طاقت اسے سہارا دینے ہوئے ہے۔

۱۹۲۱ء میں سال بھر میں دیہاتی علاقوں کا دورہ کرتا رہا۔ میرا میدان عمل وسیع ہوتا گیا۔ یہاں تک کہ میری سرگرمیاں سارے صوبہ متحدہ میں پھیل گئیں۔ ترک موالات کی تحریک پورے زور و شور سے شروع ہو چکی تھی اور اس کی آواز گاؤں گاؤں پہنچ گئی تھی۔ ہر ضلع میں کانگریس کے کارکن اس نئے پیغام کو لے کر دیہاتی علاقوں میں نکل کھڑے ہوئے اور انہوں نے اکثر مبہم طریقہ نے اس میں یہ اضافہ کر دیا کہ کسانوں کی شکایتیں بھی رفع ہو جائیں گی۔ سوراج ایسا عام لفظ ہے جو ہر چیز پر حاوی ہے۔ تاہم یہ دونوں تحریکیں (یعنی ترک موالات اور کسانوں کی تحریک) بالکل علیحدہ علیحدہ ہیں۔ اگرچہ ہمارے صوبے میں کبھی کبھی یہ گڈمڈ ہو جاتیں تھیں اور ایک دوسرے پر بہت زیادہ اثر ڈالتی تھیں۔ کانگریس کی تعلیم کا نتیجہ یہ ہوا کہ مقدمہ بازی یکا یک کم ہوئی۔ اور تمام مواضع میں آپس کے جھگڑے طے کرنے کے

لئے پنچائتیں قائم ہو گئیں۔ امن کے معاملے میں کانگریس کا اثر خصوصیت سے بہت زبردست پڑا۔ کیونکہ جہاں کہیں کانگریس کے کارکن جاتے، عدم تشدد کے نئے مسلک پر خاص زور دیتے۔ ممکن ہے لوگوں نے اس کی حقیقت کو پوری طرح نہ سمجھا ہو لیکن اس میں شک نہیں کہ اس تحریک نے کسانوں کو تشدد سے بہت کچھ باز رکھا۔

یہ کوئی معمولی بات نہ تھی۔ کسانوں کی تحریکیں عام طور پر بہت بدنام ہیں کہ ان میں تشدد اور فساد ضرور ہوتا ہے۔ اس زمانے میں اودھ کے بعض اضلاع کے کسان بہت مشتعل تھے اور جان پر کھیلنے کو تیار تھے۔ ایک ذرا سی چنگاری بھی آگ لگانے کو کافی تھی، لیکن وہ اس قدر با امن رہے کہ دیکھ کر حیرت ہوتی تھی۔ تشدد کی صرف ایک مثال مجھے یاد ہے۔ ایک کسان ایک تعلقدار کے پاس پہنچا۔ وہ اپنے مکان پر دوستوں کے ساتھ بیٹھے ہوئے تھے۔ اس نے اس بنا پر ان کے تھپڑ رسید کئے کہ وہ بد چلن تھے اور خود اپنی بیوی کے ساتھ بد سلوکی کرتے تھے۔

اس کے بعد دوسرے قسم کا تشدد بھی شروع ہوا۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ حکومت سے چھڑ گئی۔ لیکن یہ لڑائی تو ہونا ہی تھی۔ کیونکہ حکومت کسانوں کے اتحاد اتفاق اور ان کی بڑھتی ہوئی طاقت کو کب دیکھ سکتی تھی۔ کسانوں نے بلائٹ ریلوں میں سفر کرنا شروع کر دیا۔ خاص کر جب ان کے بڑے بڑے جلسے ہوتے تھے جس میں ساٹھ ہزار آدمی شریک ہوتے تھے یہ بہت بڑی تعداد میں بلائٹ سفر کیا کرتے تھے۔ انہیں ریل سے اتارنا مشکل ہو جاتا تھا۔ جو بات پہلے کبھی نہ سنی گئی تھی وہ اب دیکھنے میں آئی یعنی اب کسان کھلم کھلا ریلوے کے حکام کی خلاف ورزی کرتے تھے اور ان سے کہتے تھے کہ وہ دن گئے جب آپ ہم پر سختیاں کرتے تھے۔ یہ میں نہیں کہہ سکتا کس کے اشارے پر انہوں نے یہ حرکت شروع کی۔ بہر حال ہم نے انہیں یہ ترغیب دی تھی۔ ہمیں تو یکا یک معلوم ہوا کہ وہ بے اعتدالی کر رہے ہیں۔ بعد میں جب ریلوے نے زیادہ سختی کی تو لوگوں نے یہ طریقہ چھوڑ دیا۔

۱۹۲۰ء میں (جب میں کانگریس کے خاص اجلاس کی شرکت کی غرض سے کلکتہ میں تھا) کسانوں کے چند لیڈر کسی معمولی سے الزم پر گرفتار کر لئے گئے۔ ان کے مقدمے کی سماعت شہر پاتاب گڈھ میں ہونے والی تھی۔ چنانچہ پیشی کے دن کسانوں کا جم غفیر کچہری پہنچ گیا۔ کچہری کا سارا احاطہ اور جیل کی سڑک ان سے کھچا کھچ بھر گئی۔ مجسٹریٹ یہ دیکھ کر بدحواس ہو گیا اور مقدمہ دوسرے روز کے لئے ملتوی کر دیا۔ لیکن مجمع برابر بڑھتا گیا۔ حتیٰ کہ اس نے جیل کو بھی گھیر لیا۔ کسان مٹھی بھر چنوں پر آسانی سے کئی کئی دن گزار سکتے ہیں اس لئے وہ ہاں ڈٹے رہے آخر کار جیل ہی میں شاید سرسری سماعت کے بعد ان لیڈروں کو بری کر دیا گیا۔ مجھے یہ یاد نہیں، کہ اس کی صورت کیا ہوئی لیکن کسانوں کے نزدیک یہ ان کی بڑی زبردست فتح تھی ان کے دل میں یہ بات سما گئی کہ وہ ہمیشہ بڑی تعداد کے زور پر جو چاہیں کر سکتے ہیں حکومت یہ صورت کب گوارا کر سکتی تھی۔ چنانچہ بہت جلد اسی طرح کا ایک دوسرا موقع پیدا ہوا اور اب کسانوں کو شکست کھانی پڑی۔

یہ جنوری ۱۹۲۱ء کے آغاز کا واقعہ ہے۔ میں ناگپور کانگریس سے الہ آباد واپس آیا ہی تھا کہ مجھے رائے بریلی سے ایک تار ملا۔ اس تار میں لکھا تھا کہ یہاں فساد کا اندیشہ ہے اس لئے فوراً آؤ۔ میں دوسرے ہی دن روانہ ہو گیا۔ وہاں پہنچ کر مجھے معلوم ہوا کہ کسانوں کے بعض سربراہ اور دہ رہنما چند روز ہوئے گرفتار کر لئے گئے تھے اور مقامی جیل میں بند تھے۔ پرتاب گڈھ میں کسانوں کو جو کامیابی حاصل ہوئی تھی اور وہاں انہوں نے جو گریبیں استعمال کی تھیں۔ انہیں دیکھ کر یہ لوگ بھی زبردست مظاہرہ کرنے کے لئے رائے بریلی شہر کو روانہ ہو گئے۔ لیکن اس مرتبہ حکومت اسے برداشت کرنے والی نہ تھی اس لئے مزید پولیس اور فوج اکٹھا کی گئی تاکہ کسانوں کو راستے ہی میں روک دیا جائے۔ چنانچہ شہر کے باہر ہی ندی کے کنارے پران کی خاص جماعت کا راستہ روک دیا گیا۔ پھر بھی بہت سے لوگ دوسرے راستوں سے

پہنچ گئے۔ مجھے اسٹیشن پر یہ حالات معلوم ہوئے اور میں وہاں سے سیدھانڈی کی طرف روانہ ہوا جہاں فوج اور کسان ایک دوسرے کے مقابلے پر کھڑے تھے۔ راستے میں مجھے ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ کا جلدی میں لکھا ہوا ایک حکم ملا کہ وہاں جانے کی اجازت نہیں ہے اس لئے واپس لوٹ جاؤ۔ میں نے اسی کی پشت پر جواب لکھ دیا کہ کس قانون کی کس دفعہ کی رو سے آپ مجھے واپسی کا حکم دے رہے ہیں۔ اور جب تک ان کا جواب آئے میں نے آگے بڑھنا طے کر لیا۔ جب میں ندی کے کنارے پہنچا تو گولیوں کی آواز دوسری طرف سے آرہی تھی۔ فوج نے مجھے پل پر ہی روک لیا۔ اسی درمیان میں بہت سے خوفزدہ کسان جوندی کی اس طرف کھیتوں میں چھپے ہوئے تھے میرے ارد گرد جمع ہو گئے۔ اس لئے میں نے کوئی دو ہزار کسانوں کو اسی جگہ جلسہ کیا اور ان کے جوش کو کم کرنے اور خوف و ہراس کو دور کرنے کی کوشش کی۔ یہ بہت غیر معمولی منظر تھا۔ کیونکہ ندی کے دوسری طرف ان کی آنکھوں کے سامنے ان کے بھائیوں پر گولیاں برس رہی تھیں اور ہر طرف فوج ہی فوج نظر آتی تھی۔ لیکن جلسہ بہت کامیاب ہوا اور کسانوں کے دل سے خوف جاتا رہا۔ اس کے بعد ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ موقع واردات سے واپس آئے اور ان کی درخواست پر میں ان کے ساتھ ان کے مکان پر گیا۔ یہاں انہوں نے مجھے کسی نہ کسی بہانے سے کوئی دو گھنٹے تک روکے رکھا۔ دراصل وہ یہ نہ چاہتے تھے کہ میں اپنے رفقاء کار اور کسانوں سے فوراً مل سکوں۔

بعد میں ہمیں معلوم ہوا کہ بہت سے لوگ ہلاک ہوئے۔ کسانوں نے منتشر ہونے یا واپس جانے سے قطعی انکار کر دیا۔ لیکن وہ ہر طرح پر امن رہے۔ مجھے کامل یقین ہے کہ اگر میں یا کوئی اور شخص جس پر انہیں اعتماد ہوتا وہاں موجود ہوتا اور ان سے واپس جانے کو کہتا تو وہ ضرور مان جاتے لیکن وہ ان لوگوں کا حکم ماننے کو تیار نہ تھے جن پر انہیں اعتماد نہیں تھا۔ کسی نے ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ کے سامنے یہ تجویز بھی

پیش کی کہ ذرا دیر میرا انتظار کر لیں لیکن انہوں نے انکار کر دیا۔ وہ نہیں چاہتے تھے کہ جہاں وہ ناکام رہے ہیں وہ ایک باغی کامیابی ہو۔ بدیشی حکومتیں جنہیں صرف اپنا رعب قائم کرنے کی فکر ہے یہ چیز کبھی گوارا نہیں کرتیں۔

اسی زمانے میں ضلع رائے بریلی میں کسانوں پر دو مرتبہ گولی چلائی گئی۔ اس کے بعد پنچایت کے ہر رکن اور کسانوں کے ہر مشہور کارکن پر عام تشدد شروع ہو گیا۔ جو اس سے بھی برا تھا۔ حکومت نے تہہہ کر لیا تھا کہ اس تحریک کو کچل ڈالے گی۔ اس زمانے میں کانگریس کی ہدایت کے مطابق کسانوں میں چرخہ کاٹنے کا عام رواج ہو گیا تھا۔ اس لئے چرخہ بغاوت کا نشان قرار پایا۔ بس جس کسی کے پاس چرخہ نکلتا وہ ضرور مصیبت میں پھنستا۔ اکثر چرخہ بھی چھین کر جلا دیا جاتا۔ اس طرح حکومت نے یہ کوشش کی کہ رائے بریلی اور پرتاب گڑھ کی اضلاع میں کانگریس کی تحریک اور کسانوں کی تحریک دونوں کو سینکڑوں گرفتاریوں اور دوسرے ذریعوں سے دبایا جائے۔ عموماً دونوں تحریکوں کے کارکن مشترک تھے۔

کچھ عرصہ بعد ۱۹۲۱ء میں ضلع فیض آباد کو عام تشدد سے پالا پڑا۔ وہاں بالکل عجیب طریقے سے ہنگامہ شروع ہوا۔ بعض مواضع کے کسانوں نے ایک تعلقدار پر حملہ کیا اور اسے لوٹ لیا۔ بعد میں یہ پتہ چلا کہ ایک دوسرے زمیندار کے ملازموں نے جسے اس تعلقدار سے عداوت تھی ان کسانوں کو روغایا تھا۔ ان پچارے بھولے بھالے لوگوں سے واقعی یہ کہا گیا کہ مہاتما گاندھی کی یہ خواہش ہے کہ تم اس تعلقدار کو لوٹ لو۔ چنانچہ انہوں نے خوشی سے اس حکم کی تعمیل کی۔ اس کا ثبوت یہ ہے کہ وہ لوٹ مار کرتے وقت ”مہاتما گاندھی کی ہے“ پکارتے جاتے تھے۔

میں نے جب یہ سنا تو مجھے بہت غصہ آیا۔ یہ ضلع فیض آباد میں اکبر پور کے قریب کا واقعہ تھا۔ چنانچہ اس حادثے کے دو تین دن کے اندر ہی میں وہاں پہنچ گیا اور اسی دن میں نے ایک جلسہ کیا۔ چند گھنٹے کے اندر اندر چاروں طرف کے

مواضعات سے کوئی دس میل کی دوری سے پانچ چھ ہزار آدمی جمع ہو گئے۔ میں نے انہیں بہت کچھ سخت ست کہا۔ وہ خود اپنی اور اپنے مقصد کی ذلت کا باعث ہوئے۔ اس لئے مجرموں کو سب کے سامنے اپنے جرم کا اعتراف کرنا چاہیے۔ (اس زمانے میں، میں گاندھی جی کی سیتا گرہ کے جذبے میں جہاں تک میں اسے سمجھ سکتا تھا ڈوبا ہوا تھا) چنانچہ میں نے مطالبہ کیا کہ جن لوگوں نے لوٹ مار میں حصہ لیا تھا وہ ہاتھ اٹھا دیں۔ سب یہ دیکھ کر دنگ رہ گئے کہ متعدد پولیس افسروں کی موجودگی میں دو درجن ہاتھ اٹھ گئے۔ اس کے معنی یہ تھے کہ ان بیچاروں پر آفت آنا یقینی ہو گیا۔

بعد میں جب میں نے ان سے تنہائی میں گفتگو کی اور ان کی سیدھی سچی کہانی سنی کہ کس طرح انہیں ورغلا یا گیا تو مجھے ان پر بڑا رحم آیا اور اس کا افسوس ہوا کہ میں نے ان بے وقوف اور بھولے بھالے لوگوں کا پردہ فاش کر کے انہیں لمبی سزاؤں کا مستوجب بنا دیا۔ لیکن صرف دو تین ہی درجن شخصوں کو سزا نہیں ملی۔ حکومت کو تو یہ زریں موقع ہاتھ آیا تھا۔ اس لئے ضلع میں کسانوں کے تحریک کو کچلنے کے لئے اس نے اس سے پورا فائدہ اٹھایا۔ یعنی کوئی ایک ہزار آدمی گرفتار ہوئے۔ ڈسٹرکٹ جیل کھچا کھچ بھر گئی اور مقدمے کی پیشیاں قریب قریب سال بھر تک ہوتی رہیں۔ بہترے تو مقدمے کے دوران میں جیل خانے ہی میں مر گئے۔ بہتوں کو لمبی لمبی سزائیں ہوئیں اور اس کے چند سال بعد جب میں جیل گیا تو ان میں سے بعض لڑکوں اور نوجوانوں سے وہاں ملا جو اپنی جوانی کے دل جیل خانے میں کاٹ رہے تھے۔

ہندوستانی کسانوں میں قوت مقابلہ کم ہوتی ہے۔ ان میں اتنی سرگرمی نہیں ہوتی کہ وہ زیادہ عرصے تک ثابت قدم رہ سکیں۔ قحط اور وبائیں آتی ہیں اور لاکھوں کو ٹھکانے لگا دیتی ہیں۔ اس لئے یہ دیکھ کر تعجب ہوتا ہے کہ حکومت اور زمیندار کی متحدہ کوششوں کے باوجود انہوں نے پورے سال مقابلے کی زبردست قوت کا ثبوت

دیا۔ لیکن رفتہ رفتہ ان کی ہمتوں نے جواب دینا شروع کیا اور حکومت کے پھیم حملے نے تحریک کو وقتی طور پر ختم کر دیا۔ لیکن اندر اندر وہ اب بھی باقی تھی۔ اب پہلے کی طرح بڑے بڑے مظاہرے نہیں ہوتے تھے لیکن اکثر دیہاتوں میں پرانے کارکن موجود تھے جو دہشت کا شکار نہیں ہوئے اور کچھ نہ کچھ کرتے رہتے تھے۔ یہ بھی ملحوظ رکھنا چاہیے کہ یہ سب کچھ جیل جانے کی اس تحریک سے پہلے ہوا جو کانگریس نے ۱۹۲۱ء کے آخر میں شروع کی تھی باوجودیکہ کسان پچھلے سال کافی مصیبتیں جھیل چکے تھے تاہم اس تحریک میں بھی انہوں نے کافی حصہ لیا۔

کسانوں کی تحریک سے خائف ہو کر حکومت نے قانون آراضی کی ترمیم میں عجلت سے کام لیا۔ اس سے ذرا امید ہوئی تھی کہ کسانوں کی حالت کچھ سنبھل جائے گی، لیکن جب حکومت نے دیکھا کہ اب تحریک قابو میں آگئی ہے فوراً اس میں کانٹ چھانٹ کر دی۔ البتہ یہ ایک بری تبدیلی ہو گئی کہ اودھ کے کسانوں کو حق موروثی مل گیا۔ بظاہر یہ چیز انہیں بڑی دلکش معلوم ہوئی۔ لیکن بعد میں تجربے سے ثابت ہوا کہ اس سے ان کی مصیبت میں کوئی کمی نہیں ہوئی۔

اس کے بعد بھی اودھ میں کہیں کہیں کسانوں کی شورش اٹھ کھڑی ہوتی تھی لیکن بہت معمولی پیمانے پر۔ مگر ۱۹۲۹ء میں جب ساری دنیا میں عام کساد بازاری کا دور دورہ ہوا تو اجناس کی قیمتوں کے گر جانے کی وجہ سے پھر ایک ہنگامہ شروع ہو گیا۔

ترک موالات

میں نے اودھ کے کسانوں کی ہلچل کا حال ذرا تفصیل سے لکھا ہے کیونکہ اس نے میری آنکھوں کے سامنے سے پردے اٹھائے اور مجھ پر ہندوستانی تحریک کے اس بنیادی پہلو کو روشن کر دیا جس کی طرف قوم پرستوں نے اب تک کوئی توجہ نہ کی تھی۔ کسانوں کے ہنگامے ہندوستان کے مختلف حصوں میں اکثر ہوا کرتے ہیں۔ جس سے ثابت ہوتا ہے کہ ان میں شدید بے چینی موجود ہے۔ ۱۹۲۰ء اور ۱۹۲۱ء میں اودھ کے بعض علاقوں میں کسانوں کی یہ ہلچل بھی اس قسم کی تھی لیکن اس میں بعض حیرت انگیز خصوصیات تھیں جن کی وجہ سے ہم لوگوں کی آنکھیں کھل گئیں۔ ابتداء میں اسے سیاست دانوں سے کوئی سروکار نہیں تھا۔ اور آگے چل کر بھی باہر کے آدمیوں اور سیاست دانوں کو اس میں کچھ زیادہ دخل نہ ہوا۔ ملکی نقطہ نظر سے یہ مقامی معاملہ تھا اس لئے لوگوں نے اس کی طرف بہت کم توجہ کی۔ حتیٰ کے صوبہ متحدہ کے اخباروں نے بھی بڑی حد تک اسے نظر انداز کر دیا کیونکہ ان کے ایڈیٹروں اور شہری ناظرین کی اکثریت کے نزدیک نیم برہمنہ کسانوں کے ہنگامے کو کوئی سیاسی اہمیت حاصل نہ تھی۔

اس وقت پنجاب کے منظام اور خلافت کے معاملات کا ہر طرف چرچا تھا اور ترک موالات کی تحریک ہر شخص کی توجہ کا مرکز بنی ہوئی تھی کیونکہ اسکے ذریعہ سے ان منظام کے تدارک ہر شخص کی توجہ کا مرکز بنی ہوئی تھی۔ قومی آزادی یا سوراج کے اصل مقصد پر اس وقت زیادہ زور دیا جاتا تھا۔ گاندھی جی بلند آہنگ اور مہم مقاصد کو ناپسند کرتے ہیں۔ بجائے اس کے وہ کسی معینہ مقصد کے لئے پورا زور لگانے کو ہمیشہ ترجیح دیتے ہیں۔ پھر بھی سوراج، سیاسی مطلع پر اور لوگوں کے تصورات پر چھایا ہوا تھا۔ اور بے شمار جلسوں اور کانفرنسوں میں اکثر اس کا ذکر کیا جاتا تھا۔

۱۹۲۰ء میں کانگریس کا ایک خاص اجلاس کلکتے میں ان تمام امور پر غور کرنے

خصوصاً ترک موالات کے مسئلے کو طے کرنے کے لیے منعقد ہوا۔ لالہ لاجپت رائے جو ایک عرصے کی جلاوطنی کے بعد حال ہی میں امریکہ سے واپس آئے تھے۔ اس اجلاس کے صدر تھے۔ انہیں ترک موالات کی یہ نو ساختہ تجویز پسند نہ تھی اس لئے وہ اس کے مخالف تھے۔ ہندوستان کی سیاست میں عام طور پر وہ انتہا پسند مانے جاتے تھے لیکن ان کا عام رجحان درحقیقت آئین پرستی اور اعتدال پسندی کی طرف تھا وہ اپنے عقیدے یا پسند کی بنا پر نہیں بلکہ حالات سے مجبور ہو کر بیسویں صدی کے آغاز میں لوگمانیہ تلک اور دوسرے انتہا پسندوں کے دوش بدوش کھڑے ہو گئے تھے۔ انہیں سماجی اور معاشی معاملات سے خاص دلچسپی تھی اور اس خیال کو غیر ممالک کے قیام سے اور تقویت پہنچی تھی۔ یہی وجہ تھی کہ ان کی نظر اکثر ہندوستانی لیڈروں کے مقابلے میں زیادہ وسیع تھی۔

ولفرڈ اسکاون بلٹ نے اپنے ”روزنامے“ میں گوکھلے اور لالہ جی سے اپنی ۱۹۰۹ء کی ایک ملاقات کا تذکرہ کیا ہے۔ اس نے ان دونوں پر سخت نکتہ چینی کی ہے اور لکھا ہے کہ ”یہ لوگ بہت محتاط ہیں اور حقیقت کا اعتراف کرنے سے جھجکتے ہیں“ لیکن یہ واقعہ ہے کہ بہت سے ہندوستانی لیڈروں کے مقابلے میں لالہ جی اس معاملے میں زیادہ جری تھے۔ بہر حال بلٹ کے تاثرات سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ اس وقت ہماری سیاست اور ہمارے لیڈروں کے مزاج میں کتنی سکینیت تھی۔ اور ایک قابل اور تجربہ کار غیر ملک والے پران کا کیا اثر پڑتا تھا۔ لیکن زمانے نے اب اس مزاج کو بہت بدل دیا تھا۔

ترک موالات کی مخالفت میں وہ تہانہ تھے۔ ان کے ساتھ بہت بڑی اور با اثر جماعت تھی۔ دراصل کانگریس کا تمام پرانا قبیلہ گاندھی جی کی ترک موالات کی قرارداد کا مخالف تھا۔ مسٹری، آر۔ داس ان کی رہبری فرما رہے تھے۔ وہ اس قرارداد کی اصل منشا کے مخالف نہیں تھے بلکہ وہ تو اس سے بھی چار قدم آگے بڑھنے کو تیار تھے۔

اصل وجہ یہ تھی کہ انہیں نئی آئین ساز مجلس کے بائیکاٹ پر اعتراض تھا۔

پرانے سربراہ اور وہ لیڈروں میں اس وقت صرف میرے والد گاندھی جی کی حمایت میں تھے۔ ان کے لئے یہ کوئی آسان کام نہ تھا۔ جن اسباب کی بنا پر ان کے رفقا اس قرارداد کی مخالفت کر رہے تھے ان کا والد پر کافی اثر تھا۔ وہ بھی ان لوگوں کی طرح ایک منزل موہوم کی طرف نیا قدم اٹھاتے ہوئے ہچکچاتے تھے۔ کیونکہ اس صورت میں سابقہ حیثیت برقرار نہیں رہ سکتی تھی لیکن نتیجہ خیز عمل کی طرف وہ فطرتاً کھینچے تھے۔ اور یہ تجویز گوان کے خیالات سے پوری طرح مطابقت نہ رکھتی ہو، پھر بھی عملی تجویز تھی۔ اس کے باوجود انہوں نے خوب سوچ بچار کے رائے قائم کی۔ گاندھی جی اور مسٹری۔ آر۔ داس سے ان کی طول طویل بحثیں ہوا کرتی تھیں۔ اس زمانے میں مسٹر داس اور والد دونوں ایک بڑے مقدمے میں فریقین کی جانب سے وکیل تھے اس لئے آپس میں ملنے جلنے کا بہت اتفاق ہوتا تھا۔ وہ دونوں اس مسئلے کو ایک ہی نظر سے دیکھتے تھے اور نتیجہ پر بھی دونوں میں بہت کم اختلاف تھا۔ لیکن اس ذرا سے اختلاف ہی کی بدولت کانگریس کے خاص اجلاس کے موقع پر ایک تو اصل قرارداد کے حامیوں کی صف میں نظر آئے اور دوسرے مخالفوں کی صف میں۔ تین مہینے بعد انہیں ناگپور کانگریس کے موقع پر دوبارہ ملنے کا اتفاق ہوا۔ اب دونوں دوش بدوش کھڑے تھے اور اس کے بعد برابر ایک دوسرے کے قریب تر ہوتے گئے۔

اس زمانے میں کلمتہ کانگریس کے خاص اجلاس سے پہلے مجھے والد سے کھل کر ملنے کا بہت کم اتفاق ہوتا تھا۔ لیکن جب کبھی میں ان سے ملتا تو ہر وقت انہیں اس مسئلے کی فکر میں الجھا ہوا پاتا۔ اس لئے کہ قومی پہلو کے علاوہ اس کا ایک ذاتی پہلو بھی تھا۔ ترک موالات کا مطلب یہ تھا کہ انہیں وکالت بھی ترک کرنا پڑے گی گویا اپنی سابقہ زندگی کو بالکل خیر بد کہنا اور اسے نئے قالب میں ڈھالنا ہوگا۔ اس میں اپنے پرانے سیاسی رفقا کو اپنی وکالت کو، اس سماجی زندگی اور اس امیرانہ معاشرت کو جس

کے وہ عادی ہو چکے تھے غرض بہت سی چیزوں کو توجہ دینا ہوگا۔ لیکن ساٹھ سال کی عمر کو پہنچنے کے بعد کسی شخص کے لئے یہ کوئی آسان کام نہ تھا۔ مالی حیثیت سے بھی یہ معاملہ کچھ کم اہمیت نہ رکھتا تھا کیونکہ ظاہر ہے کہ وکالت کی آمدنی بند ہو جانے پر انہیں اپنے معیار زندگی میں کمی کرنا پڑے گی۔

لیکن ان کی عقل، زبردست خوداری اور فطری تمکنت ان سب کا یہ مقتضا تھا کہ وہ ایک ایک قدم کر کے آگے بڑھتے گئے اور آخر کار دل و جان سے اس نئی تحریک میں شریک ہو گئے۔ پے در پے واقعات کی وجہ سے جن کی انتہا حادثہ پنجاب اور اس کے بعد کے حالات پر ہوئی، ان کا غم و غصہ ضبط کی وجہ سے جن کی انتہا حادثہ پنجاب اور اس کے بعد کے حالات پر ہوئی، ان کا غم و غصہ ضبط کی حد سے گذر چکا تھا۔ انتہائی ظم وہ جور کا احساس، قومی ذلت کا صدمہ ان کے دل و دماغ پر چھایا ہوا تھا اور اظہار کی راہ ڈھونڈ رہا تھا لیکن وہ جوش و خروش کی لڑ میں نہیں بھے بلکہ جب ان کی عقل نے اور وکالت کے تربیت یافتہ دماغ نے تمام اونچ نیچ سوچ لی، تب انہوں نے آخری فیصلہ کیا اور گاندھی جی کے ساتھ ان کی تحریک میں شامل ہو گئے۔

گاندھی جی سے ذاتی طور پر بھی وہ بہت متاثر ہوئے تھے اور اس میں کوئی شک نہیں کہ ان کے فیصلے میں اس تاثر کو بھی دخل تھا۔ جس شخص سے ان کا دل نہ ملتا اس کے ساتھ ہو کر وہ کسی طرح کام نہیں کر سکتے تھے کیونکہ وہ اپنی پسند اور ناپسندیدگی کے معاملے میں بہت سخت تھے۔ بہر حال گاندھی جی اور والد کا ساتھ ایک اجتماع ضد پن تھا۔ ایک طرف تو ایک سنت سادھو۔ ایک دیندار۔ ایک ایسا شخص تھا جس نے اپنی زندگی میں تمام جسمانی لذتوں اور ہیجان پیدا کرنے والی چیزوں کو ٹھکرا دیا تھا۔ اور دوسری طرف ایک دنیا دار تھا۔ جس نے زندگی اور اس کی عیش و عشرت کا جی بھر کے لطف اٹھایا تھا اور اس کی کبھی پرواہ نہ کی تھی کہ اس کا انجام کیا ہوتا ہے۔ تحلیل نفسی کی اصطلاح میں یہ گویا باطن پسند اور ظاہر پسند طبقوں کا میل تھا تاہم دونوں کی

و البستگیاں اور مقاصد اس حد تک مشترک تھے کہ وہ برابر ایک دوسرے سے قریب تر ہوتے گئے۔ حتیٰ کہ چند سال بعد جب ان میں سیاسی اختلاف پیدا ہو گئے اس وقت بھی آپس کی گہری دوستی باقی رہی۔

والٹر پیٹر نے اپنی کتاب میں لکھا ہے کہ ”اگرچہ ایک ولی اللہ اور ایک عیش پسند حکیم مختلف سمتوں سے روانہ ہوتے ہیں۔ مختلف راستے اختیار کرتے ہیں۔ ایک کار حجان مذہب کی طرف ہوتا ہے اور دوسرے کا اس کے خلاف لیکن چونکہ دونوں کی طبیعتیں جوش اور قوت کے لحاظ سے پست فطرت لوگوں سے ممتاز ہوتی ہیں۔ اس لئے وہ ایک دوسری کو اتنی اچھی طرح سمجھ سکتے ہیں جتنا معمولی انسان کو نہیں سمجھ سکتے۔ اور کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ ان کی راہ ایک ہو جاتی ہے۔“

کانگریس کے خاص اجلاس کے بعد کانگریس کی سیاسیات میں گاندی جی کا دور شروع ہو گیا جواب تک چل رہا ہے۔ سو اس چند سال کے وقفے کے جب گاندھی جی خود پیچھے ہٹ گئے تھے اور انہوں نے دلش بندھوسی، آر۔ داس اور میرے والد کی رہبری میں سوراخ پارٹی کو آگے بڑھنے کا موقع دیا تھا۔ بہر حال گاندھی کے دور کے شروع ہوتے ہی کانگریس کا رنگ ہی بدل گیا۔ یورپین لباس کہیں نظر نہ آتا تھا۔ ہر طرف صرف کھاری دکھائی دیتی تھی۔ متوسط طبقے کے نیچے درجے کے لوگ اب کانگریس کے نمائندے منتخب ہونے لگے۔ اور انہیں کانگریس پر چھا گیا۔ اب کانگریس کی کاروائی زیادہ تر ہندوستانی میں ہوتی تھی۔ جس صوبے میں جلسہ ہوتا تھا کبھی کبھی وہاں کی زبان سے بھی کام لیا جاتا تھا کیونکہ اکثر نمائندے انگریزی نہیں جانتے تھے اور یہ جذبہ بڑھتا جا رہا تھا کہ ہمیں اپنے قومی کام میں ایک غیر ملکی زبان استعمال نہیں کرنا چاہیے۔ اس کے علاوہ خاص بات یہ تھی کہ اب کانگریس کے جلسوں میں جان پڑ گئی تھی اور ہر طرف ایک نیا جوش و خروش اور خلوص نظر آتا تھا۔

کانگریس کا اجلاس ختم ہونے کے بعد گاندھی جی امرت بازار پتر کا کہنہ مشق

ایڈیٹر شریٹ موتی لال گھوش کی مزاج پر سی کو گئے۔ وہ اس وقت بستر مرگ پر پڑے ہوئے تھے۔ میں بھی ان کے ہمراہ گیا۔ موتی بابو نے گاندھی جی اور ان کی نئی تحریک کو آشیر باد دی اور فرمایا کہ میں اب دوسری دنیا میں جا رہا ہوں۔ یہ میں نہیں جانتا کہ وہ دوسری دنیا کہاں ہے۔ لیکن اتنا اطمینان ضرور ہے کہ اب میں برطانی راج میں نہ ہوں گا۔ کم از کم اس سلطنت سے تو چھٹکارا مل جائے گا۔

کانگریس سے واپسی پر میں گاندھی جی کے ساتھ رابندر ناتھ ٹیگور اور ان کے بڑے بھائی ”بوڑو دادا“ سے ملنے شانتی نکیتن گیا۔ ہم وہاں چند روز رہے۔ مجھے یاد ہے کہ سی۔ ایف۔ انڈریوز نے مجھے چند کتابیں دی تھیں جنہیں میں نے بڑے شوق سے پڑھا اور ان سے بہت متاثر بھی ہوا۔ ان کتابوں کا موضوع افریقہ میں سامراج کا معاشی پہلو تھا۔ ان میں سے ایک کتاب یعنی موریل کی **Blackmans Burden** کا مجھ پر خاص طور پر اثر ہوا۔

اسی زمانے میں یا اس کے کچھ عرصے بعد سی۔ ایف۔ انڈریوز نے ہندوستان کی آزادی کی حمایت میں ایک رسالہ لکھا۔ شاید اس کا نام ”آزادی اور اس کی فوری ضرورت تھا“۔ یہ ایک نہایت عمدہ مقالہ تھا ہندوستان کے متعلق سیلے کی بعض تصانیف کو پیش نظر رکھ کر لکھا گیا تھا۔ میرا خیال ہے کہ اس میں آزادی کا دعویٰ اس خوبی کے ساتھ ثابت کیا گیا تھا کہ اس کا جواب ہی نہیں ہو سکتا تھا۔ رسالہ کیا گویا ہمارے قلب کی گہرائیوں کا آئینہ تھا۔ انڈریو کی سیدھی سادھی اور پر خلوص عبارت میں ہمیں اپنے دلی جذبات، اپنی نا تمام آرزوؤں کی تصویر نظر آ گئی۔ ان کی یہ تحریر معاشی اصول یا اشتراکیت پر مبنی نہ تھی، بلکہ خالص قوم پرستی کے رنگ میں تھی۔ اول سے آخر تک ہندوستان کی روز افزوں ذلت کا احساس، اس سے نجات پانے کی بیتابانہ خواہش اور حاکم قوم کے فرد تھے کس خوبی سے ہمارے دل کی بات کہہ دی ہے۔ ترک موالات اصل میں وہی چیز تھی جس کے متعلق سیلے نے اب سے بہت د

ن پہلے کہا تھا ”یعنی یہ احساس کہ بدلیسی حکمران قوت کو اس کی حکومت کے قائم رکھنے میں مدد دینا ایک شرمناک فعل ہے“ بقول مسٹر انڈریوز ”خود انسان کی روح کے اندر جو ہیجان برپا ہوتا ہے بس وہی ایک علاج ہے اس لئے ہندوستان کی روح میں وہ اگ لگا دینے والی قوتیں پیدا کرنے کی ضرورت ہے جو یہ ہیجان برپا کر دیں۔ یہ چیز دوسرے کی عنایات و مراعات، عطیات اور اعلانات سے حاصل نہیں ہو سکتی بلکہ یہ تو خود بخود اندر سے پیدا ہونی چاہیے۔ انسان کو ناقابل برداشت بوجھ سے دماغی اور روحانی طور پر چھٹکارا پانے میں جو مسرت ہوتی ہے وہی مسرت مجھے یہ دیکھ کر ہوئی، کہ اندرونی قوت اب واقعی بھڑی اٹھی ہے یعنی مہاتما گاندھی نے ہندوستان کے کان میں یہ منتر پھونک دے ا ہے کہ آزاد ہو جاؤ غلام نہ رہو۔ اور ہندوستان کے دل سے لبیک کی آواز آرہی ہے۔ اس تحریک کے ذریعے سے یکا یک اس کی بیڑیاں ڈھیلی ہو گئی ہیں اور آزادی کا راستہ کھل گئے ہے۔“

آئندہ تین ماہ میں ترک موالات کا بڑھتا ہوا سیلاب سارے ملک میں پھیل گیا۔ نئی کونسلوں کے انتخابات کا بائیکاٹ کرنے کی اپیل اتنی کامیاب رہی کہ دیکھ کر حیرت ہوتی تھی۔ یہ تو نہیں ہو سکا اور نہ ہو سکتا تھا کہ کوئی شخص کونسلوں میں نہ جانے پائے اور نشستیں خالی ریں۔ کسی کو منتخب کرنے کے لئے چند ووٹ بھی کافی تھے یا اگر ایک شخص بھی رائے دینے نہ جاتا تب بھی بلا مقابلے انتخاب ہو سکتا تھا۔ لیکن اس میں کوئی شک نہیں کہ ووٹروں کی اکثریت نے ووٹ دینے سے احتراز کیا اور جن لوگوں کو ملک کے پر زور مطالبے کا ذرا بھی لحاظ تھا وہ ممبری کے لئے نہیں کھڑے ہوئے۔ اتفاق سے سرولٹائن شیردل انتخاب کے روز الہ آباد ہی میں موجود تھے۔ انہوں نے ان مقامات کا چکر لگایا جہاں ووٹ پڑ رہے تھے۔ بائیکاٹ اتنا مکمل تھا کہ وہ دیکھ کر حیرت میں رہ گئے، الہ آباد سے کوئی پندرہ میل کے فاصلے پر ایک پوٹنگ اسٹیشن تھا۔ وہاں انہیں معلوم ہوا کہ ایک ووٹر بھی نہیں آیا۔ ہندوستان سے متعلق اپنی

ایک کتاب میں انہوں نے اپنے ان مشاہدات کا تذکرہ کیا ہے۔

کانگریس کے کلکتے کے اجلاس میں مسٹری۔ آر۔ داس اور ان کے ہم خیال حضرات نے کونسلوں کے بائیکاٹ پر اعتراض کیا تھا لیکن فیصلہ ہو جانے کے بعد وہ کانگریس کے ساتھ رہے۔ جب انتخابات ختم ہو گئے تو یہ اختلاف بھی رفع ہو گیا۔ پھر جب دسمبر ۱۹۲۰ء میں ناگپور میں کانگریس کا سالانہ اجلاس ہوا تو بہت سے بچھڑے ہوئے کانگریس کے رہنما ترک موالات کے مرکز پر دوبارہ آئے۔ تحریک کی غیر معمولی کامیابی اکثر ڈمگانے والوں اور شک کرنے والوں کو خود راہ راست پر لے آئی۔

لیکن کلکتہ کانگریس کے بعد چند پرانے لیڈر کانگریس سے قطعی طور پر علیحدہ ہو گئے۔ ان میں ہر دلعزیز اور مشہور و معروف مسٹر جناح بھی تھے۔ مسز سروجنی نامڈو انہیں ”ہندو مسلم اتحاد کا سنیر“ کہتی تھیں اور واقعی انہیں کہ کوششوں سے مسلم لیگ کانگریس کے قریب آگئی تھی۔ لیکن ایک تو کانگریس کا دو تو اساسی بدل گیا جس کی وجہ سے وہ عوام میں مقبول ہو گئی اور انہیں کہ انجمن بن گئی اور دوسرے حکومت سے ترک موالات کرنا۔ یہ چیزیں مسٹر جنا کو پسند نہ آئیں۔ اگرچہ وہ سیاسی وجوہ کی بنا پر ان کی مخالفت کر رہے تھے لیکن سیاست کے علاوہ بعض باتیں اور بھی تھیں جن کی وجہ سے وہ کانگریس سے علیحدہ ہو گئے۔ کانگریس میں اب بھی ایسے لوگ موجود تھے جو سیاسی عقائد کے اعتبار سے ان سے بہت پیچھے تھے۔ لیکن ان کا مزاج اور فطرت کچھ ایسی تھی کہ وہ اس نئی کانگریس کے ساتھ نہ بٹھ سکتے تھے۔ وہ کھدر پوش لوگوں میں جو ہندوستانی میں تقریر کرنے پر اصرار کرتے تھے اپنے آپ کو کچھ اجنبی سامحسوس کرتے تھے۔ کانگریس کے باہر عوام کو جوش و خروش انہیں دیوانہ پن معلوم ہوتا تھا۔ ان میں اور عوام میں اتنا ہی فرق تھا جتنا لندن کے کسی بہتر علاقہ (مثلاً سیولے رو اور بانڈ اسٹریٹ) اور ہندوستان کے کسی گاؤں میں ہو۔ ایک مرتبہ نجی طور پر انہوں نے یہ

تجويز کی تھی کہ صرف میٹرک پاس لوگوں کو کانگریس میں داخل کیا جائے۔ بہت ممکن ہے کہ سچ مچ ان کا یہ منشا نہ ہو لیکن یہ چیز ان کے عام انداز کے بالکل مطابق تھی۔ غرض وہ کانگریس سے علیحدہ وہ گئے اور ہندوستانی سیاست میں بے یار و مددگار ہو کر ہر گئے افسوس ہے کہ آگے چل کر ”اتحاد کا یہ پرانا پیامبر“ مسلم فرقہ پرستوں کے انتہائی رجعت پسند طبقے سے میل جول رکھنے لگا۔

اعتدال پسند یا لبرل فریق کو کانگریس سے کوئی واسطہ نہیں رہا۔ یہ لوگ صرف کانگریس سے علیحدہ ہی نہیں رہے بلکہ حکومت سے شیرو شکر ہو گئے۔ نئی اصلاحات کے ماتحت انہوں نے وزارتیں اور بڑے بڑے عہدے قبول کر لئے اور ترک موالات اور کانگریس کا مقابلہ کرنے میں حکومت کو پوری مدد دی۔ ان کی تمنا تو پوری ہو چکی تھی، یعنی چند اصلاحات مل گئی تھیں پھر انہیں جدوجہد کرنے کی کیا ضرورت تھی؟ سارا ملک جوش و خروش سے کھول رہا تھا اور روز بروز انقلاب پسند ہوتا جاتا تھا۔ لیکن یہ لوگ کھلم کھلا انقلاب کے مخالف اور حکومت کے جزو بنتے جاتے تھے۔ حتیٰ کہ عوام سے انہیں کوئی لگاؤ نہ رہا اور ان میں یہ عادت پیدا ہو گئی (جو اب تک باقی ہے) کہ وہ ہر مسئلے کو سرکاری نقطہ نگاہ سے دیکھنے لگے۔ اب ان پر جماعت کا اطلاق نہیں ہو سکتا تھا بلکہ معدودے چند افراد تھے جو چند بڑے بڑے شہروں میں کہیں کہیں نظر آتے تھے۔ مسٹر سری نواس شاستری نے برطانوی حکومت کی طرف سے شاہی سفیر بن کر امریکہ اور برطانیہ کی مختلف نوآبادیوں کا دورہ کیا اور ہر جگہ کانگریس اور اپنے ہم وطنوں کو حکومت سے لڑنے پر بہت برا بھلا کہا۔

ان تمام ”کامیابیوں“ کے باوجود لبرل کچھ خوش نہ تھے۔ اپنے بھائیوں سے الگ تھلگ رہنے میں انسان کو کوئی مسرت نہیں ہوتی اور یہ احساس کہ دنیا میری مخالف ہے، چاہے اس مخالف کو وہ دیکھ یا سن سکے ہر شخص کے لئے سوہان روح ہو جاتا ہے۔ عوام کی تحریک میں اپنے مخالفوں کے ساتھ کوئی رعایت نہیں کہ جاتی۔

لیکن ترک موالات کی تحریک میں گاندھی جی کی پیہم تنبیہ اور تائید کی وجہ سے مخالفوں کے ساتھ عوام کا رویہ نسبتاً بہت نرم اور شریفانہ تھا۔ لیکن اس کو کیا کیا جائے کہ اس وقت کے عام فضا سے اگر حامیوں کے دل گرماتے تھے تو مخالف خود بخود سہمے جا رہے تھے۔ عام ہیجان اور انقلابی تحریکوں کا یہی دو طرفہ اثر ہوتا ہے۔ ایک طرف تو ان سے عوام اور ان کے حامیوں کے حوصلے بڑھتے ہیں اور ان کے شخصیتیں ابھرتی ہیں اور دوسری طرف مخالفوں کا خود بخود دم گھٹنے لگتا ہے اور وہ قدرتی طور پر دب جاتے ہیں۔

اسی وجہ سے بعض لوگوں کا یہ خیال تھا کہ ترک موالات کی تحریک میں رواداری کا مادہ نہیں ہے اور یہ ملک میں رائے اور عمل کی ایک بے جان یکسانی پیدا کرنی چاہتی ہے۔ یہ اعتراض صحیح تھا لیکن اس کی وجہ یہ تھی کہ ترک موالات عوام کی تحریک تھی اور ایک عظیم الشان ہستی اس کی رہبری کر رہی تھی جس پر ہندوستان کے لاکھوں افراد کو انداحادہ عقائد تھا۔ اس سے زیادہ اہم وجہ یہ تھی کہ عوام پر اس تحریک کا غیر معمولی اثر تھا۔ لوگوں کو یہ محسوس ہو رہا تھا کہ ان کی بیڑیاں کٹ گئی ہیں۔ ا کے سر سے ایک بڑا بوجھ اتر گیا ہے اور ان کی رگوں میں آزادی کا خون دوڑنے لگا ہے۔ وہ خوف جو انہیں کچلے ڈالتا تھا کافور ہو گیا اور وہ بھی اب سینہ نکال کر اور گردن اٹھا کر چلنے لگے۔ دیہات کے بازاروں میں بھی عام لوگوں کی زبان پر کانگریس، سوراج (کیونکہ ناگپور کانگریس نے یہ طے کر دیا تھا کہ سوراج ہماری منزل مقصود ہے) پنجاب کے مظالم اور خلافت کے چرچے رہتے تھے۔ لیکن دیہات میں لفظ ”خلافت“ کے بہت ہی عجیب معنی سمجھے جاتے تھے۔ لوگوں کا خیال تھا کہ یہ لفظ ”خلاف“ سے بنا ہے جس کے معنی مخالفت کے ہیں گویا خلافت سے مطلب ہے ”حکومت کی مخالفت“ یہ لوگ اپنی معاشی مشکلات پر بھی خاص طور سے گفتگو کرتے تھے۔ غرضیکہ بیشمار جلسوں اور کانفرنسون نے ان کے سیاسی معلومات میں بہت کچھ

اضافہ کر دیا تھا۔

۱۹۲۱ء میں ہم میں سے اکثر لوگ جو کانگریس کا کام کیا کرتے تھے ایک طرح کے نشے میں چور رہتے تھے۔ اس وقت ہم جوش۔ ہمت اور زندہ دلی میں سرشار تھے۔ ہمیں وہ مسرت محسوس ہوتی تھی جو کسی شخص کو اپنے مذہب پر قربان ہونے میں ہوتی ہے۔ شک یا پس و پیش ہمارے پاس نہ پھلکتا تھا۔ ہمیں اپنا راستہ بالکل صاف نظر آ رہا تھا اور ہم بڑھتے چلے جاتے تھے۔ دوسروں کا جوش ہمیں آگے بڑھاتا تھا اور ہم دوسروں کو آگے بڑھاتے تھے اس زمانے میں ہم نے اتنی سخت محنت کی کہ شاید اس سے پہلے کبھی نہیں کی تھی۔ ہمیں معلوم تھا کہ حکومت سے جنگ کا زمانہ نزدیک آ رہا ہے اس لئے ہم یہ چاہتے تھے کہ اپنی گرفتاری سے پہلے جو کچھ ہو سکے وہ کر ڈالیں۔

اس کے علاوہ ہم میں آزادی کا احساس پیدا ہو گیا تھا اور اس آزادی پر ہمیں ناز تھا۔ اب وہ مایوسی اور سہم کی کیفیت بھی باقی نہیں رہی۔ اب نہ تو وہ سرگوشیاں تھیں اور نہ وہ پہلو بچا بچا کر قانونی الفاظ میں گفتگو کرنا۔ جو ہمارے دل میں ہوتا تھا ڈنکے کی چوٹ کہتے تھے۔ کیونکہ ہمیں ڈر کا ہے کا تھا؟ یہی نہ کہ جیل بھیج دئے جائیں گے۔ تو اس کے لئے ہم خود ہر وقت تیار رہتے تھے۔ اس سے تو ہمارے مقصد کو تقویت پہنچتی تھی۔ ہمارے پیچھے خفیہ پولیس کے سینکڑوں آدمی لگے رہتے تھے۔ ان بیچاروں کی حالت قابل رحم ہو گئی کیونکہ ہماری کوئی بات راز دہی نہ تھی جسے وہ معلوم کرتے۔ ہم جو کچھ کرتے تھے وہ ہمیشہ کھلم کھلا کرتے تھے۔

ہمیں اس نتیجہ خیز کام سے بڑا اطمینان حاصل ہوتا تھا کیونکہ ہم اپنی آنکھوں سے دیکھ رہے تھے کہ ہندوستان کی کایا پلٹ گئی ہے اور آزادی کے دن بہت قریب آ گئے ہیں۔ یہی نہیں بلکہ یہ خوش گوار احساس بھی تھا کہ ہم اپنے مقصد اور طریق کار دونوں کے لحاظ سے اپنے حریفوں سے اخلاقی حیثیت سے برتر ہیں۔ ہمیں اپنے

رہنما اور ان کے طریق کار پر ناز تھا اور کبھی کبھی ہم اپنے آپ کو بھی مہاتما سمجھنے لگتے تھے۔ عین طوفان میں بلکہ خود ہی طوفان اٹھاتے ہوئے ہمیں پورا سکون اور اطمینان قلب حاصل تھا۔

ادھر ہمارا ضبط اور اعتماد نفس بڑھتا جاتا تھا اور ادھر حکومت کی صفوں میں ابتری پھیل رہی تھی۔ اس کی سمجھ میں نہ آتا تھا کہ یہ ہو کیا رہا ہے۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ ہندوستان کی وہ پرانی دنیا جو وہ دیکھتی چلی آتی تھی بدل رہی ہے اس لئے اس میں تشدد کا ایک نیا جذبہ پیدا ہو گیا تھا اور اس کی خود اعتمادی، بے خوفی اور رعب (جس پر یہاں برطانوی حکومت قائم ہے) دیکھتے ہی دیکھتے غائب ہو رہا تھا۔ تھوڑے بہت تشدد سے تحریک کو اور تقویت پہنچتی تھی۔ چنانچہ حکومت نے بہت عرصہ تک پس و پیش کرنے کے بعد بڑے بڑے لیڈروں پر ہاتھ ڈالا کیونکہ وہ ڈرتی تھی کہ خدا جانے اس کا نتیجہ کیا ہو۔ ہندوستانی فوج قابل اعتماد ہے یا نہیں؟ پولیس احکام کی تعمیل کرے گی یا نہیں؟ اس کش مکش میں وہ مبتلا تھی۔ خود لارڈ ریڈنگ وائسرائے ہند نے دسمبر ۲۱ء میں کہا تھا کہ حکومت ”عجب شش و پنج میں“ ہے۔

۲۱ء کی گرمیوں میں صوبجات متحدہ کی حکومت نے ضلع کے افسروں کو ایک بہت دلچسپ گشتی چھٹی بھیجی۔ یہ چھٹی بعد میں اخباروں میں بھی شائع ہوئی۔ اس میں بڑے افسوس کے ساتھ یہ خیال ظاہر کیا گیا تھا کہ پیش قدمی دشمن (یعنی کانگریس) ہی کی طرف سے ہوتی ہے اور وہ بڑی بری بات ہے۔ اس کے بعد پیش قدمی کی مختلف صورتیں تجویز کی گئیں۔ جس میں ایک تجویز یہ بھی تھی کہ ”امن سبائیں“ قائم کی جائیں۔ ان سبھاؤں کی مہمل اور مضحک حیثیت سب پر ظاہر ہے۔ خیال یہ ہے کہ ترک موالات کا مقابلہ کرنے کا یہ خاص طریقہ ہمارے لبرل وزرا کی تجویز پر اختیار کیا گیا تھا۔

اس زمانے میں اکثر انگریز افسروں کے اوسان خطا ہو گئے تھے۔ ان کے دل و

دماغ پر بڑا زور پڑ رہا تھا۔ ملک میں مخالفت اور حکم عدولی کا جذبہ برابر بڑھ رہا تھا۔ جو سرکاری طبقوں پر ڈراؤنی اور کالی کالی کھٹاؤں کی طرح چھا گیا تھا اور چونکہ اس میں تشدد کا شائبہ بھی نہ تھا اس لئے افسروں کو جبر و تشدد کا کوئی ذریعہ اور کوئی بہانہ نہ ملتا تھا۔ انگریز عام طور پر اس کے قائل نہ تھے کہ ہندوستانی سچ مچ عدم تشدد کے حامی ہیں۔ وہ سمجھتے تھے کہ یہ سب دھوکا اور فریب ہے۔ کسی پوشیدہ سازش کو چھپانے کے لئے ایک پردہ ہے جو کسی دن یکا یک ہٹ جائے گا اور ہندوستان میں زبردست غدر مچ جائے گا۔ بچپن ہی سے ان کے خیر میں یہ عقیدہ داخل ہے کہ مشرق ایک پراسرار جگہ ہے اور اس کے بازاروں اور تنگ و تاریک گلیوں میں ہمیشہ سازشیں ہوا کرتی ہیں۔ اس لئے اس طلسماتی سرزمین میں انگریز کسی معاملے کو بھید سے خالی سمجھ ہی نہ سکتے تھے۔ داصل وہ کبھی یہ کوشش ہی نہیں کرتے کہ مشرق کے سیدھے سچے انسانوں کو سمجھیں۔ وہ ان سے الگ تھلگ رہتا ہے۔ جاسوسوں اور خفیہ گروہوں کے قصے کہانیوں کو پڑھ کر ان کے متعلق رائے قائم کرتا ہے اور پھر وحشت کے مارے پریشان ہو جاتا ہے۔ یہی حال اپریل ۱۹۱۹ء میں پنجاب میں ہوا۔ یکا یک افسروں پر خصوصاً اور تمام انگریزوں پر عموماً ایک خوف طاری ہو گیا۔ انہیں ہر طرف خطرہ ہی خطرہ نظر آنے لگا اور انہوں نے خواہ مخواہ یہ سمجھ لے ا کہ زبردست بلوہ یا دوسرا عذر ہونے والا ہے جس میں انگریزوں کا قتل عام ہو گیا۔ چنانچہ اپنے آپ کو کسی نہ کسی طرح بچا لینے کے فطری مگر اندھا دھند جوش میں انہوں نے وہ خوفناک حرکتیں کیں جو امرتسر کے ”جلیانوالہ باغ“ اور کراٹک لین“ کے نام سے ضرب المثل بن گئی ہیں۔

۱۹۲۱ء کا پورا سال بڑی پریشانی کا زمانہ تھا اور اس میں سرکاری ملازموں کو دق اور بدحواس کرنے کا کافی سامان موجود تھا۔ اصلی مشکلیں بھی کچھ کم نہ تھیں مگر خیالی مشکلیں ان سے کہیں زیادہ تھیں۔ یہاں میں ایک مثال پیش کرتا ہوں جس سے اس

۱۰ مئی ۱۹۲۱ء کو الہ آباد میں ہونے والی تھی۔ یہ تاریخ حسب رواج سمت کی شبھ لگن دیکھ کر اس کے مطابق مقرر کی گئی تھی۔ گاندھی جی اور بہت سے مقتدر کانگریسی لیڈر جن میں علی برادران بھی شامل تھے۔ اس شادی میں مدعو تھے اور ان کی سہولت کے خیال سے اسی زمانے میں الہ آباد میں کانگریس ورکنگ کمیٹی کا ایک جلسہ بھی مقرر کر دیا تھا۔ مقامی کانگریس کارکن اپنے مشہور و معروف لیڈروں کی موجودگی سے فائدہ اٹھانا چاہتے تھے۔ اس لئے انہوں نے بڑے پیمانے پر ضلع کی ایک کانفرنس کا انتظام کیا اور امید تھی کہ کانفرنس میں قرب و جوار کے کسان بھی کافی تعداد میں شریک ہوں گے۔

ان سیاسی جلسوں کی وجہ سے الہ آباد میں بری چہل پہل اور جوش و خروش تھا۔ اس سے بعض لوگوں کے اوسان خطا ہو گئے۔ ایک دن مجھے اپنے ایک بیرسٹر دوست سے معلوم ہوا کہ بہت سے انگریز تو بالکل بدحواس ہو گئے تھے۔ انہیں اندیشہ تھا کہ شہر میں کسی وقت یکا یک بغاوت ہو جائے گی اسلئے انہیں ہندوستانی ملازموں کے اعتبار جاتا رہا تھا اور ہر وقت اپنی جیبوں میں بھرے ہوئے پستول لئے پھرتے تھے۔ نجی طور پر یہ بھی معلوم ہوا کہ الہ آباد کے قلعے میں ہر طرح کا انتظام کر دیا گیا تھا تاکہ اگر ضرورت پڑے تو انگریزوں کی ساری آبادی وہاں منتقل ہو جائے۔ مجھے سخت حیرت تھی اور سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ الہ آباد جیسے اونگھتے سوتے اور پر امن شہر میں اس قسم کی بغاوت ہونے کا کسی کو خیال ہی کیونکر پیدا ہوا۔ خصوصاً اس حالت میں جبکہ امن کا سب سے بڑا علم بردار وہاں آنے والا تھا۔ معلوم ہوا کہ ۱۰ مئی کی تاریخ (جو اتفاقاً میری بہن کی شادی کے لئے مقرر کی گئی تھی) میرٹھ میں ۱۹۵۷ء کا غدر شروع ہونے کی تاریخ اور انگریزوں کا خیال تھا کہ الہ آباد میں اس کی یادگار منائی جائے گی۔

۱۹۲۱ء میں تحریک خلافت کو بہت اہمیت حاصل ہو گئی تھی اس لئے بہت سے

مولوی اور مسلمانوں کے مذہبی پیشوا بھی سیاسی جنگ میں نمایاں حصہ لینے لگے تھے۔ ان کی وجہ سے تحریک میں ایک خاص مذہبی رنگ پیدا ہو گیا تھا اور مسلمان عام طور پر اس مذہبی سیاست سے بہت متاثر تھے۔ بہت سے مغرب زدہ مسلمانوں نے جنہیں اب تک مذہب سے کوئی حس نہ تھا داڑھیاں رکھ لی تھیں اور احکام شرع کی سختی سے پابندی کرنے لگے تھے۔ مولویوں کا اثر اور اقتدار جدید خیالات اور مغربی تہذیب کی ترقی کی وجہ سے رفتہ رفتہ گھٹ رہا تھا۔ لیکن اس تحریک کے زمانے میں وہ پھر بڑھنا شروع ہو گیا اور مولوی مسلم قوم پر پھر حاوی ہو گئے۔ علی برادران خود مذہبی ذہنیت کے آدمی تھے اس لئے ان کی ذات سے بھی سے فروغ ہوا۔ اور گاندھیجہ ک ابھی اس میں کافی ہاتھ تھا کیونکہ وہ بھی مولویوں اور عالموں کی انتہائی عزت کرتے تھے۔

دراصل گاندھی جی تحریک کے مذہبی اور روحانی پہلو پر ابر زور دیتے رہتے تھے۔ ان کے نزدیک مذہب کسی افغانی عقیدے کا نام نہیں تھا مگر وہ ایک خاص مذہبی تصور حیات کے قائل تھے جس کا تمام تحریک پر زبردست اثر پڑا اور عوام کے لئے یہ احیائے مذہب کی تحریک بن گئی۔ اکثر کانگریسی کارکن فطرتاً اپنے رہنما کے قدم بہ قدم چلنے کی کوشش کرتے تھے اور انہیں ان کے الفاظ بھی دہراتے تھے۔ لیکن ورکنگ کمیٹی میں گاندھی جی کے خاص خاص رفیق کار مثلاً میرے والد۔ دیش بندھو داس۔ لالہ لچپت رائے وغیرہ مذہبی لوگ نہ تھے اور وہ سیاسی مسئلہ کو صرف سیاسی نظر سے دیکھتے تھے لیکن ان کے اقوال کے مقابلے میں ان کی افعال کا اثر زیادہ پڑتا تھا۔ لوگ دیکھتے تھے کہ انہوں نے ان تمام چیزوں کو جن کی دنیا تمنا کرتی ہے تج دیا ہے اور نہایت سادہ زندگی اختیار کی ہے۔ لوگوں کے نزدیک یہ ان کی مذہبیت کی دلیل تھی اور اس سے احیائے مذہب کا یہ رنگ اور پکا ہوا۔

بعض اوقات میں پریشان ہو جاتا تھا کہ سیاست میں مذہب کو اتنا دخل کیوں ہے؟ مجھے یہ بات بالکل پسند نہ تھی۔ مولوی۔ مولانا و رسوامی جو کچھ اپنی تقریروں میں

کہتے تھے اسے سن کر مجھے سخت صدمہ ہوتا تھا۔ مجھے ان کی تاریخ، عمرانیات اور اقتصادیات سب غلط معلوم ہوتی تھی۔ اور ہر چیز کو مذہبی رنگ دے دینے سے روشن خیالی کا خاتمہ ہو گیا تھا۔ گاندھی جی کے بعض جملے بھی مجھے گراں گزرتے تھے۔ مثلاً وہ اس زریں زمانے کو جو پھر لوٹ آنے والا تھا اکثر ”رام راج“ کے نام سے تعبیر کیا کرتے تھے۔ لیکن میں بے بس تھا اور یہ کہہ کر اپنے دل کو سمجھا لیتا تھا کہ گاندھی جی یہ الفاظ صرف اس لئے استعمال کرتے ہیں کہ یہ لوگ انہیں جانتے ہیں اور سمجھ سکتے ہیں درحقیقت انہیں لوگوں کے دل کی تہ تک پہنچنے کا عجیب ملکہ حاصل تھا۔

لیکن میں نے ان چیزوں کی زیادہ پرواہ نہیں کی۔ مجھے خود اتنی مصروفیت تھی اور تحریک اس زور شور سے بڑھ رہی تھی کہ ان چھوٹی چھوٹی باتوں پر دھیان دینے کا وقت ہی نہ تھا۔

ایک عام تحریک میں ہر قسم کے لوگ موجود ہوتے ہیں اس لئے جب تک ہم صحیح راستے سے نہ بھٹکیں چند رجعت پسندوں کی موجودگی سے کیا ہرج تھا۔ رہے گاندھی جو تو ان کا سمجھنا تھا۔ کبھی کبھی ان کی گفتگو اس قسم کی ہوتی تھی کہ عام طور پر جدید خیالات کے لوگوں کی سمجھ میں نہیں آتی تھی لیکن یہ ہمیں یقین تھا کہ وہ بہت بڑے اور بے مثل انسان اور عظیم الشان رہنما ہیں اس لئے ہم ان پر ایمان لے آئے اور انہیں سیاہ و سفید کا مالک بنا دیا۔ اکثر ہم آپس میں ان کی انوکھی باتوں اور عجیب و غریب خیالات پر تبصرہ کیا کرتے تھے اور ہنسی میں کہتے تھے کہ سوراج کے بعد اس قسم کی حرکتوں کی ہمت افزائی نہ ہونا چاہیے۔

لیکن ہم میں سے بعض لوگ سیاسی معاملات اور دوسری چیزوں میں ان سے اس قدر متاثر تھے کہ مذہب کے معاملے میں ان کے اثر سے آزار نہیں رہ سکتے تھے۔ جہاں براہ راست ہلے سے کام نہیں نکلتا وہاں اکثر پھیر کھا کر ادھر ادھر سے بڑھنے میں قلعہ کی تسخیر میں کامیابی ہوتی ہے۔ یہی صورت میرے ساتھ ہوئی۔ مذہب کی

ظاہری رسوم کا مجھ پر کوئی اثر نہ تھا۔ اس کے علاوہ نام نہاد مذہبی پیشوا مذہب کے نام پر لوگوں کو جو لوٹتے تھے اس سے مجھے سخت نفرت تھی۔ تاہم میری مخالفت کچھ نرم پڑ گئی۔ بچپن سے اب تک کبھی مجھ پر اتنا مذہبی رنگ نہ چڑھا تھا جتنا ۱۹۲۱ء میں چڑھا۔ اس پر بھی میں مذہب سے زیادہ قریب نہ ہوسکا۔

مجھے اپنی تحریک اور ستیاگرہ کا اخلاقی پہلو بہت پسند تھا۔ عام تشدد کے اصول پر نہ کبھی میں پورا ایمان لایا اور نہ مستقل طور پر اسے تسلیم کیا لیکن میں اس کی طرف روز بروز کھنچا جاتا تھا اور یہ خیال قائم ہوتا جاتا تھا کہ اس وقت ہندوستان میں ہماری حالت زار اور ہمارے عقائد و روایات کے لحاظ سے یہ بہترین حکمت عملی ہے۔ سیاست کو روحانیت میں سمو دینے کو (یہ اصلاح مذہب کے تنگ مفہوم میں استعمال کی گئی ہے) میں اچھی نظر سے دیکھتا تھا۔ اچھے مقصد کو اچھے ذرائع زیب دیتے ہیں۔ یہ نہ صرف اخلاقی حیثیت سے ایک اچھا اصول تھا بلکہ معقول اور عملی اعتبار سے صحیح بھی تھا۔ کیونکہ برے اور غلط ذرائع مقصد کو الٹا نقصان پہنچاتے اور نئی نئی پیچیدگیاں اور مشکلات کھڑی کر دیتے ہیں۔ اس کے علاوہ یہ نہایت ہی نازیبا اور افراد یا قوم کی خوداری سے فروتر معلوم ہوتا ہے کہ وہ سب ذرائع استعمال کرے اور کیچڑ میں سے ہو کر منزل مقصود تک پہنچنے کی کوشش کرے۔ ظاہر ہے کہ اس صورت میں وہ آلودگی سے کیونکر دامن بچا سکتا ہے؟ اگر ہم جھک جائیں یا ریگنے لگیں تو پھر ہم سر اٹھا کر تیز تیز کیسے چل سکتے ہیں۔

یہ تھے اس وقت میرے خیالات۔ ترک موالات کی تحریک سے میری دلی مراد برآئی تھی۔ یعنی میں قومی آزادی کا خواہاں تھا اور میرا خیال تھا کہ اس تحریک کے ذریعہ سے غریبوں کو لوٹنا بند ہو جائے گا۔ اس میں جو ذرائع استعمال کئے جاتے تھے ان سے میرے اخلاقی جذبے کو تسکین ہوتی تھی اور مجھ میں شخصی آزادی کا احساس پیدا ہوتا تھا۔ یہ سکون و اطمینان اتنا زبردست تھا کہ مجھے ناکامی کی بھی کوئی پروا نہ تھی۔

کیونکہ مجھے یقین تھا کہ یہ ناکامیاں محض عارضی ہوں گی۔ بھگوت گیتا کے مابعد
الطبعی مضامین کو نہ تو میں سمجھتا تھا اور نہ اس طرف کچھ رغبت ہی تھی۔ البتہ میں ان
اشلوکوں کو اکثر پڑھا کرتا تھا جو گاندھی جی کے آشرم میں پرارتھنا کے وقت پڑھے
جاتے تھے۔ ان کا مفہوم یہ تھا کہ انسان کو اپنے مقصد میں نہایت پرسکون، مطمئن اور
مستقل ہونا چاہیے۔ اپنا فرض ادا کرنا چاہیے اور نتیجے کے پیچھے سرگرداں نہ پھرنا
چاہیے۔ چونکہ میں خود بہت پرسکون نہ تھا شاید اسی لئے اس نصیحت کا مجھ پر بہت اثر
ہوتا تھا۔



۱۹۲۱ء اور میری پہلی جیل یا تراس

۱۹۲۱ء ہم لوگوں کے لئے غیر معمولی سال تھا۔ اس زمانے میں قوم پرستی، سیاسیات، مذہب، پاٹینٹ اور جنون کا ایک عجیب معجون مرکب بن گیا۔ ادھر کسانوں کی تحریک چل رہی تھی اور بڑے شہروں میں مزدوروں کی تحریک بھی زور پکڑ رہی تھی۔ قوم پرستی اور ایک مبہم مگر گہری تصور پرستی، بے چینی کے ان سب عناصر کو جن میں سے بعض ایک دوسرے کے مخالف تھے، متحد کرنا چاہتی تھی اور اسے اس میں حیرت انگیز کامیابی ہوئی۔ یہ قوم پرستی خود بھی ایک مرکب قوت تھی۔ اس میں تین اجزاء الگ الگ نظر آتے تھے، یعنی ہندو قوم پرستی، مسلم قوم پرستی (جسکی دلچسپی ایک حد تک ہندوستان سے باہر اسلامی ممالک سے وابستہ تھی) اور ہندوستانی قوم پرستی جو متفصلاً وقت سے زیادہ مطابقت رکھتی تھی۔ عارض طور پر یہ تین قوتیں مل جل گئیں تھیں اور ساتھ ساتھ کام کر رہی تھیں۔ ہر جگہ ”ہندو مسلمان کے بے“ کے نعرے گونج رہے تھے۔ یہ دیکھ کر حیرت ہوتی تھی کہ گاندھی جی نے ان تمام فرقوں اور جماعتوں پر نہ جانے کیا جادو کر دیا کہ رنگ برنگ کا مجمع اکٹھا ہو کر ایک ہی طرف جھک پڑا۔ وہ حقیقت میں لوگوں کی مخلوط خواہشوں کا مظہر بن گئے تھے“ (یہ فقرہ ایک دوسرے لیڈر کے لئے استعمال کیا گیا تھا۔)

اس سے زیادہ حیرت انگیز بات یہ تھی کہ لوگوں کے اس جوش و خروش میں بدیشی حکمرانوں سے نفرت کا جذبہ نسبتاً بہت کم پایا جاتا تھا۔ قوم پرستی اصل میں ایک مخالفانہ جذبہ ہے۔ دوسری قوموں اور بیزاری اس کی غذا ہے خصوصاً غلام ملک کی قوم پرستی تو سراسر بدیشی حکمرانوں سے نفرت کے جذبے پر منحصر ہے۔ ہندوستان میں بھی ۱۹۲۱ء میں برطانیہ سے نفرت اور بیزاری موجود تھی لیکن دوسرے غلام ملکوں کے مقابلے میں بہت کم تھی۔ سچ پوچھئے تو اس کی وجہ یہ تھی کہ گاندھی جی نے عدم تشدد پر غرے معمولی زور دیا تھا۔ ایک دوسری وجہ یہ تھی کہ تحریک کے شروع ہوتے ہی لوگوں میں

آزادی اور قوت کا احساس پیدا ہو گیا تھا اور انہیں یقین تھا کہ منزل مقصود ہم سے قریب ہے اس لئے سوچتے تھے کہ جب کام اتنی اچھی طرح چل رہا ہے اور کامیابی بالکل یقینی ہے تو فطرت اور غصہ کی ضرورت ہی کیا ہے یا احساس قوت نے ہم میں فراخ دلی پیدا کر دی تھی۔

مگر ہمارا دل اپنے ان معدودے چند ہم وطنوں سے صاف نہ تھا جو ہمارے حریفوں سے مل کر قومی تحریک کی مخالفت کر رہے تھے۔ گو ہم نے اپنے طرز عمل میں بہت احتیاط سے کام لیا اور اس کا اظہار نہیں ہونے دیا۔ ان کے معاملے میں نفرت یا غصے کا کوئی سوال نہیں تھا اس لئے کہ ان کی کوئی اہمیت نہیں تھی اور ہم انہیں آسانی سے نظر انداز کر سکتے تھے، البتہ ان کی کمزوری، ابن الوقتی اور قوم فروشی کو دیکھ کر ہمارے دل میں حقارت کا جذبہ ضرور پیدا ہوتا تھا۔

بہر حال ہم بے سوچے سمجھے زور شور سے بڑھے چلے جا رہے تھے۔ سفر کا سرور ہمارے دل و دماغ پر چھایا ہوا تھا، مگر منزل مقصود کا کوئی واضح تصور ہمارے سامنے نہیں تھا۔ اب یہ خیال کر کے حیرت ہوتی ہے کہ ہم نے کس طرح تحریک کے نظری پہلو یعنی اس کے فلسفے اور مقصد کو قطعی طور پر نظر انداز کر دیا تھا۔ ہم سب سوارج پکارتے تھے۔ لیکن اس لفظ کا مفہوم کامل سیاسی آزادی اور جمہوری طرز حکومت تھا اور ہم اپنی تقریروں میں اس کا صاف صاف اظہار ہی بھی کرتے تھے۔ ہم میں سے بہت سے یہ بھی سمجھتے تھے کہ اس سے لازمی طور پر اس بوجھ میں کمی ہو جائے گی جو کسانوں اور مزدوروں کے طبقے کو کچلے ڈالتا ہے۔ لیکن یہ یقینی ہے کہ ہمارے اکثر لیڈر سوارج کا مفہوم مکمل آزادی سے بہت کم سمجھتے تھے۔ گاندھی جی خود اس معاملے میں بڑے مزے کی گول مول باتیں کیا کرتے تھے۔ وہ نہیں چاہتے تھے کہ اس پر وضاحت سے غور کیا جائے۔ مگر ان کی بہم گفتگو سے بھی یہ صاف طور پر ظاہر تھا کہ وہ غریبوں کے حامی ہیں اور اس بات سے ہم میں سے اکثر کو بڑی تسکین

ہوتی تھی اگر چہ اسی کے ساتھ وہ امیروں کو بھی بہت اطمینان دلاتے تھے۔ گاندھی جی کسی مسئلے کو عقلی طور پر حل کرنے کے قائل نہیں تھے بلکہ سیرت اور پرہیز گاری پر زور دیتے تھے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ انہیں ہندوستانیوں میں محکم ارادہ اور مضبوط سیرت پیدا کرنے میں حیرت انگیز کامیابی ہوئی لیکن بہت ایسے بھی تھے جن میں نہ محکم ارادہ پیدا ہوا اور نہ مضبوط سیرت بلکہ انہوں نے یہ سمجھ لیا کہ ڈھیلا ڈھالا جسم اور بے رونق چہرہ پرہیز گاری کی علامت ہے۔

لوگوں میں جو غیر معمولی قوت اور چستی پیدا ہو گئی تھی اسے دیکھ کر ہمارا دل اعتماد نفس کے جذبے سے معمور تھا۔ یس، پست اور منتشر جماعت یکا یک سینہ تان کر اور گردن اٹھا کر چلنے لگی اور منضبط اور متحدہ تحریک میں جو ملک میں اس سرے سے اس سرے تک اٹھتی تھی، شریک ہو گئی۔ ہمیں یقین تھا کہ یہ جوش عمل بجائے خود ان میں ایسی قوت پیدا کر دے گا جس کا مقابلہ دنیا کی کوئی طاقت نہیں کر سکتی۔ اس لئے ہمیں اس کی ضرورت ہی محسوس نہیں ہوئی کہ عمل کی تہ میں کوئی خیال بھی ہونا چاہیے۔ ہم نے اس حقیقت کو فراموش کر دیا تھا کہ صحیح تخیل اور منزل مقصود کے تعین کے بغیر عوام ک ایہ سارا جوش و خروش دھواں بن کراڑ جائے گا۔ ہماری تحریک میں ایک اصلاحی عنصر تھا وہ ہمیں کسی حد تک آگے بڑھائے جا رہا تھا۔ ہمیں یہ زعم تھا کہ عدم تشدد جو سیاسی اور معاشی تحریکوں کے لئے اور مظالم ک انداز کرنے کے لئے سب سے کارگر چیز ہے، ایک نیا پیام جو ہم ساری دنیا کو دے رہے ہیں۔ سچ پوچھئے تو ہم اور سب قوموں کی طرح اس فریب نفس کا شکار ہو گئے کہ ہم ایک برگزیدہ قوم ہیں۔ عدم تشدد کو ہم جنگ و جدال کا اخلاقی بدل سمجھتے تھے جو مشنری اور جدید تہذیب کے متعلق گاندھی جی کے پرانے نظریوں کو تسلیم کرتے ہوں۔

ہمارا خیال تھا کہ وہ خود بھی انہیں ناقابل عمل اور جدید حالات کے لئے ناموزوں سمجھتے ہیں۔ بہر حال ہم میں سے اکثر جدید تہذیب کے کارناموں کو ٹھکرانے

کے لئے تیار نہ تھے۔ یہ اور بات ہے کہ ہم ہندوستان کے حالات کے مطابق ان میں مناسب ترمیم کی ضرورت سمجھتے ہوں۔ مجھے تو بڑی مشینیں اور تیز رفتار سواریاں بہت پسند ہیں۔ مگر اس میں کوئی شک نہیں کہ گاندھی جی کے خیالات کا بہت سے لوگوں پر اثر پڑا اور وہ مشینری اور اسکے استعمال کے نتائج پر نکتہ چینی کرنے لگے۔ گویا صورت یہ تھی کہ بعض لوگوں کو نظر مستقل پر تھی اور بعض کی ماضی پر مگر لطف یہ ہے کہ دونوں فریق اس متحدہ کوشش کو جو وہ کر رہے تھے، مفید سمجھتے تھے۔ اسی لئے وہ ایثار اور قربانی کیلئے آسانی سے تیار ہو گئے۔

میں اور میری طرح اور بہت سے لوگ اس تحریک میں محو ہو کر رہ گئے۔ میں نے اپنی تمام پرانی دلچسپیاں اور تعلقات، پرانے دوستوں کی صحبت، کتب بینی غرض سب کچھ ترک کر دیا۔ یہاں تک کہ اپنے کام کی خبروں کی سوا اخبار تک پڑھنا چھوڑ دیا۔ اس وقت تک مجھے تازہ ترین مطبوعات پڑھنے کا شوق تھا۔ اور میں کوشش کرتا تھا کہ واقعات عالم سے باخبر رہوں لیکن اب اس کے لئے وقت کہاں سے آتا؟ باوجود اس محبت کے جو مجھے اپنے خاندان سے تھی، میں نے اپنے سب عزیزوں یہاں تک کہ اپنی بیوی اور لڑکی کو بھی بھلا دیا تھا۔ یہ احساس مجھے ایک عرصے کے بعد ہوا کہ اس زمانہ میں ان لوگوں کو مجھ سے کتنی تکلیف پہنچی ہوگی اور میری بیوی نے کس قدر صبر و تحمل سے کام لیا۔ میں دن رات دفتروں کمیٹیوں اور جلسوں میں رہا کرتا تھا۔ ان دونوں دیہات جانے کا زور تھا اور ہم کھیتوں ہی کھیتوں میں میلوں پیدل چلا کرتے تھے اور دور دور پہنچ کر کسانوں کے جلسوں میں تقریریں کیا کرتے تھے۔ اب مجھے اس جوش کا احساس ہوا جو مجمع میں جا کر پیدا ہوتا ہے اور معلوم ہوا کہ مجھ میں لوگوں پر اثر ڈالنے کی قوت ہے۔ میں مجمع کی نفسیات کو تھوڑا بہت سمجھنے لگا اور اس فرق سے واقف ہو گیا جو شہر والوں اور دیہاتیوں کی ذہنیت میں ہوتا ہے۔ مجھے بڑے بڑے جلسوں کے گرد و غبار ریل پیل دھکم دھکا میں لطف آنے لگا۔ البتہ کبھی

کبھی ان کی بد نظمی سے مجھے غصہ آ جاتا تھا۔ اس کے بعد بعض اوقات مجھے مخالف اور برہم مجمع سے بھی سابقہ پڑا جو اس قدر برافروختہ کیا کہ میرا ابتدائی تجربہ اور وہ اعتماد نفس جو اس کی وجہ سے مجھ میں پیدا ہو گیا تھا بہت کام آیا۔ میں نے ہمیشہ لوگوں پر بھروسہ کیا اور مجمع کے بیچ سے دراتا چلا گیا۔ اب تک وہ مجھ سے ہمیشہ بڑے اخلاق اور عزت سے پیش آئے ہیں چاہے انہیں میری رائے سے اتفاق نہ بھی ہو لیکن مجمع کا کیا اعتبار۔ ممکن ہے آئندہ مجھے تلخ تجربے پیش آئیں۔ مجھے مجمع سے اور مجمع کو مجھ سے انس ہو گیا لیکن میں نے کبھی اپنی ہستی کو اس میں محو نہیں ہونے دیا ہمیشہ اپنے آپ کو الگ تھلگ رکھا اپنے خاص زاویہ نگاہ سے میں اس پر ناقدانہ نظر ڈالتا تھا اور ہمیشہ تعجب کیا کرتا تھا کہ اگرچہ میں ان ہزاروں افراد سے جو مجھے چاروں طرف سے گھیرے ہوئے ہیں۔ عادات و اطوار، جذبات و خواہشات، ذہنی اور روحانی اعتماد بھی کرتے ہیں۔ کیا اس کی یہ وجہ تھی کہ انہوں نے مجھے کچھ سے کچھ سمجھ لیا تھا؟ کیا مجھے میرے اصلی رنگ میں دیکھنے کے بعد بھی وہ درگزر سے کام لیں گے؟ میں نے صاف گوئی برتی اور ان کے سامنے سچی بات کہنے سے کبھی گریز نہ کیا۔ اکثر میں نے انہیں کھری کھری سنائیں اور ان کے توہمات اور رسم و رواج پر لعن طعن کی۔ پھر بھی وہ مجھ سے بیزار نہیں ہوئے۔ لیکن میرے دل میں یہ خیال ہمیشہ کھلکتا رہا کہ وہ میری ذات سے جیسی وہ واقعی ہے محبت نہیں کرتے ہیں۔ بلکہ اس خوشنما تصور سے محبت کرتے ہیں جو انہوں نے میرے متعلق اپنے ذہن میں قائم کر لیا ہے۔ لیکن یہ جھوٹی مورت کب قائم رہ سکتی ہے۔ اور کیوں قائم رہنے دی جائے؟ پھر جب یہ مورت پاش پاش ہو جائے گی اور حقیقت کھل جائے گی تو کیا ہوگا؟

مجھ میں خود پسندی کا عیب ہے لیکن ان بھولے بھالے لوگوں کے سامنے خود پسندی کا کوئی موقع نہیں تھا۔ ان میں اس بناوٹ اور اچھے پن کا شائبہ بھی نہیں ہے جو اکثر ہمارے اوسط طبقے کے لوگوں میں، جنہیں ان سے برتر ہونے کا دعویٰ ہے پائی

جاتی ہے۔ اس میں شبہ نہیں کہ یہ بیچارے عام طور پر بے حس اور انفرادی طور پر نہایت غیر دلچسپ ہیں لیکن بہ حیثیت مجموعی ان پر بڑا ترس آتا ہے، اور اس مصیبت کو دیکھ کر جوان کے سروں پر منڈ لاتی رہتی ہے، بہت دکھ ہوتا ہے۔

لیکن ہماری کانفرنسوں کا رنگ کچھ اور ہی ہوتا تھا یہاں ہمارے چیدہ کارکن (جن میں میں بھی شامل تھا) پلیٹ فارم پر طرح طرح کے کرتب دکھاتے تھے۔ ہمارے انداز میں بناوٹ کی اور ہماری دھواں دھار تقریروں میں اوجھے پن کی کمی نہ تھی۔ یہ عیب ہم میں سے ہر ایک میں کسی نہ کسی حد تک موجود تھا۔ کسی بڑے مجمع کے سامنے پلیٹ فارم پر فطری انداز قائم رکھنا آسان کام نہیں ہے اور اہم میں سے اکثر کو اتنی زیادہ شہرت حاصل کرنے کا پہلا ہی اتفاق تھا۔ اس لئے ہم اپنی وہ ہیئت بنا لیتے تھے جو ہمارے نزدیک لیڈروں کی ہونی چاہیے۔ یعنی ایک غور و فکر اور سنجیدگی کی شان جس میں ہنسی مذاق کا شائبہ بھی نہ تھا۔ چلتے پھرتے، اٹھتے بیٹھتے، یہاں تک کہ مسکراتے وقت بھی ہمیں یہ خیال رہتا تھا کہ ہزاروں آنکھیں ہم پر لگی ہوئی ہیں اور اس سے متاثر ہو کر ہم طرح طرح کی مضحک حرکتیں کیا کرتے تھے۔ دوسروں کی نظر سے اپنے آپ کو دیکھنا بہت مشکل ہے اس لئے میں خود اپنی تنقید نہیں کر سکتا تھا۔ البتہ دوسروں کے عادات و اطوار کا بہت غور سے مطالعہ کرتا تھا اور اس سے بہت لطف اٹھاتا تھا لیکن اسی کے ساتھ یہ خیال کر کے دل کانپ اٹھتا تھا کہ شاید دوسروں کو بھی میں اتنا ہی مضحک معلوم ہوتا ہوں۔

۱۹۲۱ء میں سال بھر کانگریس کے کارکن ایک ایک کر کے برابر گرفتار ہوتے رہے اور سزا پاتے رہے۔ مجموعی گرفتاریاں شروع نہیں ہوئی تھیں۔ علی برادان کو فوج میں بغاوت پھیلانے کے جرم میں طویل سزامل چکی تھی۔ جن الفاظ کے زبان سے نکالنے پر انہیں سزا ہوئی تھی۔ سینکڑوں پلیٹ فارموں سے ہزاروں آدمیوں نے انہیں کو دہرایا۔ گرمیوں کے زمانے میں میرے متعلق بھی یہ اندیشہ ظاہر کیا گیا کہ چند

تقریروں کی بنا پر مجمعہ پر بغاوت کا جرم عائد کیا جائے گا اور مقدمہ چلایا جائے گا۔ لیکن ایسی کوئی کاروائی نہیں کی گئی۔ سال کے آخر میں معاملات حد کو پہنچ گئے۔ پرسن آف ویلز ہندوستان آنے والے تھے۔ اور کانگریس نے طے کیا تھا کہ ان کا بائیکاٹ کیا جائے۔ نومبر کے آخر میں بنگال میں کانگریس کے والنٹیر خلاف قانون قرار دے دئے گئے۔ اس کے بعد اسی قسم کا اعلان صوبجات متحدہ میں بھی ہوا۔ دلش بندھو داس نے صوبہ بنگال کے نام ایک ولولہ انگیز پیغام شائع کیا۔ انہوں نے لکھا تھا۔ ”مجھے محسوس ہوتا ہے کہ میرے ہاتھوں میں تھکڑیاں پڑی ہوئی ہیں اور میرا سارا جسم اپنی زنجیروں سے جکڑا ہوا ہے۔ یہ غلامی کا قہر ہے۔ سارا ملک ایک بہت بڑا جیل خانہ ہے۔ چاہے میں آزاد ہوں یا جیل خانہ میں بند کر دیا جاؤں۔ چاہے میں زندہ رہوں یا مر جاؤں لیکن کانگریس کا کام بہر صورت جاری رہنا چاہیے۔“ صوبہ متحدہ میں بھی ہم نے حکومت کے چیلنج کو قبول کر لیا اور نہ صرف یہ اعلان کیا کہ ہماری والنٹیروں کی انجمن جاری رہے گی۔ بلکہ روزانہ اخباروں میں اپنے والنٹیروں کے نام بھی شائع کرانا شروع کر دیئے۔ پہلی فہرست میں سب سے پہلانا نام میرے والد کا تھا۔ وہ والنٹیر نہ تھے۔ لیکن محض گورنمنٹ کے حکم کی خلاف ورزی کے لئے انہوں نے بھی اپنا نام لکھ لیا۔ دسمبر کے آغاز میں ولی عہد کے آنے سے چند روز پہلے کثیر تعداد میں گرفتاریاں شروع ہو گئیں۔

ہم جانتے تھے کہ اب پانی سر سے اونچا ہو گیا ہے۔ حکومت اور کانگریس کے درمیان جس جنگ کا اندیشہ تھا اور وہ اب چھیڑے ہی والی ہے۔ جیل خانہ ابھی تک ایک غیر معروف جگہ تھی اور جیل جانے کا خیال بالکل نے اٹھا۔ میں ایک دن الہ آباد کے کانگریس کے دفتر میں معمول کے وقت کے بعد بیٹھا پچھلا کام مٹا رہا تھا کہ ایک کلرک گھرایا ہوا آیا اور کہا کہ پولیس تلاشی کا حکم لے کر آپہنچی ہے اور دفتر کی عمارت کو گھیرے ہوئے ہے۔ میں بھی کچھ گھبرا گیا کیونکہ اس قسم کا یہ میرا پہلا تجربہ تھا۔ مگر میں

نے دل میں کہا کہ ذرا رعب جمانا چاہیے اور یہ ظاہر کرنا چاہیے کہ ہم بالکل مطمئن ہیں اور ہمیں پولیس کی آمد و رفت کی مطلق پرواہ نہیں۔ چنانچہ میں نے ایک کلرک کو حکم دے کہ وہ پولیس افسر کے ساتھ ساتھ جا کر دفتر کے تمام کمرے دکھا دے اور باقی عملے کو سختی سے تاکید کی کہ وہ پولیس کی طرف کوئی توجہ نہ کریں اور بدستور اپنا کام کرتے رہیں۔ تھوڑی دیر بعد میرے ایک دوست اور رفیق کار جو دفتر کے باہر ہی گرفتار ہوئے تھے ایک سپاہی کے ساتھ مجھ سے رخصت ہونے آئے۔ مجھے اس وقت یہ خط سلایا ہوا تھا کہ جیسے نئے واقعات میرے لئے آئے دن کی چیز ہیں۔ اس لئے میں اپنے دوست سے بڑی سہمہری سے پیش آیا یعنی میں نے ان سے اور سپاہی سے بڑی بے پروائی سے کہا کہ ذرا ٹھہریں۔ میں یہ خط ختم کر لوں۔ اس کے بعد ہی شہر سے گرفتاریوں کی خبریں آنا شروع ہو گئیں۔ آخر کار میں نے سوچا کہ گھر چل کر دیکھنا چاہیے کہ وہاں کیا ہو رہا ہے۔ مکان پہنچا تو دیکھا کہ پولیس وہاں بھی موجود ہے اور ہماری وسیع کوشش کی تلاشی لے رہی ہے۔ بعد میں معلوم ہوا کہ وہ والد کو اور مجھے گرفتار کرنے آئے ہیں۔

ہم پرنس آف ویلس کے بائیکاٹ میں چاہے جتنا اہتمام کرتے ہمیں اتنی کامیابی ہرگز نہیں ہو سکتی تھی جتنی ان واقعات سے ہوئی۔ جہاں کہیں وہ تشریف لے گئے ہڑتالوں اور سونی سڑکوں نے ان کا خیر مقدم کیا۔ الہ آباد کی آمد کے موقع پر شہر خموشاں معلوم ہوتا تھا۔ چند دن بعد وہ کلکتے گئے تو اس عظیم الشان شہر میں بھی تمام چہل پہل یکا یک بند ہو گئی۔ یہ پرنس آف ویلس کے ساتھ بڑا ظلم تھا۔ کیونکہ نہ ان کا کوئی قصور تھا نہ ہمیں ان سے کوئی شکایت تھی۔ البتہ حکومت ہند ان کی شخصیت سے ناجائز فائدہ اٹھانا چاہتی تھی اور ان کے ذریعے سے اپنی گرتی ہوئی ساکھ سنبھالنا چاہتی تھی اس لئے ہم ان کا بائیکاٹ کر رہے تھے۔

اب تو گرفتاریوں اور سزایابیوں کا تار بندھ گیا خصوصاً بنگال اور صوبہ جات متحدہ

میں ان صوبوں کے تمام مقتدر لیڈر اور کارکن گرفتار کر لئے گئے اور والنٹیر تو ہزاروں کی تعداد میں جیل بھیج دئے گئے۔ شروع شروع میں زیادہ تر شہر والوں نے پیش قدمی کی اور یہ دیکھ کر حیرت ہوتی تھی کہ جیل جانے والے والنٹیر وں کا سلسلہ کسی طرح ختم ہی نہیں ہوتا تھا۔ صوبہ متحدہ کی کانگریس کمیٹی تو اپنے اجلاس کے وقت پوری کی پوری گرفتار کر لی گئی (اس وقت ۵۵ ممبر موجود تھے) بہت سے ایسے لوگ بھی جنہوں نے کانگریس میں یا سیاسی کاموں میں آج تک کوئی حصہ نہیں لیا تھا۔ جوش کے اس المذتے ہوئے سیلاب میں بہہ گئے اور گرفتار ہونے کے لئے نکل کھڑے ہوئے۔ ایسی مثالیں بھی سننے میں آتی ہیں کہ سرکاری دفتر کا کوئی کلرک شام کو اپنے کام سے واپس آ رہا ہے۔ راستے میں وہ بھی اس رو میں بہہ گیا اور گھر جانے کی بجائے جیل پہنچ گیا۔ لڑکے اور نوجوان، قیدیوں کی لاری میں گھس جاتے تھے اور اصرار کرتے تھے کہ ہمیں بھی جیل خانے لے چلو۔ روز شام کو ہم جیل کے اندر سے سنا کرتے تھے کہ سیاسی قیدیوں کی لاریوں پر لاریاں چلی آرہی ہیں اور قومی نعرے لگائے جا رہے ہیں۔ جیل خانے کچا کچھ بھر گئے تھے اور جیل کے افسر اس غیر معمولی حالات سے سخت پریشان تھے۔ ان کی سمجھ میں نہ آتا تھا کہ کیا کرنا چاہیے۔ کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا تھا کہ پولیس کی لاری وارنٹ کے مطابق قیدیوں کی ایک خاص تعداد لیکر روانہ ہوئی (قاعدے کی وجہ سے یا مجبوری سے انکے نام نہیں لکھے جاتے تھے) مگر جب جیل خانے کے دروازے پر پہنچی تو اس میں اس تعداد سے کہیں زیادہ قیدی نکلے۔ جیل کے افسر حیران رہ جاتے تھے کہ اس عجیب و غریب صورت میں کیا طرز عمل اختیار کریں کیونکہ جیل مینوئل میں اس کے متعلق کوئی دفعہ نہ تھی۔

آخر حکومت نے لوگوں کو بلا تفریق گرفتار کرنے کا رویہ ترک کر دیا۔ اب صرف مشہور مشہور کارکن چن لئے جاتے تھے۔ رفتہ رفتہ لوگوں کے جوش کا وہ پہلا زور کم ہو گیا۔ اور چونکہ جیل میں سارے کے سارے معتمد کارکن نہ تھے اس لئے وہ ایک

بے بسی اور تذبذب کی حالت میں پھنس گئے۔ لیکن یہ تبدیلی محض ظاہری تھی۔ ابھی فضا میں گرج اور کڑک موجود تھی۔ ملک میں بے چینی باقی تھی اور انتہائی رجحانات پائے جاتے تھے۔ دسمبر ۲۱ء و جنوری ۲۲ء میں ترک موالات کے سلسلے میں ۳۰ ہزار شخص جیل گئے۔ لیکن اگرچہ سارے نمایاں لیڈر اور کارکن جیل میں تھے مگر تحریک کے بانی اور رہبر اعظم مہاتما گاندھی ابھی باہر تھے اور روزانہ پیغامات اور ہدایات جاری کرتے رہتے تھے جس سے لوگوں میں جوش بڑھتا تھا۔ اور اکثر نامناسب حرکتیں رک جاتی تھیں۔ حکومت نے اب تک انہیں نہیں چھیڑا تھا، کیونکہ وہ اس کے نتائج سے ڈرتی تھی اور اسے اندیشہ تھا کہ کہیں ہندوستانی فوج اور پولیس نہ بھڑک اٹھے۔

فروری ۲۲ء کے آغاز میں یکا یک تمام منظر بدل گیا۔ جیل خانے میں یہ سن کر ہمیں بڑی حیرت و پریشانی ہوئی کہ گاندھی جی نے تمام جارحانہ کاروائیاں ایک دم سے روک دیں۔ اور عدم تعاون کی تحریک ملتوی کر دی۔ اخباروں میں ہم نے یہ بھی پڑھا کہ چوراچوری کے واقعات کی وجہ سے انہوں نے یہ طرز عمل اختیار کیا۔ یہ موضع گورکھپور کے ضلع میں ہے۔ یہاں دیہاتیوں کے ایک مجمع نے پولیس کے مظالم سے تنگ آ کر تھانے کو آگ لگا دی اور چھ سات سپاہیوں کو زندہ جلا دیا۔

ہمیں جنگ کے التوا کی خبر سن کر بڑا غصہ آیا۔ کیونکہ اس وقت ہماری قوت بڑی ہوئی تھی اور ہم ہر محاذ پر پیش قدمی کر رہے تھے۔ لیکن جیل خانے کے اندر ہماری مایوسی اور غصہ سے کیا نتیجہ نکل سکتا تھا۔ چنانچہ عدم تعاون ختم ہو گیا اور ترک موالات کی کلی کھلنے سے پہلے مرجھا گئی۔ مہینوں کی تنگ و دو اور پریشانی کے بعد حکومت نے بھی اطمینان کا سانس لیا اور اب اسے پہلے پہل موقع ملا کہ پیش قدمی کرے چنانچہ چند ہفتے کے اندر اندر اس نے گاندھی جی کو گرفتار کر کے طویل مدت کے لیے جیل خانے میں بند کر دیا۔

عدم تشدد دیا تلوار

چوراچوری کے حادثے کی وجہ سے تحریک کا ایک ایک ملٹوی ہو جانا غالباً مہاتما گاندھی کے سوا تمام نمایاں کانگریسی لیڈروں کو ناگوار ہوا۔ میرے والد بھی (جو اس وقت جیل ہی میں تھے) اس سے بہت بد دل ہو گئے۔ نوجوان طبقہ قدرتی طور پر زیادہ مشتعل ہوا کیونکہ ہماری بڑھتی ہوئی امیدوں کا قلعہ یکا یک بیٹھ گیا۔ ظاہر ہے کہ اس عمل کا یہی درعمل ہونا تھا۔ التوا سے زیادہ ہم ان وجوہ سے جو التوا کی تائید میں پیش کی گئیں اور ان نتائج سے جو ان سے نکلتے تھے۔ گھبرا گئے۔ مانا کہ چوراچوری کا واقعہ نہایت افسوسناک اور عدم تشدد کے اصول کے قطعی منافی تھا، لیکن سوال یہ پیدا ہوتا تھا کہ کیا ملک کے کسی کو نے کا ایک گاؤں اور وہاں کے مشتعل کسانوں کا ایک گروہ جنگ آزادی کا اس طرح خاتمہ کر سکتا ہے؟ اگر تشدد کے کسی انفرادی واقعہ کا یہ نتیجہ ہو سکتا ہے تو عدم تشدد کی لڑائی کے اصول اور عمل میں ضرور کوئی نقص ہے کیونکہ ہمارے نزدیک یہ ناممکن تھا کہ اتنی بڑی تحریک میں اس طرح کے اکا دکا واقعات پیش نہ آئیں۔ تو کیا ہمیں آگے بڑھنے سے پہلے ہندوستان کے تیس پینتیس کروڑ انسانوں کو عدم تشدد کے اصول اور عمل کی مکمل تعلیم دینا چاہیے؟ اور اگر ہم ایسا کرنے کی کوشش بھی کریں تو خود ہم میں سے کتنے لوگ نکلیں گے جنہیں اپنے اوپر اعتماد ہوگا کہ پولیس کے انتہائی اشتعال کے باوجود وہ پوری طرح پر امن رہ سکیں گے؟ یا فرض کیجئے کہ ہم کامیاب بھی ہو جائیں تو ان بے شمار سرکاری گروہوں کا کیا علاج کریں گے جو ہماری تحریک میں چپکے سے گھس کر خود تشدد کی حرکتیں کرتے ہیں اور دوسروں کو ورغلا رہے ہیں۔ اگر عدم تشدد کی تحریک چلانے کی یہی شرط ٹھہری کہ ملک کے طول و عرض میں تشدد کا ایک واقعہ بھی نہ ہونے پائے تو اس کی کامیابی معلوم۔

ہم یہ عقیدہ رکھتے تھے کہ عدم تشدد کا طریقہ نہایت موثر اور نتیجہ خیز ہے۔ اسی وجہ

سے ہم نے اسے اختیار کیا تھا۔ اور اسی وجہ سے کانگریس نے اسے تسلیم کیا تھا۔ گاندھی جی نے بھی اسے ملک کے سامنے نہ صرف صحیح بلکہ انتہائی موثر طریقے کی، حیثیت سے پیش کیا تھا۔ اگرچہ اس کا نام ایک منضیانا نام تھا، لیکن اس میں وہ زبردست عملی قوت موجود تھی جو ظالم کے سامنے سر جھکنے نہیں دیتی تھی۔ یہ ان بزدلوں کے لئے جو عمل سے جی چراتے ہیں پناہ کی صورت نہ تھی بلکہ وہ طاقت تھی جس کے ذریعے سے بہادر بدی اور غلامی کا مقابلہ کرتے ہیں۔ لیکن بہادر اور طاقتور لوگ وہاں کیا کر سکتے ہیں جہاں معدودے چند اشخاص (جو ممکن ہے دوست کے بھیس میں دشمن ہوں) جب چاہیں اپنی بے عنوانیوں سے ہماری تحریک کو بند کر دیں۔

گاندھی جی نے بڑی خوش بیانی اور دلنشین انداز سے جس کے وہ مالک ہیں عدم تشدد اور پرامن ترک موالات پر عمل کرنے کی سفارش کی تھی۔ ان کی زبان بہت سادی تھی اور اس میں بناوٹ نام کو نہ تھی۔ ان کی آواز اور ان کا چہرہ بہ ظاہر خوش و خروش اور جذبات سے خالی نظر آتا تھا۔ لیکن برف کی اس سطح کے نیچے دہکتی ہوئی آگ کی گرمی اور جذبات کا تلاطم خیز طوفان شبدہ تھا۔ یہی وجہ تھی کہ جو لفظ ان کی زبان سے نکلتا تھا وہ سننے والوں کے دل و دماغ کی گہرائیوں میں اتر کر آگ لگا دیتا تھا۔ جو راستہ انہوں نے بتایا تھا وہ سخت دشوار گزار ضرور تھا لیکن یہ ہمت والوں کا راستہ تھا اور معلوم ہوتا تھا کہ منزل مقصود تک پہنچا کر رہے گا۔ اسی امید و بیم پر ہم نے اسے اختیار کیا اور آگے بڑھنا شروع کر دیا۔ گاندھی جی نے ”تکوار کے مشرب“ کے موضوع پر ۱۹۲۰ء میں ایک مشہور و معروف مضمون لکھا تھا۔ اس میں وہ تحریر فرماتے ہیں کہ:-

”بیشک میرا یہ ایمان ہے کہ اگر صرف دو ہی صورتیں سامنے

ہوں یعنی بزدلی یا تشدد تو تشدد پر عمل کرنا چاہیے۔ بجائے اس کے کہ

ہندوستان بزدلی کے ستھ اپنی ذلت کا خود شکار ہو جائے۔ میں یہی

چاہوں گا کہ وہ اپنی عزت کے تحفظ کی خاطر ہاتھ میں تلوار اٹھالے۔
لیکن یہ میرا عقیدہ ہے کہ عدم تشدد، تشدد سے بہر صورت برتر ہے۔
انقام کے مقابلے میں غفو میں زیادہ مردانگی ہے۔

غفوسپاہی کی آن ہے لیکن وہ غفوس وقت کہلائے گا جب انقام
کی طاقت موجود ہو۔ اگر کوئی بے بس اور لاچار غفوکا دعویٰ کرے تو اس
کی کوئی وقعت نہیں۔ ایک چوہا بلی کو اس وقت کبھی معاف نہیں کر سکتا
جبکہ وہ پھاڑ کر اس کے ٹکڑے ٹکڑے کر رہی ہو۔۔۔ لیکن میں
ہندوستان وک وکمزور نہیں سمجھتا۔ نہ اپنے آپ کو بے بس سمجھتا ہوں۔۔
اس معاملے میں آپ کو کوئی غلط فہمی نہ ہونا چاہیے۔ میرا منشا یہ ہے کہ
قوت جسمانی طاقت پر منحصر نہیں بلکہ یہ اٹل قوت ارادی سے پیدا ہوتی
ہے۔۔۔۔۔ میں خیالی دنیا کا رہنے والا نہیں ہوں۔ مجھے تو عملی اصول
پرست ہونے کا دعویٰ ہے۔ عدم تشدد کا مذہب محض رشیوں اور مہینوں
کے لئے نہیں ہے بلکہ عام انسانوں کے لئے بھی ہے۔ جس طرح تشدد
درندوں کا خاصہ ہے اسی طرح عدم تشدد انسانوں کی فطرت ہے۔
درندوں کی روح خوابید ہوتی ہے وہ جسمانی طاقت کے سوا کسی
دوسریت اصول سے واقف نہیں ہوتے لیکن انسانی شرف کا یہ تقاض
ا ہے کہ بلند تر اصول یعنی روحانی قوت کا نظریہ پر عمل کرے۔

اسی لئے میں نے ہندوستان کے سامنے قربانی کا قدیم اصول
پیش کرنے کی جرات کی ہے۔ ستیاگرہ اور اس کے لوازم یعنی ترک
موالات اور رسول نافرمانی وغیرہ سب تکلیف برداشت کرنے کے
اصول کے دوسرے نام ہیں۔ جن رشیوں نے تشدد کے طوفان میں
عدم تشدد کا نظریہ معلوم کیا وہ نیوٹن سے زیادہ ہوشمند تھے۔ دراصل وہ

لنگٹن سے اچھے سپاہی تھے۔ فن سپہ گری کے ماہر ہوتے ہوئے انہوں نے محسوس کیا کہ یہ ہتھالے سب عبث ہیں اس لئے جنگ سے اکتائی ہوئی دنیا کو انہوں نے یہ پیغام دیا کہ تمہاری نجاب تشدد میں نہیں بلکہ عدم تشدد میں ہے۔

عدم تشدد پر عامل ہونے کا یہ مقصد ہے کہ انسان جان بوجھ کر تکلیفیں برداشت کرے۔ اس کا یہ منشا ہر گز نہیں کہ ظالم کی مرضی کے آگے سر تسلیم خم کیا جائے بلکہ اس کے مقابلے میں اپنا پورا زور صرف کیا جائے اور دل و جان سے اس کی مخالفت کی جائے چنانچہ اس قانون کے تحت یہ ممکن ہے کہ تنہا ایک فرد اپنی عزت اپنے مذہب اور اپنی روح کو بچنے کے لئے ظالم سلطنتوں کی مجموعی طاقتوں کا مقابلہ کرے اور اس کی بنیادوں کو ہلا دے۔

میں ہندوستان کو کمزور سمجھ کر اسے عدم تشدد پر عمل کرنے کی ترغیب نہیں دیتا ہوں بلکہ میں یہ چاہتا ہوں کہ وہ اپنی قوتوں اور طاقتوں کا احساس کرتے ہوئے اس پر عمل کرے۔۔۔۔ میں ہندوستان کو جتنا چاہتا ہوں کہ اس کے پاس ایسی روح ہے جو کبھی فنا نہیں ہو سکتی۔ جو جسمانی کمزوری کے باوجود فخر مند ہو سکتی ہے اور جو ساری دنیا کی مجموعی جسمانی طاقتوں کا مقابلہ کر سکتی ہے۔

میں ترک مولات کی اس پر امن تحریک کو آئرلینڈ کی سن فین تحریک سے ممتاز کرنا چاہتا ہوں کیونکہ یہ اپنے تخیل کے اعتبار سے تشدد کے ساتھ ساتھ نہیں چل سکتی لیکن میں تشدد کے حامیوں کو بھی دعوت دیتا ہوں کہ وہ پر امن ترک مولات کو آزما کر دیکھیں اس میں کوئی فطری کمزوری نہیں جس سے نا کامیابی کا خطرہ ہو۔ ہاں اگر اسے عام

تائید حاصل نہ ہو تو ناکامی کا امکان ضرور ہے۔ اس وقت البتہ حقیقی خطرہ پیدا ہوگا۔ جو شیلے لوگ قومی ذلت کو زیادہ عرصے تک گوارا نہیں کر سکیں گے اس لئے ان کا غیض و غضب دوسرے راستے تلاش کرے گا۔ ممکن ہے ہندوستان تلوار کا طریقہ اختیار کر کے وقتی طور پر فتح حاصل کر لے لیکن اس ہندوستان پر مجھے ہرگز فخر نہ ہوگا۔ میں ہندوستان سے اس طرح وابستہ ہوں کہ میرے پاس جو کچھ ہے وہ سب اس کا ہے اور مجھے کامل یقین ہے کہ ہندوستان ساری دنیا کے لیے ایک پیغام رکھتا ہے۔“

گاندھی جی کے ان دلائل کا ہم پر بہت اثر پڑا لیکن ہمارے لئے یہ بحیثیت مجموعی کانگریس کے لئے عدم تشدد کوئی مذہب یا مستقل مسلک نہ تھا اور نہ ہو سکتا تھا۔ یہ صرف ایک حکمت عملی تھی اور اس سے بعض نتائج کی توقع تھی اور انہیں نتائج کی کسوٹی پر اسے کسنا تھا۔ افراد تو اسے مذہب یا مستقل مسلک بنا سکتے تھے لیکن کوئی سیاسی انجمن جب تک اسے سیاسی کہلانے کا دعویٰ ہو ایسا نہیں ہو سکتا۔

چورا چوری کے واقعات اور اس کے نتائج نے ہمیں موقع دیا کہ ہم عدم تشدد کے نشیب و فراز پر غور کریں۔ ہم نے یہ محسوس کیا کہ اگر التوائے تحریک کے معاملے میں گاندھی جی کے دلائل صحیح ہیں تو پھر ہمارے مخالفوں کو ہمیشہ یہ اختیار ہوگا کہ جب چاہیں ایسی صورت پیدا کر دیں جس سے جنگ خواہ مخواہ بند کرنا پڑے۔ کیا یہ عدم تشدد کا نقص تھا، یا گاندھی جی کی تشریح کا؟ بہر حال وہی اس کی بانی اور موجد تھے۔ اس لئے ان سے بہتر کون جان سکتا تھا کہ یہ کیا ہے اور کیا نہیں ہے؟ اور ان کے بغیر ہماری تحریک چل ہی نہیں سکتی تھی۔

کئی سال بعد ۱۹۳۰ء کی سول نافرمانی کی تحریک شروع ہونے سے پہلے گاندھی جی نے اس مسئلے کو صاف کر دیا جس سے ہمیں بہت کچھ اطمینان ہو گیا۔ انہوں نے

فرمایا کہ تشدد کے انفرادی واقعات کی وجہ سے تحریک کو بند نہ ہونا چاہیے۔ اگر ان نا خوشگوار حادثات کی وجہ سے جن کو ہونا کسی حد تک یقینی ہے۔ ہماری عدم تشدد کی جنگ جاری نہیں رہ سکتی تو سمجھنا چاہیے کہ یہ ہر موقع کے لئے موزوں طریق عمل نہیں ہے۔ لیکن اس بات کو ماننے کے لئے وہ ہرگز تیار نہیں تھے کیونکہ ان کے نزدیک صحیح طریق عمل ہر موقع پر کارگر ہوتا ہے۔ اور انتہائی ناموافق حالات میں بھی کسی نہ کسی حد تک جاری رہ سکتا ہے۔ یہ تشریح جس نے عدم تشدد کے دائرے کو وسیع کر دیا، گاندھی جی کی رائے میں تبدیلی کا نتیجہ تھی یا نہیں، یہ میں نہیں کہہ سکتا۔

اگرچہ اکثر لوگوں کو یہی خیال تھا۔ لیکن حقیقت میں فروری ۱۹۲۲ء میں سول نا فرمانی التوا محض چورا چوری کے واقعے کی وجہ سے نہیں ہوا تھا بلکہ اسباب کا ایک سلسلہ تھا جس کی یہ آخری کڑی تھی۔ گاندھی جی اکثر تقریباً وجدانی طور پر کام کرتے ہیں۔ عوام کے ساتھ ان کا قریبی تعلق بہت عرصے سے ہے اس لئے عظیم الشان اور ہرلعزیز رہبروں کی طرح ان میں بھی یہ معلوم کرنے کا ملکہ پیدا ہو گیا ہے کہ عام لوگوں کا رجحان اس وقت کیا ہے وہ کیا کر رہے ہیں اور کیا کر سکتے ہیں۔ اسی احساس سے متاثر ہو کر وہ اپنے طرز عمل کو بدلتے ہیں اور بعد میں اپنے رفقا کی حیرت اور خفگی کے خیال سے اپنے فیصلے کو دلائل کے غلاف میں لپیٹ دیتے ہیں۔ کبھی کبھی یہ دلائل بہت نا کافی معلوم ہوتے ہیں مثلاً چورا چوری کے بعد سول نا فرمانی کے التوا کے معاملے میں۔ یہ وہ وقت تھا جب ہماری تحریک ظاہری قوت اور عام جوش و خروش کے باوجود انتشار کی حالت میں تھی۔ تنظیم اور انضباط کو فوراً چکا تھا۔ قریب قریب چوٹی کے تمام آدمی جیل میں تھے اور عوام کو ابھی اتنی تربیت نہیں ملی تھی کہ بطور خود سلیقہ سے کام جاری رکھ سکیں۔ ہر کس و نا کس جو چاہتا کانگریس کمیٹی پر قبضہ کر سکتا تھا بلکہ سچ پوچھئے تو بہت سے نا اہل لوگ اور سرکاری گرجے صف اول میں آکھڑے ہوئے تھے اور انہوں نے چند مقامی کانگریس اور خلافت کمیٹیوں پر قبضہ کر لیا تھا۔ انہیں روکنے

کی کوئی صورت نہ تھی۔

ایسی لڑائیوں میں اس قسم کی باتیں ہونا لازمی ہیں۔ لیڈروں کو جیل جانے سے سبقت کرنی پڑتی ہے اور کام دوسروں پر چھوڑنا پڑتا ہے ایسی صورت میں صرف یہی کیا جاسکتا ہے کہ عوام کو چند معمولی سرگرمیوں کے جاری رکھنے کی تربیت دی جائے اور اس سے ضروری یہ ہے کہ بعض دوسری ناروا حرکتیں کرنے کی ممانعت کر دی جائے۔ ۱۹۳۰ء تک ہم اس قسم کی کافی تربیت دے چکے تھے اس لئے ۱۹۳۰ء و ۱۹۳۲ء کی سول نافرمانی کی تحریک زیادہ منظم اور قوی تھی لیکن ۱۹۳۱ء و ۱۹۳۲ء میں یہ بات نہ تھی۔ اس وقت لوگوں کے جوش و خروش کی تہ میں کوئی ٹھوس چیز موجود نہ تھی۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ اگر تحریک جاری رہتی تو بہت جگہ تشدد کے انفرادی واقعات ظہور میں آتے۔ حکومت انہیں نہایت خونخوارہ طریق سے کچلتی اور خوف و دہشت کا دور دورہ ہوتا جس سے لوگوں کی ہمتیں بالکل پست ہو جاتیں اور دوبارہ ابھرنے کی طاقت بھی باقی نہ رہتی۔

گانگھی جی کے ذہن میں غالباً یہی دلائل تھے اور یہی اثرات کام کر رہے تھے اس لئے اگر ان مقدمات کو تسلیم کر لیا جائے اور عدم تشدد کے طریقے کے جاری رکھنے کی ضرورت کو مان لیا جائے تو ہمیں ان کے فیصلے سے اتفاق کرنا پڑے گا۔ انہیں اس نکلے مسالے کو خارج کر کے نئے سرے سے عمارت بنانی تھی۔ ایک دوسرے اور بالکل مختلف نقطہ نظر سے ان کا فیصلہ غلط بھی کہا جاسکتا ہے۔ لیکن اس نقطہ نظر کو عدم تشدد سے کوئی تعلق نہیں۔ یہ نہیں ہو سکتا کہ ایک طرف عدم تشدد کا دعویٰ کیا جائے اور دوسری طرف تشدد سے چشم پوشی کی جائے۔ اگر اس حد تک پہنچنے کے بعد انفرادی خونریزی کے واقعات کی وجہ سے قومی تحریک دبا دی جائے تو اس کے ختم ہونے کا اندیشہ نہیں بلکہ اس قسم کی تحریکوں میں دب کر ابھرنے کی قوت ہوتی ہے۔ ظاہری شکست اکثر معاملے کو صاف کرنے اور تحریک کو نئی قوت بخشنے میں مدد دیتی

ہے۔ ظاہری شکست سے کہیں زیادہ اہم اصول اور نصب العین ہے۔ اگر قوم اپنے نصب العین کو آلودگی سے پاک رکھے تو بہت جلد سنبھلنے کی توقع ہوتی ہے۔ لیکن سوال یہ ہے کہ ۱۹۲۱ء و ۱۹۲۲ء میں ہمارا نصب العین تھا کیا؟ لے دے کر ایک مبہم قسم کا سوراج جس کا کوئی صاف تخیل ہمارے ذہن میں نہ تھا اور عدم تشدد کی جنگ کا ایک خاص مفہوم اگر ملک وسیع پیمانے پر انفرادی طور پر بھی تشدد سے کال لیتا تو عدم تشدد یوں ہی ختم ہو جاتا۔ رہا سوراج تو وہاں قدم جمانے کے لئے کوئی چیز نہ تھی۔ لوگوں کو عام طور پر ابھی اتنی قوت حاصل نہیں ہوئی تھی کہ وہ عرصہ تک جنگ کو جاری رکھ سکتے اور اگرچہ بدیشی حکومت کے خلاف عام بد دلی اور کانگریس کے ساتھ ہمدردی پائی جاتی تھی۔ لیکن کوئی بنیادی قوت یا تنظیم نہ تھی۔ اس لئے یہ جذبات زیادہ دیر تک قائم نہیں رہ سکتے تھے۔ لوگ محض ہنگامی جوش میں جیل چلے گئے کیونکہ انہیں تو قہر تھی کہ یہ معرکہ بہت جلد فتح ہو جائے گا۔

اس لئے بہت ممکن ہے کہ ۱۹۲۲ء میں سول نافرمانی کو ملتوی کرنے کا فیصلہ صحیح ہو۔ مگر اس میں بھی کوئی شک نہیں کہ التواء کا انداز بہت نامناسب تھا اور اس سے عوام کی اخلاقی حالت پر بڑا خراب اثر پڑا۔

شاید اس زبردست تحریک کے یکا یک بند کر دینے ہی کی وجہ سے ملک میں وہ افسوسناک صورت حال پیدا ہوئی جس نے قومی تحریک کو اس قدر نقصان پہنچایا۔ سیاسی جنگ میں تو انفرادی اور لا حاصل تشدد کا سد باب ہو گیا۔ لیکن تشدد کے دبے ہوئے جذبے نے اور طریقوں سے ہاتھ پیر نکالنا شروع کئے۔ آگے چل کر فرقہ وارانہ فسادات اٹھ کھڑے ہوئے۔ مختلف جماعتوں کے فرقہ پرست جو سیاسی اعتبار سے عموماً رجعت پسند تھے۔ ترک موالات اور سول نافرمانی کی ہماہمی اور غیر معمولی مقبولیت کی وجہ سے منہ چھپائے بیٹھے تھے۔ اب انہیں موقع مل گیا اور وہ اپنی اپنی کمین گاہ سے نکل آئے۔

بہت سے دوسرے لوگوں نے بھی یعنی خفیہ پولیس کے آواروں اور ان لوگوں نے جو فرقہ وارانہ فساد کرا کے افسروں کو خوش کرنا چاہتے تھے۔ یہی انداز اختیار کیا۔ مولپوں کی شورش بڑی بے رحمی سے دبائی جا چکی تھی۔ اس وحشیانہ ظلم کا تصور کر کے رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں کہ مولپا قیدی ریل کے ڈبوں میں ٹھونس دئے گئے اور گرمی میں تڑپ تڑپ کر مر گئے۔ بہر حال ان واقعات سے ان لوگوں کو ایک بہانہ ہاتھ آگیا جو فرقہ وارانہ منافرت کی آگ بھڑکایا کرتے ہیں۔ بہت ممکن ہے کہ اگر سول نافرمانی روکی نہ جاتی اور حکومت اس تحریک کو سختی سے کچلتی تو شاید فرقہ وارانہ کشیدگی اتنی زیادہ بڑھنے نہ پاتی اور لوگوں میں اتنا بیکار جوش باقی نہ رہتا جس کی وجہ سے آگے چل کر یہ فساد اٹھ کھڑے ہوئے۔

سول نافرمانی بند کرنے سے پہلے ایسا واقعہ پیش آیا جس سے شاید صورت حالت بالکل بدل جاتی۔ تحریک کی پہلی لہر اس زور شور سے اٹھی کہ حکومت حیران اور خوفزدہ ہو گئی۔ اس وقت لارڈ ریڈنگ وائسرائے ہند نے ایک تقریر میں کھلم کھلا اپنی پریشانی کا اعتراف کیا۔ پرنس آف ویلس اس وقت ہندوستان میں تھے اور ان کی موجودگی نے حکومت کی ذمہ داریوں میں اور اضافہ کر دیا تھا۔ دسمبر ۱۹۲۱ء کے آغاز میں کثیر تعداد میں گرفتاریاں ہو چکی تھیں لیکن اس کے بعد ہی حکومت نے یہ کوشش کی کہ کانگریس سے کوئی سمجھوتہ کر لے۔ خاص کر ولیعہد کے کلکتے کے دورے کے خیال سے یہ پیش قدمی کی گئی تھی۔ بہر حال حکومت بنگال کے نمائندوں اور دلش بندھو داس کے درمیان جو اس وقت جیل میں تھے اس سلسلے میں کچھ گفت و شنید ہوئی۔ معلوم ہوتا ہے کہ حکومت اور کانگریس کے درمیان ایک چھوٹی سی گول میز کانفرنس کرنے کی تجویز پیش کی گئی تھی۔ لیکن یہ تجویز وہیں ختم ہو گئی۔ کیونکہ گاندھی جی کو اس پر اصرار رہا کہ مولانا محمد علی جو اس وقت کراچی جیل میں تھے اس کانفرنس میں ضرور شریک ہوں۔

مسٹری۔ آر۔ داس نے گاندھی جی کے اس رویے کو قطعاً ناپسند کیا اور بعد میں جب وہ رہا ہو کر آئے تو انہوں نے کھلم کھلا ان پر اعتراض بھی کیا اور کہا کہ گاندھی جی نے بڑی زبردست غلطی کی۔ ہم میں سے اکثر لوگ جیل میں تھے اس لئے ہمیں تفصیلات معلوم نہیں ہیں اور پورے واقعات معلوم کئے بغیر کوئی فیصلہ کرنا بہت مشکل ہے لیکن بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ اس موقع پر ایسی کانفرنس سے کوئی نتیجہ نکلنے کی امید نہیں تھی۔ اصل میں حکومت کی صرف یہ کوشش تھی کہ ولیعہد کا کلمتہ کا دورہ کسی نہ کسی طرح بخیر و خوبی گذر جائے۔ اس لئے ظاہر ہے کہ اگر کانفرنس ہوتی بھی تو اس سے کوئی فائدہ نہ ہوتا اور جو بنیادی مسائل ہمارے سامنے تھے وہ جوں کے توں رہتے۔ نو سال بعد جب ہماری قوم اور کانگریس دونوں زیادہ قومی تھیں اسی قسم کی کانفرنس ہوئی مگر اس سے کوئی عظیم الشان نتائج حاصل نہیں ہوئے لیکن اس سے قطع نظر کر کے دیکھئے تب بھی مولانا محمد علی کی شرکت پر گاندھی جی کا اصرار میرے نزدیک بالکل درست تھا۔ وہ نہ صرف کانگریس کہ بلکہ تحریک خلافت کے بھی خاص راہنما تھے اور خلافت کا مسئلہ اس زمانے میں کانگریس کے پروا گرم کا اہم جزو تھا اس لئے ان کی موجودگی قطعی ضروری تھی۔ جس حکمت عملی کی خاطر کسی رفیق کار کو نظر انداز کر دیا جائے اسے کبھی صحیح نہ سمجھنا چاہیے۔ جب حکومت انہیں جیل سے رہا کرنے تک کو تیار نہ تھی تو کیا امید ہو سکتی تھی کہ کانفرنس سے کوئی نتیجہ برآمد ہوگا۔

والد پر اور مجھ پر الزام عائد کئے گئے اور مختلف عدالتوں سے ہم دونوں کو چھ چھ مہینے کی سزا ہوئی۔ مقدمے کیا تھے ایک کھیل تھا اور ہم نے اپنے اصول کے مطابق عدالتی کارروائی میں کوئی حصہ نہیں لیا۔ ہماری تقریروں اور دوسری سرگرمیوں میں جیل بھیجنے کے لئے کافی مواد مل سکتا تھا لیکن ہم پر جو الزام عائد کئے گئے وہ بہت دلچسپ تھے۔ دستخط واقعی انہیں کے تھے لیکن اس سے پہلے انہوں نے شاید ہی کبھی ہندی میں دستخط کئے ہوں اس لئے ان کے ہندی دستخطوں کو بہت ہی کم لوگ شناخت کر سکتے

تھے لیکن ایک خستہ حال شخص عدالت میں پیش ہوا جس نے حلفیہ ان دستخطوں کی شناخت کی۔ یہ شخص بالکل ان پڑھ تھا اور شناخت کرتے وقت دستخطوں والا فارم الٹا پکڑے ہوئے تھا۔ میری لڑکی کی عمر اس وقت چار برس کی تھی اور والد اسے گود میں لئے تھے۔ مقدمہ کا تماشہ دیکھنے کا یہ اس کا پہلا موقع تھا۔

مجھ پر یہ الزام تھا کہ میں نے ہڑتال کے اشتہارات تقسیم کئے۔ اس زمانے میں قانوناً یہ کوئی جرم نہیں تھا لیکن اب یہ جرم ہو گیا ہے۔ اس لئے کہ ہم ”درجہ نوآبادیت“ کی طرف تیزی سے قدم بڑھا رہے ہیں! بہر حال مجھے بھی سزا ہو گئی۔ تین مہینے کے بعد مجھے جیل خانے میں جہاں میں اپنے والد اور دوسرے ساتھیوں کے پاس رہتا تھا یہ بتایا گیا کہ کسی نظر ثانی کرنے والی عدالت نے میرے مقدمے پر غور کیا اور اس نتیجے پر پہنچی کہ مجھے غلط سزا دی گئی اس لئے رہا کر دیا جائے۔ مجھے بڑا تعجب ہوا کیونکہ میری طرف سے کسی نے پیروی نہیں کی تھی۔ معلوم ہوتا ہے کہ سول نافرمانی کی التوا نے نظر ثانی کرنے والے ججوں کو نیند سے چونکا دیا تھا۔ بہر حال والد کو جیل خانے میں چھوڑ کر مجھے باہر جانے کا بہت افسوس ہوا۔

میں فوراً گاندھی جی کے پاس احمد آباد جانے کا ارادہ کیا۔ لیکن وہ میرے پہنچنے سے پیشتر ہی گرفتار ہو گئے اور میری ان کی ملاقات ساہی جیل میں ہوئی۔ میں ان کے مقدمے کی پیشی کے وقت موجود تھا۔ یہ بریادگار موقع تھا اور جو لوگ وہاں موجود تھے اسے کبھی بھول نہیں سکتے۔ جج ایک انگریز تھا اور اس نے بڑے وقار و متانت اور ہمدردی سے کام لیا۔ گاندھی جی نے عدالت میں جو بیان دیا اس سے سننے والوں کے دل ہل گئے۔ چنانچہ جب ہم عدالت سے باہر آئے تو ہمارے جذبات میں ایک تلاطم برپا تھا اور ہمارے دلوں پر ان کے سلیس فقرے اور موثر استعارے نقش تھے۔ میں الہ آباد واپس آ گیا۔ چونکہ میرے بہت سے دوست اور ساتھی ابھی جیل میں تھے اس لئے باہر مجھے تنہائی سی محسوس ہوتی تھی اور میرا جی نہیں لگتا تھا۔ کانگریس

کے اداروں میں سے اس وقت ابتری ہو گئی تھی اس لئے میں نے اس کی اصلاح کی طرف توجہ کی اور بدیشی کپڑے کے بائیکاٹ کی خاص طور پر کوشش شروع کر دی۔ سول نافرمانی کے التوا کے باوجود ہمارے پروگرام کا یہی جزو بحال رکھا گیا تھا۔ الہ آباد میں قریب قریب تمام کپڑے کے تاجروں نے یہ قسم کھالی تھی کہ بدیشی کپڑے نہیں منگائیں گے۔ اور اس فیصلے کو عملی جامہ پہنانے کے لئے انہوں نے ایک انجمن قائم کی تھی۔ اس انجمن کے قواعد میں ایک دفعہ یہ بھی تھی کہ جو کوئی اس عہد کو توڑے گا اس پر جرمانہ کیا جائیگا۔ مجھے معلوم ہوا کہ بہت سے بڑے بڑے تاجروں نے اپنا عہد توڑ دیا ہے اور بدیشی کپڑا منگا رہے ہیں۔ یہ گویا ان بے چاروں کے ساتھ بڑی نا انصافی تھی جو اپنے عہد پر قائم تھے۔ ہم نے بہت کچھ کہا سنا لیکن کوئی نتیجہ نہ نکلا۔ اور تاجروں کی دوکانوں پر دھرنا دیا جائے۔ دھرنا دینے کا خیال ظاہر کرنا تھا کہ ہمارا کام بن گیا۔ فوراً جرمانے ادا کئے گئے اور نئے سرے سے قسمیں کھائے گئیں۔ جرمانے کی جو رقم وصول ہوئی وہ تاجروں کی انجمن ہی کو دیدی گئی۔

دو تین دن بعد ہی میں چند ساتھیوں کے ساتھ جوتا جروں سے گفت و شنید کرنے میں میرے شریک تھے پھر گرفتار کر لیا گیا۔ اب ہم پر یہ الزام لگایا کہ ہم تاجروں پر مجرمانہ تشدد کیا اور زبردستی ان سے روپیہ وصول کیا۔ خاص مجھ پر چند اور الزام بھی لگائے گئے تھے جس میں ایک جرم بغاوت بھی تھی۔ میں نے مقدمہ کی پیروی نہیں کی لیکن عدالت میں ایک طویل بیان داخل کیا۔ مجھے تین جرموں کے مواخذے میں سزا ددی گئی جن میں ایک جرم یہ بھی تھا۔ کہ میں نے دوسروں پر تشدد کر کے ان سے زبردستی روپیہ وصول کیا، لیکن بغاوت کا مقدمہ نہیں چلایا گیا۔ شاید یہ سمجھ لیا گیا کہ مجھے کافی سزا مل گئی ہے۔ جہاں تک مجھے یاد ہے، تین مختلف معیادوں کے لئے مجھے سزا ہوئی تھی جن میں دو اٹھارہ اٹھارہ مہینے کی تھیں اور دونوں ایک ساتھ شروع ہوتی تھیں۔ غرض سب ملا کر مجھے پونے دو برس کی سزا ہوئی تھی۔ یہ میری جیل یا تراتھی اور مینس کوئی ڈیڑھ مہینے باہر رہ کر پھر جیل پہنچ گئے۔

لکھنؤ ڈسٹرکٹ جیل

۱۹۲۱ء میں ہندوستان میں سیاسی کاموں کے جرم میں جیل جانا کوئی نئی بات نہیں رہی تھی۔ یوں بھی جب سے تقسیم بنگالہ کے خلاف تحریک شروع ہوئی تھی۔ سیاسی کارکنوں کے جیل جانے کا راستہ کھل گیا تھا اور ان میں سے اکثر کو لمبی لمبی سزائیں ہوتی تھیں۔ عدالت میں باضابطہ مقدمہ چلائے بغیر بھی لوگ نظر بند کردئے جاتے تھے۔ اس وقت کے سب سے بڑے لیڈر لکھنؤ میں ۶ سال کی قید ہوئی تھی۔ جنگ عظیم نے نظر بندیوں اور قیدوں کی یہ رفتار اور تیز کر دی۔ اب سازشوں کے مقدمے بھی اکثر چلنے لگے۔ جن میں عموماً جس دوام یا پھانسی کی سزائیں ہوتی تھیں۔ جنگ کے زمانے میں علی برادران اور مولانا ابوالکلام آزاد بھی نظر بند ہوئے تھے۔ اور جنگ کے بعد ہی پنجاب میں بہت سے لوگ مارشل لا کے شکار ہوئے۔ اکثروں پر سازش کے مقدمے چلائے گئے اور اکثروں کو سرسری میں سزائیں ہوئیں گویا۔ اب ہندوستان میں سیاسی کاموں کے جرم میں جیل جانا معمولی بات ہو گئی تھی۔ لیکن اب تک کوئی شخص اپنی خواہش سے جیل نہیں جاتا تھا۔ لوگوں کو اپنی سرگرمیوں کے سلسلے میں یا محض اس وجہ سے کہ خفیہ پولیس ان سے ناراض ہے سزا ہو جاتی تھی۔ بہر صورت لوگ یہ کوشش کرتے تھے کہ جہاں تک ممکن ہو عدالت میں پیروی کر کے اس سے بچ جائیں۔ البتہ جنوبی افریقہ میں مہاتما گاندھی اور ان کے ہزاروں پیروؤں نے تحریک ستیاگرہ کے سلسلہ میں ایک نئی مثال پیش کی تھی۔

پھر بھی ۱۹۲۱ء تک جیل خانہ ایک ان جان جگہ تھی اور بہت کم لوگوں کو یہ علم تھا کہ لوہے کا ان مہیب پھانکوں کے پیچھے جو نئے مجرم کو نگل جاتے ہیں کیا ہوتا ہے۔ ہمارا گمان تھا کہ جیل کے باسی، بڑے خوفناک لوگ اور خطرناک مجرم ہوتے ہیں۔ جیل کا نام سنتے ہی ہمارے ذہن میں تنہائی، ذلت اور مصیبت کا تصور قائم ہو جاتا تھا اور ان سب سے بڑھ کر ایک بے جانی بوجھی جگہ کا خوف طاری ہو جاتا تھا۔ لیکن ۱۹۲۰ء

کے بعد سے جیل جانے کے اکثر تذکرے ہوا کرتے تھے۔ اس کے علاوہ ہمارے بہت ساتھی وہاں پہنچ بھی گئے تھے اس لئے اب رفتہ رفتہ ہماری طبیعت اس سے مانوس ہوتی جاتی تھی۔ اور جھک اور نفرت کے غیر ارادی جذبے میں کمی ہوتی جاتی تھی۔ لیکن چاہیے۔ ہم پہلے سے اپنے دل کو کتنا ہی مضبوط کر لیں پھر بھی جب پہلے اس پہنی پھاٹک کے اندر قدم رکھتے تو سارے جسم میں ایک عجیب سنسنی اور ہیجان پیدا ہو جاتا تھا۔ ان باتوں کو اب کوئی تیرہ برس گزر چکے ہیں اور میرا خیال ہے کہ ہندوستان کے قریب قریب تین لاکھ مرد اور عورتیں سیاسی جرائم کی پاداش میں (حالانکہ اکثر کو تعزیرات ہند کی دوسری دفعات کے ماتحت سزائیں دی گئیں) ان پھاٹکوں کے اندر ہو آئے ہیں۔ ان میں سے ہزاروں کئی بار گئے اور آئے۔ انہیں اچھی طرح علم ہو گیا کہ اندر کیا ہے۔ انہوں نے اپنے آپ کو اس عجیب زندگی کا عادی بنانے کی بھی کوشش کی، جہاں تک کوئی شخص اس غیر طبعی کوفت اور وحشت کی زندگی کا عادی ہو سکتا ہے۔

ہم اس سے اس طرح مانوس ہو گئے تھے جیسے انسان دنیا کہ ہر چیز سے مانوس ہو جاتا ہے۔ پھر بھی ہر مرتبہ جب ہم پھاٹکوں کے اندر داخل ہوتے تھے، تو ایک حد تک وہی پرانی نظریں سبزہ زاروں، کھلے ہوئے میدانوں، آنے جانے والے راہ گیروں اور سوار یوں اور ان مانوس چہروں کی طرف جو شاید عرصے تک دیکھنے کو نہ ملیں ایک رخصتی نگاہ ڈالنے کے لئے خود بخود اٹھ جاتی تھیں۔

وہ زمانہ میں پہلی مرتبہ جیل گیا اور تین مہینے بعد یکا یک رہا کر دیا گیا تھا۔ ہمارے اور جیل کے عملے، دونوں کے لیے بڑا بیجانی زمانہ تھا۔ ان نئے قسم کے قیدیوں کے ٹوٹ پر نے سے جیل کے افسروں کے ہاتھ پاؤں پھول گئے تھے۔ ان نوواردوں کی تعداد میں بھی آئے دن غیر معمولی اضافہ ہو رہا تھا۔ گویا آسیا معلوم ہوتا تھا کہ ایک طوفان بڑھتا چلا آ رہا ہے، جو اپنی رو میں تمام روایتی حدود کو بہا لے جائے

گا۔ اسے سے زیادہ پریشان کن ان نوواردوں کی نوعیت تھی۔ ان میں ہر طبقے کے لوگ شامل تھے۔ لیکن کثرت اوسط طبقے والوں کی تھی۔ بہر حال ان سب میں ایک چیز مشترک تھی۔ یعنی وہ عام مجرموں سے کیا جاتا تھا۔ افسروں کو بھی یہ تسلیم تھا لیکن مروجہ قانون کے سوا کوئی دوسرے قاعدے موجود نہ تھے۔ نہ اس قسم کا کوئی پچھلا تجربہ اور سابقہ مثال تھی کہ اس کے مطابق عمل کیا جاتا۔ عام طور سے یہ کانگریسی قیدی کچھ زیادہ حلیم اور مسکین نہ تھے۔ اس کے علاوہ جیل میں ان کی اتنی تعداد موجود تھی کہ وہاں بھی انہیں اپنی قوت پرناز تھا۔ باہر کی زبردست ہلچل اور باہر والوں کی جیل کے حالات سے دلچسپی سونے پر سہاگہ تھی باوجود اس کے کہ ہمارا طرز عمل کسی قدر جارحانہ تھا۔ پھر بھی ہمارا عام رویہ یہی تھا کہ جیل کے افسروں کے ساتھ تعاون کیا جائے۔ چنانچہ اگر ہم ان کی مدد نہ کرتے تو شاید ان کی مشکلات اور بڑھ جاتیں۔ پیچارہ جیلر اکثر ہمارے پاس آتا تھا اور ہم سے درخواست کرتا تھا کہ ذرا ان بارکوں میں چلے چلے جہاں آپ کے رضا کار رہتے ہیں اور انہیں سمجھا دیجئے یا کسی بات پر راضی کر دیجئے۔

ہم جیل میں خود اپنی مرضی سے آئے تھے۔ بلکہ بعض رضا کار تو بن بلائے مہمان تھے یعنی زبردستی جیل میں گھس آئے تھے۔ اس لئے ان کے نکل بھاگنے کا کوئی سوال ہی نہ تھا اگر وہ باہر جانا چاہتے تو معافی مانگ کر یا تحریک میں آئندہ کوئی حصہ نہ لینے کا اقرار کر کے آسانی سے نکل سکتے تھے۔ بھاگنے کا بھی نتیجہ وہی ہوتا کہ وہ مقاومت مجہول کی تحریک سے الگ ہو جاتے اور جو رسوائی ہوتی وہ گھائلے میں۔ ہمارے لکھنؤ جیل کے سپرنٹنڈنٹ اس بات کو خوب سمجھتے تھے اس لئے وہ اکثر جیلر سے جنہیں ”خانصاحب“ کا خطاب مل چکا تھا، کہا کرتے تھے کہ اگر تم چند کانگریسی قیدیوں کو نکل بھاگنے پر تیار کر دو تو میں سفارش کر کے تمہیں ”خان بہادر“ کرادوں گا۔

ہمارے بہت سے ساتھی جیل خانے کے اندرونی حصے میں بڑی بڑی بارکوں

میں رکھے گئے۔ ہم میں سے کوئی اٹھارہ شخص شاید کچھ بہتر سلوک کے مستحق سمجھے گئے اس لئے ہمیں ایک پرانے پارچہ بانی کے کارخانے میں جگہ دی گئی جس کے سامنے بہت بڑا صحن بھی تھا۔ والد، میرے دو چچا زاد بھائیوں اور مجھ کو ایک علیحدہ سائبان ملا جو ۲۰ فٹ لمبا اور ۱۲ فٹ چوڑا تھا۔ ہمیں ایک بارک سے دوسری بارک میں جانے کی بھی پوری آزادی تھی۔ ہمارے عزیز واقارب اکثر ہم سے ملنے آتے تھے اور ہمیں اخبار بھی پڑھنے کو ملتے تھے۔ چنانہ نئی نئی گرفتاریوں کی اور تحریک کی غیر معمولی ترقی کی خبریں ہمیں روزانہ ملتی رہتی تھیں اور ان کی وجہ سے ہمارے جوش میں کمی نہ آنے پاتی تھی۔ ہم اپنا زیادہ وقت بحث مباحثہ یا گپ شپ میں گزارتے تھے۔ مجھے پڑھنے لکھنے یا کوئی ٹھوس کام کرنے کا موقع بہت کم ملتا تھا۔ علی الصباح اٹھ کر میں اپنے سارے کمرے کو دھوتا اور صاف کرتا تھا۔ پھر والد کے اور اپنے کپڑے دھوتا تھا اس کے باوجود چرخہ کاتا تھا۔ سردیوں کا زمانہ تھا جو شمالی ہند کا بہترین موسم ہوتا ہے۔ شروع شروع میں ہمیں رضا کاروں کو مدرسہ جاری کرنے کی بھی اجازت مل گئی چنانچہ جو لوگ پڑھے لکھے نہ تھے انہیں ہم اردو، ہندوی اور چند ابتدائی مضامین پڑھاتے تھے اور شام کو والی بال کھیلتے تھے۔ (۱)

رفتہ رفتہ پابندیاں بڑھنا شروع ہوئیں۔ ہمیں اپنے احاطے سے باہر نکلنے کی اور ان بارکوں میں جانے کی جہاں ہمارے رضا کار مقید تھے۔ ممانعت کر دی گئی چنانچہ یہ مدرسہ بھی بند ہو گیا۔ اسی زمانے میں میں رہا ہو گیا۔

میں شروع مارچ میں باہر آیا تھا اور چھ سات ہفتے بعد اپریل میں پھر جیل چلا گیا۔ میں نے دیکھا کہ وہاں کی دنیا ہی بدل گئی ہے۔ والد منی تال کے جیل خانے میں بھیج دئے گئے تھے اور ان کی روگی کے بعد ہی نئے نئے قانون نافذ ہو گئے تھے۔ وہ سب قیدی جو پہلے میرے ساتھ پارچہ بانی کے کارخانے میں رہا کرتے تھے اب جیل کے اندرونی حصے میں منتقل کر دئے گئے تھے اور ان بارکوں میں رہتے تھے جن

میں علیحدہ علیحدہ کمرے نہ تھے بلکہ بڑے بڑے ہال تھے۔ ہر بارک گویا جیل خانے کے اندر ایک اور جیل خانہ تھا اور مختلف جیلوں میں آمد و رفت کی اجازت نہ تھی۔ اب مہینے میں ایک بار عزیزوں سے ملاقات ہو سکتی تھی اور صرف ایک خط آجا سکتا تھا۔ کھانا بھی اب نسبتاً ادنیٰ درجہ کا ملتا تھا لیکن ہمیں اس کی اجازت تھی کہ باہر سے اپنا کھانا منگا لیں۔

جس بارک میں میں تھا اس میں کوئی پچاس آدمی رہتے تھے جگہ کی تنگی کی وجہ سے وہاں بری بھیڑ ہو گئی تھی۔ ہمارے بستر ایک دوسرے سے تین چار فٹ کے فاصلے پر تھے۔ اتفاق سے جتنے آدمی اس بارک میں تھے۔ ان سب کو جانتا تھا۔ اور ان میں سے بعض میرے دوست بھی تھے۔ لیکن دن رات میں کسی وقت تخیلہ میسر نہ آتا رفتہ رفتہ کھلنے لگا۔ ہمیشہ ایک مجمع ہر شخص کو گورتا تھا اور بہت سی چھوٹی تکلیفیں اور ناگواریاں رہا کرتی تھیں۔

جس بارک میں میں تھا اس میں کوئی پچاس آدمی رہتے تھے جگہ کی تنگی کی وجہ سے بڑی بھیڑ ہو گئی تھی۔ ہمارے بستر ایک دوسرے سے تین چار فٹ کے فاصلے پر تھے۔ اتفاق سے جتنے آدمی اس بارک میں تھے۔ میں ان سب کو جانتا تھا۔ اور ان میں سے بعض میرے دوست بھی تھے۔ لیکن دن رات میں کسی وقت تخیلہ میسر نہ آتا رفتہ رفتہ کھلنے لگا۔ ہمیشہ ایک مجمع ہر شخص کو گھورتا تھا اور بہت سی چھوٹی تکلیفیں اور ناگواریاں رہا کرتی تھیں۔ غرض کوئی ایسا پرسکون گوشہ نہ تھا جہاں انسان چند منٹ چین سے بیٹھ سکے۔ ہم سب کے سامنے نہاتے تھے۔ سب کے سامنے اپنے کپڑے دھوتے تھے۔ ورزش کے لئے بارک کے چاروں طرف دوڑا کرتے تھے۔ ہم اس قدر کواں اور بحث کرتے تھے کہ معقول گفتگو کرنے کا دم باقی نہ رہتا تھا اور یہ ہماری خانگی زندگی جس کا دائرہ سینکڑوں گنا وسیع ہو گیا تھا، ایک بے رس اور بے کیف نمونہ تھا جس میں خاندان کی خرابیاں تو سب موجود تھیں لیکن خوبی کوئی نہ تھی اور اس پر طرہ

یہ کہ لوگوں کے مذاق اور خیالات میں بہت اختلاف تھا۔ ہم سب کو اس سے بڑی سخت کوفت ہوتی تھی اور میں اکثر تنہائی کے لئے تڑپا کرتا تھا۔ اس کے بعد تو ایک زمانے میں مجھے جیل خانے میں ایسی تنہائی اور اتنا تخلیہ ملا کہ مہینوں انسان کی صورت دیکھنے کو ترس گیا۔ ہاں کبھی کبھی جیل کا کوئی افسر ضرور آنکلتا تھا۔ اس حالت میں بھی میں بہت پریشان رہتا تھا اور اس وقت یہ تمنا تھی کہ کوئی اچھے ساتھی مل جائیں۔

اس وقت مجھے ۱۹۲۲ء کی لکھنؤ ڈسٹرکٹ جیل کی چہل پہل یاد آتی تھی۔ پھر بھی میں یہ اچھی طرح جانتا تھا کہ ان دونوں میں، میں پرسکون زندگی کو ترجیح ہوں، بشرطیکہ مجھے پڑھنے لکھنے کا موقع ملے۔

پھر بھی ہمارے سب ساتھی بہت مہذب اور دلچسپ لوگ تھے اور مجموعی طور پر ہماری آپس میں خوب نہتی تھی۔ لیکن میرا خیال ہے کہ ہم میں سے ہر ایک کھی کبھی دوسروں سے اکتا جاتا تھا اور چاہتا تھا کہ کچھ دیر کو تنہائی میسر آجائے۔ زیادہ سے زیادہ مجھے اتنا تخلیہ نصیب ہوتا تھا کہ بارک سے نکل کر صحن میں بیٹھ جاؤں۔ اب برسات شروع ہو گئی تھی اور بادل گھرا رہتا تھا اور اکثر اس کا موقع مل جاتا تھا۔ میں گرمی بھی برداشت کرتا تھا اور ہلکی ہلکی پھو ا رہی لیکن جہاں تک ممکن ہوتا تھا بارک کے باہر ہی پڑا رہتا تھا۔

کھلے میدان میں لیٹ کر میں آسمان اور بادلوں کو دیکھا کرتا تھا۔ اس سے پہلے شاید کبھی مجھے اس حد تک یہ احساس نہیں ہوا تھا کہ بادلوں کے بدلتے ہوئے رنگ کس قدر خوش نما معلوم ہوتے ہیں۔

رنگ برنگ بادلوں کا یہ نقشہ جیسے زمین کے مختلف خطے آپس میں گتھے ہوئے ہوں۔ مزے ہیں اس کے جو لیٹا ہوا یہ نظارہ دیکھتا ہوا اور عیش فرصت کو دعائیں دیتا ہو۔

ہمارے لئے یہ فرصت کوئی خوشگوار چیز نہ تھی بلکہ الٹی مصیبت ہوگ تھی لیکن

جتنا وقت میں ان چلتے پھرتے بادلوں کے نظارے میں گزرتا تھا وہ مجھے فرحت و انبساط سے لبریز کر دیتا تھا۔ مجھے اس کی خوشی تھی کہ میں نے اس قید فرنگ سے عارضی چھٹکارا پانے کی ایک نئی ترکیب معلوم کر لی۔ معلوم نہیں اب کی بار برسات نے مجھ پر کیا جادو کر دیا تھا۔ یہ اثر نہ اس سے پہلے کبھی ہوا اور نہ اس کے بعد۔ میں نے پہاڑوں کی چوٹیوں پر اور سمندروں کے کنارے سے سورج کے نکلنے اور ڈوبنے کے سماں اکثر دیکھے تھے۔ میں اس کے نور میں نہایا تھا اور وقتی طور پر اس کی عظمت و جلال سے متاثر بھی ہوا تھا۔ لیکن عموماً ان چیزوں کو معمولی بات سمجھ کر کچھ زیادہ توجہ نہیں کرتا تھا۔ اب جیل میں سورج کے طلوع اور غروب کا منظر دیکھنے کو آنکھیں ترستی تھیں افق ہماری نظروں سے پوشیدہ تھا۔ بہت دن چڑھے جب سورج کی تمازت بڑھ جاتی تھی تو اس کی شعاعیں ہمارے قید خانے کی دیواروں پر نمودار ہوتی تھیں۔ رنگ کہیں دیکھنے میں نہ آتے تھے۔ غرض ہماری آنکھیں روز بروز ہی میا لے رنگ کی دیواریں دیکھتے دیکھتے پتھر اگنی تھیں۔ وہ دھوپ چھاؤں اور رنگوں کی بھوک تھیں۔ اس لئے جب برسات کے بادل قسم قسم کے روپ بدلنے، طرح طرح کے رنگوں سے کھیلے، جھومتے، اٹھلاتے اٹد کر آسمان پر آتے تو میں حیرت اور مسرت سے انہیں دیکھتا اور مجھ پر وجد کا سا عالم ہو جاتا تھا۔ کبھی یہ بادل، کہیں کہیں سے پھٹ جاتے تو ان مے سے وہ حیرت انگیز کرشمہ دکھائی دیتا جو برسات سے مخصوص ہے۔ یعنی گہرے، نیلے رنگ کے اتھاہ سمندر میں حسن لامحدود کی ایک جھلک۔

رفتہ رفتہ ہماری پابندیوں میں اضافہ ہونے لگا۔ اور زیادہ سخت قانون نافذ کئے گئے۔ حکومت کو ہماری تحریک کی اہمیت کا اندازہ ہو گیا تھا اس لئے وہ چاہتی تھی کہ ہم پر دل کھول کر غصہ اتارے اور ہمیں اس گستاخی کا مزہ چکھائے کہ ہم نے اس کے مقابلے کی جرات کی۔ ان نئے قوانین اور ان کے نفاذ کے طریقوں کا یہ لازمی نتیجہ ہوا کہ اکثر جیل کے افسروں اور سیاسی قیدیوں میں ان بن ہو گئی۔ کئی مہینے تک ہم سب

نے جن کی تعداد لکھنؤ جیل میں کئی سو کے قریب ہو گئی، احتجاج کے طور پر عزیز و اقارب سے ملاقات کرنا بند کر دیا۔ افسروں کا یہ خیال تھا کہ ہم میں سے چند آدمی فساد کی جڑ ہیں۔ اس لئے سات اشخاص اصل بارکوں سے دور جیل کے ایک بالکل علیحدہ حصے میں بھیج دیئے گئے۔ یعنی پرشوتم داس ٹنڈن مہادیو ڈیسائی، جارج جوزف، بال کرشن شرما، دیوداس گاندھی، میں اور ایک اور شخص۔

ہم ایک چھوٹے سے احاطے میں رکھے گئے۔ یہاں کچھ تکلیف ضرور تھی، لیکن مجموعی طور پر میں اس سے بہت خوش ہوا۔ کیونکہ یہاں کم سے کم وہ بھیڑ بھاڑ نہیں تھی اور ہمیں کچھ زیادہ سکون اور تخیلے میسر آ سکتا تھا۔ اب پڑھنے لکھنے اور دوسرے ضوی کام کرنے کو بھی کافی وقت ملتا تھا۔ جیل کے دوسرے ساتھیوں سے ہمارا کوئی تعلق باقی نہ رہا تھا۔ نہ باہر کی دناے کا کوئی حال معلوم ہوتا تھا، کیونکہ اب تمام سیاسی قیدیوں کو اخبار ماننا بند ہو گئے تھے۔

اخبار تو ہمارے پاس نہیں آتے تھے لیکن جس طرح ہمیشہ جیل میں باہر کی خبریں پہنچا کرتی ہیں ہمیں بھی کچھ نہ کچھ خبریں مل ہی جاتی تھیں۔ ہر مہینے جو ملاقاتیں ہوتی تھیں یا جو خطوط آتے تھے ان سے بھی تھوڑا بہت حال معلوم ہو جاتا تھا۔ ہمارا اندازہ تھا کہ اب تحریک کا زور گھٹ رہا ہے۔ وقتی جوش کا ظلم ٹوٹ چکا تھا اور دور منزل مقصود دور ہٹی معلوم ہوتی تھی۔ کانگریس کے دو ٹکڑے ہو چکے تھے۔ ایک جماعت طریق کار میں تبدیلی چاہتی تھی اور دوسری اس تبدیلی کی مخالف تھی۔ تبدیلی کے حامیوں کی رہبری دلش بندھو داس اور میرے والد کر رہے تھے۔ یہ جماعت چاہتی تھی کہ اسمبلی اور کونسلوں کے نئے انتخاب میں کانگریس بھی حصہ لے اور اگر ممکن ہو تو ان پر قبضہ کر لے۔ دوسری جماعت کی رہنمائی سری راج گوپال اچریہ فرما رہے تھے۔ یہ جماعت ترک موالات کے اصل پروگرام کوئی ترمیم گورا کرنے کو تیار نہ تھی۔ گاندھی جی اس وقت جیل میں تھے۔ تحریک کے وہ زریں اصول جنہوں نے ہمیں

سیلاب کی طرح آگے بڑھایا تھا اب چھوٹے چھوٹے جھڑے قضیوں اور اقتدار حاصل کرنے کی سازشوں سے آلودہ ہو رہے تھے۔ ہمیں اندازہ ہوا کہ جوش و خروش کی رو میں بڑے بڑے من چلے پن کے کام کر گزرنا کتنا آسان ہے۔ اور جب یہ ندی اتر جائے تو مستقل طور پر کام کو جاری رکھنا کتنا مشکل ہے۔ باہر سے جو خبریں آتی تھیں ان سے ہم میں بے دلی پھیلی ہوئی تھی اور پھر اس جڑ جڑے پن کی وجہ سے جو جیل میں رہنے کی وجہ سے پیدا ہو جاتی ہے۔ ہماری مشکلات اور بڑھ گئیں تھیں۔ پھر بھی ہمارے دل کو یہ اطمینان تھا کہ ہم نے خوداری اور وقار کو ہاتھ سے نہیں دیا۔ اور چاہے کچھ بھی ہوا ہم راہ راست سے نہیں بھٹکے۔ مستقبل دھندلا نظر آتا تھا اور چاہے وہ کوئی شکل اختیار کرے یا بات یقینی تھی کہ ہم میں سے اکثر کی قسمت میں اپنی زندگی کا بیشتر حصہ جیل میں گزارنا لکھا ہے۔ آپس میں ہم یہی باتیں کیا کرتے تھے۔ مجھے یاد ہے کہ ایک مرتبہ جارج جوزف سے اسی قسم کی گفتگو ہوئی تھی اور ہم اس نتیجے پر پہنچے تھے۔ اب تو جوزف میں زمین و آسمان کا فرق ہو گیا ہے اور وہ ہماری تحریک کی دل کھول کر مخالفت کر رہے ہیں۔ معلوم نہیں کبھی انہیں وہ گفتگو بھی یاد آتی ہے جو لکھنؤ ڈسٹرکٹ جیل کے سول وارڈ میں ایک دفعہ مجھ میں اور ان میں ہوئی تھی؟

غرض ہم روزمرہ کے معمولی کاموں اور ورزشوں سے دل بہلاتے تھے۔ ورزش کی یہ صورت تھی کہ اپنے چھوٹے سے احاطے میں چاروں طرف دوڑ لگایا کرتے تھے یا اپنے صحن کے کنوئیں سے دو دو آدمی بیلوں کی طرح جٹ کر چرس سے پانی کھینچتے تھے اور ترکاریوں کے کھیت کو جو ہمارے صحن میں تھا سینچتے تھے۔ ہم میں سے اکثر روزانہ تھوڑا بہت سوت بھی کاتتے تھے۔ لیکن ان سردی کے دنوں اور لمبی لمبی راتوں میں میرا خاص شغل کتابیں پڑھنا تھا۔ جب کبھی سپرنٹنڈنٹ آتا، ہمیشہ مجھے پڑھتے ہوئے پاتا۔ شاید وہ اس سے کچھ کھسیا گیا چنانچہ ایک مرتبہ اس نے مجھ پر فقرہ کسا اور کہا کہ میں تو اپنا تمام مطالعہ بارہ برس کی عمر ہی میں ختم کر چکا تھا۔ شاید پڑھنے

سے یہ گریز ہی اس بہادر انگریز کرنل کے کام آیا اور اس نے اس پریشان کن خیالات سے بچالیا۔ اور شاید اسی کی بدولت وہ صوبہ متحدہ میں جیل خانوں کے انسپکٹر جنرل کے عہدے تک پہنچا۔

جاڑے کی راتیں پہاڑی ہوتی ہیں اور اس زمانے میں ہندوستان میں مطلع بہت صاف ہوتا ہے چنانچہ ہمیں ستارے دیکھنے کا شوق ہو گیا۔ بعض نقشوں کی مدد سے ہم نے بہت سے ستاروں کو پہچان لیا۔ پھر تو رات ہم ان کے نکلنے کا انتظار کیا کرتے تھے اور ان کا اس مسرت کے ساتھ خیر مقدم کرتے تھے۔ جیسے کوئی اپنے بچھڑے ہوئے دوستوں سے ملتا ہے۔

اس طرح ہمارا وقت گزر رہا تھا۔ دونوں کے ہفتے اور ہفتوں کے مہینے ہوتے جاتے تھے۔ ہم روز کی مقررہ زندگی کے عادی ہو گئے تھے۔ لیکن باہر سارا بوجھ ہماری عورتوں پر، ہماری ماؤں، بیویوں اور بہنوں پر پڑ گیا تھا۔ وہ ہمارا انتظار کرتے کرتے اکتا گئی تھیں اور انہیں خود اپنی آزادی پر شرم معلوم ہوتی تھی جبکہ ان کے پیارے جیل خانے کی آہنی سلاخوں میں بند تھے۔

دسمبر ۱۹۴۱ء میں ہماری پہلی گرفتاری کے بعد ہی پولیس نے آئند بھون کے چکر لگانا شروع کر دیئے۔ والد پر اور مجھ پر عدالت سے کچھ جرمانہ بھی ہوا تھا وہ اسی کو وصول کرنے آتی تھی۔ لیکن کانگریس کا حکم یہ تھا کہ جرمانہ ادا نہ کیا جائے۔ اس لئے پولیس آئے دن آدھمکتی تھی۔ اور فرنیچر میں سے جو کچھ ہاتھ لگتا وہ قرق کر کے لے جاتی تھی۔ میری لڑکی اندر اس وقت چار سال کی تھی۔ اسے روز کی اس لوٹ مار پر بڑا غصہ آیا۔ چنانچہ اس نے پولیس والوں کے سامنے سخت احتجاج کیا اور ان پر بہت بگڑی۔ مجھے اندیشہ ہے کہ اس کے یہ ابتدائی تاثرات ہمیشہ کے لئے اسے ساری پولیس سے بدظن کر دیں گے۔

اس کے انتہائی کوشش کی جاتی تھی کہ ہم غیر سیاسی قیدیوں سے نہ ملنے پائیں

اس لئے سیاسی قیدیوں کے لئے خاص جیل مخصوص تھی۔ لیکن کبھی نہ کبھی یہ قیدی ہمیں مل جاتے تھے۔ ہمیں براہ راست بھی اور ان قیدیوں کے ذریعے سے بھی جیل کی زندگی کی حقیقت معلوم ہوا۔ یہ گویا تشدد، لوٹ مار اور بد اخلاقیوں کی ایک درد ناک داستان تھی۔ کھانا بھی انہیں بہت خراب ملتا تھا۔ میں نے خود بارہا یہ کھانا منگا کر کھانے کی کوشش کی اور اس نتیجے پر پہنچا کہ یہ کسی طرح انسانوں کے کھانے کے قابل نہ تھا۔ عملہ عموماً نا اہل تھا اور اسے بہت تھوڑی تنخواہ ملتی تھی۔ لیکن جب موقع ملتا تھا وہ قیدیوں اور ان کی رشتہ داروں سے کچھ نہ کچھ وصول کر کے اپنی آمدنی کی کمی کو پورا کرنے کی کوشش کرتا تھا۔ جیل مینوئل میں جیلر، نائب جیلر اور وارڈروں کی جو ذمہ داریاں اور فرائض درج تھے وہ تعداد مے اتنے زیادہ اور نوعیت میں اتنے مختلف تھے کہ کوئی انسان پوری طرح ان کی پابندی نہیں کر سکتا تھا اور شاید دوسرے صوبوں میں بھی جیل کی انتظامی پالیسی کو قیدیوں کی اصلاح سے یا ان کو نیکی کی تلقین کرنے اور کارآمد پیشہ سکھانے سے کوئی تعلق نہ تھا۔ جیل میں محض قیدیوں کو ستانے کے خیال سے مشقت لی جاتی تھی۔ (۲)

دراصل قیدی کو خوفزدہ کرنا اور اس سے بے چون و چرا تابعداری کرنا مقصود تھا تا کہ وہ دل میں جیل کی دہشت لے کر واپس جائے اور آئندہ قید کے ڈر سے پھر کسی جرم کا مرتکب نہ ہو۔

اب چند سال سے جیل کے حالات میں کچھ اصلاح ہوئی ہے کھانا اور کپڑا بھی کچھ بہتر ملتا ہے اور دوسری باتوں میں بھی کسی قدر فرق ہو گیا ہے۔ اس کی خاص وجہ یہ ہوئی کہ جو سیاسی قیدی رہا ہو کر باہر آئے انہوں نے ان ناگفتہ بہ حالات کے خلا سخت جدوجہد کی۔ ترک موالات کی وجہ سے وارڈروں کی تنخواہوں میں بھی اضافہ ہو گیا تا کہ وہ سرکار کے اور زیادہ وفادار رہیں۔ اب لڑکوں اور نو عمر قیدیوں کو لکھنا پڑھنا سکھانے کی کچھ یوں ہی سی کوشش بھی کی جاتی ہے۔ یہ تمام اصلاحیں غنیمت ہیں مگر

ان سے کوئی نتیجہ برآمد نہیں ہو سکتا کیونکہ روح تو اب تک وہی موجود ہے۔

زیادہ تر سیاسی قیدیوں کے ساتھ عام قیدیوں کا سا سلوک کیا جاتا تھا۔ انہیں کوئی خاص رعایتیں حاصل نہ تھیں، نہ وہ کسی خاص سلوک کے مستحق قرار دئے گئے تھے لیکن چونکہ وہ عام قیدیوں سے زیادہ سمجھ دار اور دلیر تھے اس لئے ان سے کوئی ناجائز فائدہ نہیں اٹھایا جاسکتا تھا اور نہ ان سے جا بے جا روپیہ وصول کیا جاسکتا تھا۔ اس کا نتیجہ یہ تھا کہ سارا عملہ ان سے بغض رکھتا تھا اور جب موقع ملتا تھا جیل کے ضابطوں کی ذرا سی خلاف ورزی پر انہیں سخت سے سخت سزائیں دی جاتی تھیں۔ کسی قسم کی معمولی سی لغزش پر ایک پندرہ سولہ برس کے لڑکے کو جو اپنے آپ کو آزاد کہتا تھا کوڑے لگانے کی سزا دی گئی۔ ج اسے ننگا کر کے ٹکلی سے باندھا گیا اور کوڑے پڑنا شروع ہوئے تو ہر کوڑے پر وہ ”مہاتما گاندھی کی بے“ کا نعرہ لگاتا تھا۔ ہر بار جب کوڑا اس کی کھال میں پیوست ہو کر نکلتا تھا اور خون کا فوارہ چھوٹتا تھا تو اس کی زبان سے یہی نعرہ نکلتا تھا۔ یہاں تک کہ وہ بے ہوش ہو کر گر گیا۔ بعد کو یہ لڑکا شمالی ہند کی تحریف پسندوں کا سرگردہ بن گیا۔

(۱) ایک بالکل لغو قصہ اخباروں میں نکلا تھا اور تردید ہو جانے کے باوجود اکثر شائع ہوتا رہتا ہے۔ وہ یہ کہ سر ہارکورت بلر، کورزیو۔ پی نے والد کو نیل میں شامپین کی بوتلیں بھیجی تھیں۔ یہ محض غلط ہے۔ سر ہارکورت نے والد کو کبھی کوئی چیز جیل میں نہیں بھیجی۔ نہ کبھی کسی شخص نے شامپین یا کسی اور قسم کی شراب بھیجی۔ جب ۱۹۲۰ء میں کانگریس نے ترک موالات کا اصول اختیار کیا اسی وقت سے والد نے شراب چھوڑ دی تھی اور اس زمانے میں وہ قطعاً ناک شراب تھے۔

(۲) یو پی جیل مینوئل کا دفعہ ۹۸۷ جسے اب نئے ایڈیشن سے حذف کر دیا ہے یہ

تھا کہ:-

”جیل کی مشقت کا مقصد قیدیوں کو محض کام میں لگائے رکھنا ہے بلکہ اس کا اصل مقصد سزا دینا ہے۔ اس لئے اس چیز کو کوئی اہمیت نہ دینا چاہیے کہ ان سے ایسے کام لئے جائیں جن سے آمدنی کافی ہو بلکہ خاص طور پر یہ لحاظ رکھنا یہ لحاظ رکھنا چاہیے کہ جیل میں

مشقت اتنی دشوار اور ناتاہل برداشت ہو کہ مجرم اس سے ڈریں۔“
 اس کے مقابلے میں ذرا روستی تعزیرات کے چند دفعات ملاحظہ کیجئے۔
 دفعہ ۹۔ سماجی مدافعت کے قوانین کا یہ مقصد نہیں ہے کہ لوگوں کو جسمانی تکلیف پہنچائی جائے یا انسانوں کو ذلیل کیا جائے یا انتقام لیا جائے اور سزا دی جائے۔
 دفعہ ۲۶ سزائیں سماجی مدافعت کا ایک ذریعہ ہیں اس لئے ان میں ظلم کا شائبہ بھی نہیں ہونا چاہیے اور مجرم کو غیر ضروری اور نامناسب تکلیف نہ پہنچانا چاہیے۔



دوبارہ رہائی

جیل میں انسان کو اکثر چیزوں کی کمی محسوس ہوتی ہے لیکن شاید سب سے زیادہ عورتوں کی نرم آواز اور بچوں کے معصوم قہقہوں کو ترستا ہے۔ یہاں عموماً جو آوازیں کانوں میں پڑتی ہیں وہ کچھ خوش گوار نہیں ہوتیں۔ لوگوں کا لہجہ درشت اور تحکمانہ ہوتا ہے اور زبان وحشیانہ جس میں گالیوں کی بھرمار ہوتی ہے۔ ایک مرتبہ تو ایک عجیب خواہش کا احساس ہوا۔ یعنی لکھنؤ ڈسٹرکٹ جیل میں یکا یک مجھے یہ خیال آیا کہ سات آٹھ مہینے سے میں نے کتے کے بھونکنے کی آواز نہیں سنی ہے۔

۱۳ جنوری ۲۲ء کو لکھنؤ جیل کے سارے سیاسی قیدی رہا کر دئے گئے۔ اس وقت لکھنؤ میں اسپیشل کلاس کے قیدیوں کی تعداد سو اور دوسو کے درمیان ہوگی۔ جن لوگوں کو ۲۱ء کے آخر یا ۲۲ء کے شروع میں کم وہ بیش ایک سال کی سزا ہوئی تھی۔ وہ اپنی معیاد پوری کر رہے رہا ہو چکے تھے۔ البتہ جن کی لمبی سزائیں تھیں یا جو دوبارہ سزا یاب ہوئے تھے وہ باقی تھے ہمیں اس اچانک رہائی پر حیرت ہو گئی کیونکہ عام معافی کا کوئی تذکرہ سننے میں نہ آیا تھا۔ البتہ صوبہ متحدہ کی کونسل نے یہ قرارداد منظور کی تھی کہ تمام سیاسی قیدیوں کو فوراً آزاد کر دیا جائے لیکن ہم جانتے تھے کہ حکومت کب اس قسم کے مطالبوں کی پروا کرتی ہے۔ ہوا یہ کہ خود حکومت نے اس موقع کو غنیمت سمجھا۔ کانگریس اس وقت حکومت کے خلاف کوئی کارروائی نہیں کر رہی تھی اور کانگریسی خود آپس میں دست و گریباں تھے۔ اس کے علاوہ اکثر مشہور لیڈر رہا ہو چکے تھے۔ اسلئے یہ مہربانی کی گئی۔

جیل کے پھاٹک سے باہر نکل کر ہر انسان کو اطمینان اور مسرت کا احساس ہوتا ہے تازہ وا اور کھلے میدان، سڑکوں کی چہل پہل، پچھڑے ہوئے دوستوں سے ملاقات۔ ان سب چیزوں سے مل ملا کر ایک نشہ سا ہوجاتا ہے۔ اور پہلے اس کی حرکتیں حقان کے مریض کی سی ہوتی ہیں۔ ہم پر بھی یہ کیفیت طاری ہوئی۔ لیکن

زیادہ دیر تک نہیں رہی کیونکہ اس وقت کانگریس کی سیاست بہت بری حالت میں تھی۔ اعلیٰ مقاصد کے بجائے سازشوں کا دور دورہ تھا اور مختلف گروہ اس کوشش میں تھے کہ کانگریس کا سارا نظام ہمارے ہاتھ میں آجائے۔ اس مقصد کے لئے وہ ایسے ناروا طریقے استعمال کر رہے تھے جس کی وجہ سے حساس لوگ سیاست کے نام سے گھبراتے ہیں۔

میں خود داخلہ کونسل کے قطعاً خلاف تھا کیونکہ میری نظر میں اس کا یہ نتیجہ ہونے والا تھا کہ ہم خواہ مخواہ سمجھوتوں پر اتر آئیں گے اور ہمارا اصل مقصد رفتہ رفتہ ختم ہو جائے گا۔ لیکن حقیقت میں اس وقت ملک کے سامنے کوئی دوسرا سیاسی پروگرام ہی نہ تھا۔ تبدیلی کے مخالف ” تعمیر کا م “ پر زور دیتے تھے۔ یہ حقیقت میں سماجی اصلاح کا پروگرام تھا اور اس میں سب سے بڑی خوبی یہ تھی کہ ہمارے کارکنوں کو عام لوگوں سے میل جول کا موقع ملتا تھا لیکن اس سے وہ لوگ مطمئن نہ ہو سکتے تھے، جو عملی سیاست کے قائل تھے۔ عملی احتجاج کی تحریک کو بھی اس کے بانیوں یعنی دلش بندھو داس اور میرے والد نے حکومت کے راستے میں رکاوٹیں ڈالنے اور اس کی مخالفت کرنے کی شکل میں اٹھایا تھا تعاون اور تعمیر کی حیثیت سے نہیں۔

مسٹری۔ آر۔ داس ہمیشہ سے داخلہ کونسل کے حامی تھے تاکہ اس محاذ سے بھی قومی جنگ لڑی جاسکے۔ میرے والد کی بھی یہی رائے تھی۔ ۱۹۳۰ء میں جو انہوں نے کونسلوں کا بائیکاٹ کرنا منظور کر لیا تھا اس کی ایک وجہ یہ تھی کہ وہ اپنے آپ کو گاندھی جی کی رائے کا تابع کر دینا چاہتے تھے۔ وہ چاہتے تھے کہ جنگ میں پوری طاقت سے شریک ہوں اور اس کی صورت صرف یہی تھی کہ وہ گاندھی جی کے نظریہ کو حرف بہ حرف قبول کر لیں۔ اس وقت سن فین جماعت کی مثال ہمارے سامنے تھی کہ اس نے دارالعلوم کی نشوونما پر قبضہ کر کے وہاں جانے سے انکار کر دیا۔ ہمارے اکثر نوجوان اس سے متاثر تھے۔ مجھے یاد ہے کہ میں نے ۱۹۲۰ء میں گاندھی جی سے کہا تھا

کہ بائیکاٹ کا یہی طریقہ اختیار کیا جائے۔ ان معاملات میں وہ بہت سخت ہیں۔ مولانا محمد علی اس وقت خلافت کا وفد لے کر یورپ گئے تھے۔ واپسی پر انہوں نے بائیکاٹ کے طریقہ کو پسند نہ کیا اور فرمایا کہ میں تو سن فین جماعت کا رویہ بہتر سمجھتا ہوں۔ لیکن اس معاملے میں دوسروں کی رائے کوئی اہمیت نہیں رکھتی تھی اس لئے کہ ہونا وہی تھا جو گاندھی جی چاہتے تھے۔ وہ تحریک کے بانی تھے اس لئے عام طور پر یہ خیال تھا کہ جزویات کے معاملے میں انہیں پوری آزادی ملنی چاہیے۔ سن فین طریقے پر ان کا خاص اعتراض یہ تھا کہ اس سے قطع نظر کہ وہ تشدد کے حامی ہیں (عوام جس خوبی سے بائیکاٹ کو اور ووٹ نہ دینے کے مفہوم کو سمجھ سکیں گے۔ اس طرح سن فین طریقہ ان کی سمجھ میں نہ آئے گا۔ اگر ہم اپنے آپ کو منتخب کرا کے پھر کونسل میں نہ جائیں گے تو اس سے عوام کے ذہن میں ایک الجھن سی پیدا ہوگئی۔ دوسرے یہ کہ اگر ایک مرتبہ ہمارے آدمی منتخب ہو جائیں گے تو پھر انہیں کونسلوں سے لگاؤ پیدا ہو جائے گا اور وہ انہیں مشکل سے چھوڑ سکیں گے۔ ہماری تحریک میں ابھی نہ تو اتنا انضباط ہے نہ اسے اتنی قوت حاصل ہے کہ انہیں زیادہ عرصے تک کونسلوں میں جانے سے روکا جاسکے۔ اس لئے کونسلوں کے ذریعے حکومت کی سرپرستی حاصل کرنے کے لئے بہت سے بالواسطہ اور بلاواسطہ طریقے استعمال کئے جائیں گے۔ جن سے ہماری اخلاقی حالت پر بڑا برا اثر پڑے گا۔

یہ دلائل بہت دقیع تھے اور ۱۹۲۵ء و ۱۹۲۶ء میں جب سوراج پارٹی کونسلوں میں گئی تو ہم نے دیکھا کہ گاندھی جی کا خیال بہت کچھ صحیح ثابت ہوا۔ پھر بھی یہ خیال آتا ہے کہ اگر واقعی ۱۹۲۰ء میں کانگریس نے کونسلوں پر قبضہ کرنے کا فیصلہ کر لیا ہوتا تو معاملات کیا صورت اختیار کرتے۔ چونکہ اس وقت کانگریس کو خلافت کمیٹی کی حمایت بھی حاصل تھی اس لئے اس میں کوئی شک نہیں کہ اسمبلی اور کونسلوں کی قریب قریب تمام انتخابی نشستوں پر قبضہ ہو جاتا۔ اب (اگست ۱۹۳۲ء میں) پھر یہ تجویز ہو

رہی ہے کہ اسمبلی کے انتخابات میں کانگریس کی طرف سے امیدوار کھڑے کئے جائیں۔ چنانچہ پارلیمنٹری بورڈ قائم ہو گیا لیکن ۱۹۲۰ء کے بعد سے ایسے ایسے واقعات پیش آچکے ہیں کہ ہمارے سماجی اور سیاسی اتحاد میں بہت سے رخنے پیدا ہو گئے ہیں۔ اس لئے ۱۹۲۰ء میں جتنی کامیابی کی امید ہو سکتی تھی۔ آئندہ انتخابات میں وہ بات حاصل نہیں ہو سکتی۔

جیل سے رہا ہونے کے بعد میں نے بعض دوسرے حضرات کے ساتھ مل کر دونوں فریقوں میں سمجھوتا کرانے کی کوشش کی لیکن ہمیں بہت کم کامیابی ہوئی اور میں تغیر کے حامیوں اور مخالفوں کے جھگڑوں سے عاجز آ گیا۔ یو۔ پی کانگریس کمیٹی کے سیکرٹری کی حیثیت سے میں کانگریس کی تنظیم میں مصروف ہو گیا۔ سال گزشتہ کانگریس میں جو انتشار پیدا ہو گیا تھا اس کی وجہ سے بہت کچھ کام کرنے کو تھا۔ اس لئے میں نے بہت سخت محنت کی، لیکن کوئی خاص نتیجہ برآمد نہیں ہوا۔ ان دنوں کوئی خاص کام نہ ہونے کی وجہ سے میں کچھ پریشان سا تھا کہ یکا یک ایک نیا میدان میرے سامنے آ گیا۔ رہائی کے چند ہفتے کے اندر ہی میں الہ آباد میونسپلٹی کا صدر بنا دیا گیا۔ یہ انتخاب بالکل غیر متوقع تھا کیونکہ انتخاب سے ۴۵ منٹ پہلے تک میرا نام پیش نہیں ہوا تھا۔ بلکہ شاید کسی کو اس کا خیال نہ تھا۔ بالکل آخری وقت میں کانگریس پارٹی نے یہ اندازہ کیا کہ کانگریسیوں میں صرف مجھی کو کامیابی حاصل ہو سکتی ہے لہذا انہوں نے میرا نام پیش کر دیا۔ اور میں منتخب ہو گیا۔

اس سال اتفاق سے تمام ملک میں مشہور مشہور کانگریسی میونسپلٹی کے صدر ہوئے۔ مسٹری۔ آر۔ داس کلکتہ کارپوریشن کے پہلے میئر منتخب ہوئے۔ مسٹر وٹھل بھائی ٹیل بمبئی کارپوریشن کے صدر ہوئے اور سردار ولہ بھائی ٹیل احمد میونسپلٹی کے۔ یوپی میں بھی کانگریسی تمام بڑی بڑی میونسپلٹیوں کے صدر ہو گئے۔

اب مختلف قسم کے بلدیاتی کاموں سے مجھے دلچسپی ہونے لگی اور میں روز بروز

اس میں زیادہ وقت دینے لگا۔ ساکے بعض پہلوؤں سے تو مجھے ایک خاص شغف ہو گیا تھا۔ میں نے اس موضوع کا اچھی طرح مطالعہ کیا اور میرے دل میں یہ تمنا پیدا ہوئی کہ شہر کے انتظام میں اصلاحیں کرنا چاہیے۔ بلع میں مجھے اندازہ ہوا کہ بالفعل ہندوستانی میونسپلٹیوں کا نظام کچھ ایسا ہے کہ بڑی اصلاحیں کرنے اور اولو العزمی دکھانے کی گنجائش ہی نہیں ہے۔ پھر بھی کچھ نہ کچھ کام کرنے کا موقع ضرور تھا۔ یعنی یہ کوشش ہو سکتی تھی کہ اس مشین کے پروازوں کی صفائی کر دی جائے تاکہ اس کی رفتار تیز ہو جائے۔ اسی خیال سے میں نے خاصی محنت کی۔ اس زمانے میں میری کانگریس کی مصروفیت بھی بڑھنے لگی اور صوبہ کانگریس کمیٹی کے سیکرٹری ہونے کے علاوہ میں آل انڈیا کانگریس کمیٹی کا سیکرٹری بھی بنادیا گیا۔ ان فرائض کے ادا کرنے میں اکثر مجھے روزانہ پندرہ گھنٹے تک کام کرنا پڑتا تھا۔ اور جب رات گئے میں کام ختم کرتا تھا تو تھک کر چور ہو جاتا تھا۔

جیل سے واپس آنے کے بعد سب سے پہلا خط جو میری نظر سے گزرا وہ الہ آباد ہائی کورٹ کے چیف جسٹس سرگرم ووڈمنس اک تھا۔ یہ خط میری رہائی سے پہلے کا لکھا ہوا تھا۔ لیکن غالباً اس وقت انہیں یہ علم ہو چکا تھا کہ میں عنقریب رہا کر دیا جاؤں گا۔ انہوں نے بڑے شفقت آمیز الفاظ میں یہ خط لکھا تھا اور مجھے یہ دعوت دی تھی کہ میں کبھی ان سے ملا کروں۔ مجھے ان کا یہ رویہ دیکھ کر تھوڑی سی حیرت ہوئی کیونکہ میں ان سے بہت کم واقف تھا۔ وہ ۱۹۱۹ء میں اس وقت الہ آباد آئے تھے جبکہ وہ وکالت چھوڑتا جا رہا تھا۔ میرا خیال ہے کہ میں نے صرف ایک مقدمے میں ان کے سامنے بحث کی تھی اور ہائی کورٹ میں یہ میرا آخری مقدمہ تھا۔ کسی وجہ سے انہیں مجھ سے غائبانہ دلچسپی ہو گئی۔ بعد میں انہوں نے مجھے بتایا کہ ان کا خیال تھا کہ میں انتہا پسند ہو جاؤں گا۔ اس لئے وہ مجھ پر اتنا اثر رکھنا چاہتے تھے کہ میں برطانوی نقطہ نظر کو سمجھ سکوں۔ ترکیب تو انہیں خوب سوجھی تھی۔ بہت سے انگریزوں کی طرح

ان کی بھی یہ رائے تھی کہ ہندوستان کے اکثر انتہا پسند محض اس وجہ سے برطانیہ کے مخالف ہو گئے ہیں کہ معاشی حیثیت، سے انگریز ان کے ساتھ برا سلوک کرتے ہیں۔ اس کی وجہ سے رنجش اور کشیدگی پیدا ہوتی ہے اور رفتہ رفتہ وہ انتہا پسند بن جاتے ہیں۔ یہ قصہ بھی مشہور ہے اور ذمہ دار حضرات کی زبان سے سنا گیا ہے کہ والد انگریزوں کے ایک کلب میں داخل نہیں کئے تھے اس لئے وہ انتہا پسند اور برطانیہ کے مخالف ہو گئے۔ یہ محض بے بنیاد فسانہ ہے اور دراصل ایک دوسرا واقعہ توڑ مروڑ کر اس طرح پیش کر دیا گیا ہے۔ لیکن ان روایات سے چاہے وہ صحیح ہوں یا غلط اکثر انگریز یقین کر لیتے ہیں کہ ہونہ ہو قومی تحریک اور برطانیہ کے خلاف اشتعال کی یہی وجہ ہے۔ سچ پوچھئے تو نہ والد کو اور نہ مجھے انگریزوں سے اس قسم کی کوئی شکایت پیدا ہوئی۔ انفرادی حیثیت سے انگریز ہمیشہ ہم سے بڑے اخلاق سے پیش آئے اور ہمارے ان سے بہت اچھے مرسم رہے۔ اگرچہ اس میں بھی کوئی شک نہیں کہ ہندوستانی کی حیثیت سے ہمیشہ یہ خیال ہمیں ستات تھا کہ ہماری قوم ان کی محکوم ہے۔ سچ پوچھئے تو اب بھی انگریزوں سے میری خوب نہتی ہے سوا سرکاری افسروں کے جو مجھ پر رعب جمانا چاہتے ہیں۔ بلکہ اس میں بھی ایک تفریح کا پہلو ہوتا ہے۔ میرا خیال ہے کہ شاید انگریزوں سے میں اتنا دور نہیں ہوں جتنے لبرل حضرات یا اور بزرگ جو ہندوستان میں انگریزوں سے سیاسی تعاون کرتے ہیں۔

سرگرم ووڈ کا مقصد یہ تھا کہ دوستانہ مراسم، صاف گوئی اور خوش اخلاقی سے کام لے کر رنجش کی آہل بنا کو دور کر دیں۔ میں ان سے اکثر ملتا تھا اور وہ بھی کسی میونسپل ٹیکس کے خلاف احتجاج کرنے کے بہانے سے میرے پاس آتے تھے اور دوسرے مسائل پر گفتگو کرتے تھے۔ ایک بار تو انہوں نے ہندوستانی لبرلوں کو خوب کھری سنائیں اور کہا کہ وہ نرے موم کی ناک، بے پیندے کے برتن، اور ہوا کے رخ پر چلنے والے ہیں بلکہ ان کے الفاظ اس سے زیادہ سخت اور حقارت آمیز تھے۔

مجھ سے کہنے لگے ”کیا تم سمجھتے ہو کہ ہم ان کی عزت کرتے ہیں۔ ہرگز نہیں۔ مجھے حیرت تھی کہ وہ مجھ سے ایسی باتیں کیوں کر رہے تھے۔ شاید ان کا خیال تھا کہ ان باتوں سے میں خوش ہو جاؤں گا۔ اس کے بعد ہی انہوں نے گفتگو کا رخ نئی کونسلوں اور وزارتوں کی طرف پھیر دیا۔ اور یہ خیال ظہر کے اکہ ان وزارتوں کے ذریعہ سے ملک کی خدمت کرنے کے بہت سے موقعے نکل سکتے ہیں۔ مثلاً تعلیم کا مسئلہ ملک کے لئے خاص اہمیت رکھتا ہے۔ کیا ایک وزیر تعلیم کو جسے اپنی مرضی کے مطابق عمل کرنے کی آزادی ہو لاکھوں کی قیمتیں بدلنے اور ان کی زندگیاں بنانے کا زریں موقعہ حاصل نہیں ہے؟ یہاں سے وہ گریز کر کے اصل مقصد پر آئے اور فرمایا کہ فرض کیجئے آپ جیسا شخص جو ذہین۔ دیانت دار اور با اصول ہو اور جس میں کچھ کرنے کی ہمت اور جوش بھی ہو صوبہ کا وزیر تعلیم ہو جائے تو کیا کچھ نہیں کر دکھائے گا۔ اس کے بعد انہوں نے گورنر سے اپنی ملاقات کا ذکر کیا جو حال ہی میں ہوئی تھی اور مجھے یقین دلایا کہ تمہیں اپنی پالیسی کو عملی جامہ پہنچانے کی پوری آزادی ہوگی۔ پھر فوراً ہی انہیں احساس ہوا کہ شاید ہو حد سے بڑھ گئے اس لئے وہیں سے بات بنائی اور کہا کہ ظاہر ہے میں کسی کی طرف سے سرکاری طور پر زبان تو دے نہیں سکتا۔ صرف ذاتی طور پر ایک تجویز پیش کر رہا ہوں۔

سرگرم ووڈ نے جس حکمت عملی اور داؤں پیچ سے یہ تجویز پیش کی، اس سے میں بہت محفوظ ہوا۔ یہ خیال تو کبھی آہی نہیں سکتا تھا کہ وزیر کی حیثیت سے حکومت کے ساتھ کام کروں۔ اس سے بڑھ کر مکر وہ میرے لئے کوئی چیز نہ تھی۔ لیکن اس وقت بھی اور اس کے بعد بھی میرے لئے دل میں یہ تمنا ضرور پیدا ہوئی کہ کاش مجھے ٹھوس اور مستقبل تعمیری کام کرنے کا موقع ملتا۔ کسی کام کو بگاڑنا، مخالفانہ جدوجہد یا ترک موالات کرنا انسان کے لئے کوئی طبعی چیز نہیں ہے لیکن کیا کیا جائے۔ ہماری قسمت ہی میں لکھا ہے کہ ہم اس سرزمین تک جہاں ہمیں کچھ تعمیر کرنا ہے جنگ و جدال اور

تباہیوں کے ریگستان میں سے گزر کر پہنچیں۔ شاید ہم میں سے اکثر لوگ اپنی زندگیاں انہیں دشوار گزار منزلوں کو طے کرنے میں صرف کر دیں گے اور ہماری اولاد دیا اولاد کی اولاد کو یہ موقع نصیب ہو گا کہ وہ تعمیر شروع کر سکے۔

اس زمانے میں کم سے کم صوبہ متحدہ میں وزارتیں تکتے سیرکتی تھیں وہ دولبرل حضرات جو ترک موالات کے زمانے میں وزارت پر مامور تھے علیحدہ ہو چکے تھے۔ جب تک کانگریس کی تحریک سے موجودہ نظام کے تہ وبالا ہونے کا اندیشہ تھا۔ اس وقت تک حکومت نے کانگریس سے لڑنے کے لئے لبرل وزیروں کو آلہ کار بنا رکھا تھا۔ اس وقت ان کی بڑی قدر و عزت تھی۔ کیونکہ حکومت اسی کو غنیمت سمجھتی تھی کہ دکھانے کیلئے اس کے کچھ حامی تو رہیں۔ وہ یہ سمجھ بیٹھے کہ یہ قدر و منزلت ان کا حق ہے حالانکہ یہ تو محض کانگریس کے زبردست حملے کا ایک رد عمل تھا۔ چنانچہ جب یہ حملہ ختم ہو گیا تو یہ لبرل وزیر بھی حکومت کی نظروں سے گر گئے اور ان کی قدر و منزلت کا نور ہو گئی۔ وزیروں کو بہت برا معلوم ہوا مگر کیا کر سکتے تھے۔ آخر وہ استعفا دینے پر مجبور ہو گئے اس کے بعد نئے وزیروں کی تلاش شروع ہوئی۔ مگر اس میں جلد کامیابی نہیں ہوئی۔ کونسل میں جو مٹھی بھر لبرل تھے انہوں نے اپنے رفقا کی وفاداری میں جن کے ساتھ یہ بدسلوکی کی گئی تھی، وزارت قبول کرنے سے گریز کیا۔ باقی ممبر زیادہ تر زمیندار تھے۔ ان میں معدودے چند ایسے ہوں گے جنہیں تھوڑا بہت تعلیم یافتہ کہا جا سکتا تھا۔ چونکہ کانگریس نے کونسلوں کا بائیکاٹ کر دیا تھا۔ اس لئے وہاں عجب عجیب طرح کے لوگ پہنچ گئے تھے۔

ایک قصہ مشہور ہے کہ اسی زمانے میں یا اس کے کچھ عرصے بعد ایک صاحب کو یو۔ پی میں وزارت پیش کی گئی تو انہوں نے جواب دیا کہ مجھے یہ مغالطہ نہیں ہے کہ میں غیر معمولی طور پر عقل مند آدمی ہوں۔ پھر بھی میں اپنے خیال میں اور شاید دوسروں کے نزدیک بھی تھوڑی بہت عقل ضرور رکھتا ہوں۔ کیا حکومت چاہتی ہے کہ

میں وزات قبول کر کے دنیا پر ظاہر کروں کہ میں محض احمق ہوں۔

اس طعن میں کچھ حقیقت ضرور تھی۔ لبرل وزیر اگرچہ تنگ خیال تھے اور سیاسی یا سماجی معاملات میں ان کی نظر وسیع نہ تھی لیکن یہ محض ان کے غلط عقیدے کا قصور تھا۔ کم سے کم ان میں آئینی قابلیت تو تھی اور انہوں نے معمولی دفتری کام تو سمجھ بوجھ کر کیا، لیکن ان کے جانشینوں نے جو زمیندار طبقے کے افراد تھے معمولی باتیں بھی واجبی ہی واجبی پائی تھیں۔ میرے نزدیک تو ان کے متعلق بس اتنا ہی کہا جاسکتا ہے کہ وہ پڑھ لکھ سکتے تھے۔ کچھ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ گورنر نے انہیں محض اس وجہ سے منتخب کر کے اعلیٰ عہدوں پر مامور کیا ہے کہ ہندوستانیوں کی نااہلیت ثابت ہو سکے۔ ان پر ریچرڈ گارنٹ کا یہ مصرع بالکل صادق آتا تھا۔

”قسمت نے تجھے کہاں سے کہاں پہنچا دیا“

تا کہ دنیا یہ کہہ سکے کہ وہ جو چاہے کر سکتی ہے“

بہر حال یہ وزیر تعلیم یافتہ ہوں یا نہ ہوں مگر انہیں زمیندار ممبروں کی تائید حاصل تھی اور وہ اعلیٰ افسروں کو عمدہ عمدہ پارٹیاں دے سکتے تھے۔ فاقہ کش کسانوں کی گاڑھی کمائی کا اس سے بہتر اور کیا مصرف ہو سکتا تھا۔

شکوہ اور ذہنی کش مکش

میں نے اپنے لئے طرح طرح کے مصروفیتیں پیدا کر لیں تاکہ میں جن الجھنوں میں پڑا ہوا تھا، ان کو بھول جاؤں، لیکن سوالوں سے کہاں نجات مل سکتی تھی جو میرے دل و دماغ میں ہر وقت کانٹے کی طرح کھلتے رہتے تھے اور جن کا کوئی جواب سمجھ میں نہیں آتا تھا۔ اب عمل کا ایک مقصد یہ بھی تھا کہ اپنے آپ سے پیچھا چھڑاؤں۔ ۱۹۲۰ء و ۱۹۲۱ء کی طرح اب میری سرگرمیاں سراسر اظہار خودی کے لئے نہیں تھیں۔ یوں سمجھئے کہ میں نفس کی تنگ چار دیواری کو توڑ کر باہر نکل آیا تھا۔ اور اب ہندوستان بلکہ ساری دنیا کو آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھ رہا تھا۔ میں نے بہت سی نئی چیزیں، نئے خیالات، نئی تحریکیں دیکھیں جن پر اب تک نظر ہی نہیں پڑتی تھی۔ روشنی کی جگہ بڑھتی ہوئی تاریکی کا منظر آنکھوں کے سامنے تھا۔ گاندھی جی کی رہبری پر مجھے اب بھی پورا اعتماد تھا لیکن اب میں ان کے پروگرام کے بعض حصوں کو تنقیدی نظر سے دیکھنے لگا تھا۔ اس میں ایک مشکل یہ تھی کہ وہ جیل میں تھے اور ان کی رائے اور مشورے سے فائدہ نہیں اٹھایا جاسکتا تھا۔ اس وقت کانگریس میں دو جماعتیں تھیں یعنی داخلہ کونسل کی حامی جماعت اور سابقہ پروگرام میں تبدیلی کی مخالف جماعت۔ مجھے ان دونوں میں سے کسی سے دلچسپی نہ تھی۔ پہلی جماعت تو کھلم کھلا اصلاح پسندی اور آئین پرستی کی طرف جا رہی تھی جو میرے نزدیک بندگی کا راستہ تھا۔ رہے تبدیلی کے مخالف تو وہ اگرچہ مہاتما کے کٹر پیلے سمجھے جاتے تھے لیکن بڑے لوگوں کے تمام چیلوں کی طرح وہ بھی ان کی تعلیم کی روح کے نہیں بلکہ الفاظ کے پجاری تھے۔ ان میں کوئی موثر چیز نہ تھی اور عملی طور پر وہ بے ضرر، اللہ والے لوگ تھے۔ جن کی حیثیت سماجی مصلحین سے زیادہ نہ تھی البتہ ان میں ایک خوبی ضرور تھی یعنی کسانوں سے ان کا رشتہ برابر قائم تھا۔ سوراج پارٹی والوں سے جو کونسلوں کے داؤں پیچ میں پھنس کر رہ گیا تھا یہ پھر بھی اچھے تھے۔

میرے رہا ہوتے ہی دلش بندھو داس نے مجھے اپنا ہم خیال بنانے کی بہت کوشش کی۔ اگرچہ خود میرے ذہن میں یہ بات واضح نہیں تھی کہ مجھے کیا کرنا ہے لیکن میں ان کی دلیلوں سے متاثر نہیں ہوا۔ میرے والد کو بھی سوراج پارٹی قائم کرنے کی دھن تھی۔ یہ ان کی عجیب و غریب خصوصیت تھی کہ انہوں نے اس معاملے میں کبھی مجھ پر زور یا اثر ڈالنے کی کوشش نہیں کی۔ ظاہر ہے کہ اگر میں ان کا شریک کار ہو جاتا تو انہیں بڑی مسرت ہوتی لیکن انہیں میرے جذبات کا بڑا پاس تھا۔ اس لئے اس معاملے میں انہوں نے مجھے میری مرضی پر چھوڑ دیا۔

اس زمانے میں مسٹری۔ آر۔ داس اور میرے والد میں بہت گہری دوستی ہو گئی۔ اس کی نوعیت سیاسی رفاقت سے کہیں زیادہ تھی۔ اس میں وہ گرمجوشی اور خلوص تھا کہ مجھے دیکھ کر حیرت ہو گئی۔ کیونکہ زیادہ عمر میں گہری دوستیاں بہت کم ہوا کرتی ہیں۔ میرے والد کے سینکڑوں ملنے والے تھے اور قدرت نے انہیں یہ ملکہ عطا کیا تھا کہ وہ سب کے ساتھ ہنسی خوشی سے گزار دیتے تھے۔ لیکن دوستی کے معاملے میں وہ بہت محتاط تھے بلکہ آخری عمر میں تو بہت روکھے ہو گئے تھے۔ تاہم دلش بندھو کے اور ان کے بیچ سے تمام رکاوٹیں رفتہ رفتہ ہٹ گئی تھیں اور ان کے دل ایک دوسرے سے مل گئے تھے۔ میرے والد ان سے نو برس بڑے تھے۔ لیکن جسمانی حیثیت سے وہ ان سے زیادہ قوی اور تندرست تھے۔ اگرچہ دونوں نے قانونی تربیت پائی تھی اور وکالت میں کامیابی حاصل کی تھی لیکن بہت سی باتوں میں وہ ایک دوسرے سے مختلف تھے۔ مسٹر داس وکیل ہونے کے باوجود شاعر تھے اور جذبات کے رنگ میں ڈوبے ہوئے تھے۔ انہوں نے بنگلہ زبان میں بڑی عمدہ نظمیں لکھی ہیں وہ بڑے اچھے خطیب تھے اور طبیعت میں مذہبی رجحان تھا۔ بخلاف ان کے میرے والد خشک عملی آدمی تھے اور انہیں تنظیم کا زبردست ملکہ حاصل تھا۔ مذہب سے انہیں کوئی واسطہ نہ تھا۔ وہ ایک جنگجو سپاہی کی طرح ہمیشہ مارنے مرنے کو تیار رہتے تھے۔ جن لوگوں کو

وہ بیوقوف سمجھتے تھے ان سے نبھانا ان کے لئے ناممکن یا کم سے کم دشوار تھا اور مخالفت کی انہیں مطلق برداشت نہیں تھی اسے وہ اعلان جنگ سمجھ کر لڑنے پر آمادہ ہو جاتے تھے۔ غرض دلش بندھوا وروالد باوجود اتنے اختلافات کے باہم شیر و شکر ہو گئے۔ اور سوراج پارٹی کی رہنمائی کے لئے یہ عجیب و غریب زبردست جوڑی بن گئی جس میں ایک شخص دوسرے کی کمزوریوں کی تلافی کرتا تھا۔ ان دونوں کو ایک دوسرے پر بے حد اعتماد تھا۔ یہاں تک کہ دونوں طرف سے ایک دوسرے کو عام اجازت تھی کہ وہ ہر بیان یا ہر اعلان پر بغیر پوچھے دوسرے دستخط کر سکتے ہیں۔

یہی وہ شخص عنصر تھا جس نے سوراج پارٹی کو اتنا مستحکم کر دیا اور جس کی بدولت اسے ملک میں اس قدر قوت اور اقتدار حاصل ہو گیا۔ لیکن شروع ہی سے اس میں تفریق کے عناصر موجود تھے کیونکہ بہت سے نام و نمود چاہنے والے اس خیال سے اس میں شریک ہو گئے تھے کہ کونسلوں کے ذریعے سے ترقی کی مدارج آسانی طے ہو سکیں گے پرھ اس میں بعض کے اعتدال پسند بھی تھے جن کا خیال تھا کہ حکومت سے اور زیادہ تعاون کیا جائے۔ انتخاب کے بعد جیسے ہی یہ رجحانات ظاہر ہوئے پارٹی کے لیڈروں نے ان کی سختی سے مخالفت کی۔ میرے والد نے تو صاف صاف اعلان کر دیا کہ وہ ”سٹرے گلے عضو“ کو کاٹ پھینکنے میں ذرا تا مل نہ کرے گے۔ چنانہ انہوں نے اس پر عمل بھی کیا۔

۱۹۲۳ء کے بعد سے مجھے گھر پر بڑا سکون اور مسرت حاصل ہونے لگی اگرچہ میں وہاں بہت کم وقت گزارتا تھا۔ میں اس معاملے میں واقعی خوش قسمت ہوں کہ سارے خاندان سے میرے تعلقات بڑے خوش گوار ہیں اور پریشانی اور مصیبت کے وقت میں وہ لگو ہمیشہ دلا سادیتے ہیں اور میری مدد کرتے ہیں۔ مجھے اس بارے میں اپنی نا اہلی کا احساس کر کے بڑی شرم آتی ہے۔ خصوصاً جب میں اس پر غور کر کرتا ہوں کہ ۱۹۲۰ء کے بعد سے ہماری معاشرت میں بہت کچھ تبدیلی ہو گئی تھی اب ہم

بہت سادہ زندگی گزارنے لگے تھے اور ملازموں کی تعداد بھی بہت کم کر دی گئی۔ پھر بھی معمولی آرام و آسائش کی کمی نہ تھی۔ کچھ تو فضولیات کو ترک کرنے کے خیال سے اور کچھ روزمرہ کے اخراجات پورے کرنے کی غرض سے ہم نے بہت سی چیزیں فروخت کر دیں۔ مثلاً گھوڑے گاڑیاں یا گھر کا وہ سامان جو ہماری موجودہ طرز زندگی سے میل نہ کھاتا تھا۔ کچھ فرنیچر پولیس اٹھا لے گئی اور اس نے بیچ ڈالا۔ غرض فرنیچر اور نوکروں کی کمی کی وجہ سے ہمارے گھر میں وہ آرائش اور صفائی باقی نہیں رہی تھی اور مالیوں کے نہ ہونے سے سارا باغ اجڑ گیا تھا تقریباً ۳ سال تک گھرے اباغ کی طرف کسی نے توجہ نہیں کی۔ خرچ کے معاملے میں والد کا ہاتھ بہت کھلا ہوا تھا اس لئے وہ زیادہ جزو و سب کو ناپسند کرتے تھے۔ چنانچہ انہوں نے خالی وقت میں مقدمات میں مشورہ دینے کا کام شروع کر دیا تا کہ تھوڑی بہت آمدنی ہو جایا کرے۔ اس کام کے لئے انہیں بہت کم وقت ملتا تھا۔ پھر بھی انہوں نے اچھا خاصا روپیہ کمایا۔

یہ خیال میرے لئے سوہان روح تھا کہ میرا سارا بار والد پر ہے۔ جب سے میں نے وکالت ترک کی ہے میری کوئی آمدنی نہیں رہی تھی۔ البتہ چند حصوں کا منافع ضرور آتا تھا۔ میرا اور میری بیوی کا خرچ کچھ زیادہ نہ تھا بلکہ ہمیں یہ دیکھ کر حیرت ہوتی تھی کہ کتنا کم خرچ کرتے ہیں۔ ۱۹۲۱ء میں اس کا انکشاف کر کے مجھے بڑا اطمینان ہوا۔ میرا خیال تھا کہ کھادی کے کپڑوں اور تیسرے درجے کے سفر میں خرچ ہی کیا ہوتا اس وقت چونکہ میں والد کے ساتھ رہتا تھا اس لئے مجھے یہ اندازہ تھا کہ گھر کے چھوٹے چھوٹے متفرق خرچ ملا کر خاصی بڑی رقم ہو جاتی ہے۔ بہر حال روپے کی کمی میرے لئے کبھی پریشانی کا باعث نہیں ہوئی۔ مجھے یقین تھا کہ اگر ضرورت پڑے تو میں کافی روپیہ پیدا کر سکتا ہوں اور ہمارا گزارا بہت تھوڑے میں ہو سکتا ہے۔

ہماری وجہ سے والد پر کچھ ایسا بوجھ نہیں پڑتا تھا اور اگر اس قسم کا ذرا سا اشارہ بھی

کیا جاتا تو انہیں سخت تکلیف ہوتی پھر بھی والد کا دست نگر ہونا اچھا نہ لگتا تھا چنانچہ میں تین سال تک برابر اس مسئلے پر غور کرتا رہا لیکن کوئی صورت نہ نکلی۔ آمدنی کا ذریعہ نکال لینا کچھ مشکل نہ تھا لیکن اس کے معنی یہ ہوتے کہ مجھے قومی کام ترک کرنا پڑتا یا کم از کم اس میں بہت کمی ہو جاتی۔ اب تک تو میں سارا وقت کانگریس اور میونسپلٹی کے کام میں صرف کرتا تھا۔ محض روپیہ پیدا کرنے کے لئے ان کاموں کو ترک کرنا مجھے کس طرح گوارا نہ ہوا۔ اس وجہ سے میں نے بڑے بڑے صنعتی اداروں کی ان پیش کشوں کو منظور نہیں کیا جو مالی حیثیت سے نہایت پر منفعت تھیں۔ وہ مجھے اتنی بڑی رقم کچھ میری اہلیت کے لحاظ سے نہیں بلکہ غالباً اس وجہ سے دینے کو تیار تھے کہ میرے نام سے ناجائز فائدہ اٹھائیں اور میں اس طرح کسی بڑی صنعت سے متعلق نہیں ہونا چاہتا تھا۔ وکالت دوبارہ شروع کرنے کا تو کوئی سوال ہی نہ تھا مجھے اس سے سخت نفرت تھی۔ اور یہ نفرت روز بروز بڑھتی گئی۔

۱۹۲۴ء کی کانگریس میں یہ تجویز پیش کی گئی کہ جنرل سیکریٹریوں کو تنخواہ دینا چاہیے اس وقت ایک سیکریٹری میں بھی تھا۔ میں نے اس تجویز کو پسند کیا کیونکہ میرے نزدیک یہ طریقہ بالکل غلط تھا کہ کسی شخص کو اس کے گزارے کے لائق بھی تنخواہ نہ دی جائے اور پھر اس سے یہ توقع کی جائے کہ وہ رات دن کام میں لگا رہے۔ ایسی صورت میں ہمیں خواہ مخواہ وہ لوگ تلاش کرنے پڑیں گے جو گھر کے کھاتے پیتے ہوں لیکن اس قسم کے رئیس لوگ عموماً سیاسی خدمات کے لئے موزوں نہیں ہوتے اور نہ ان سے ذمہ داری کے ساتھ کام کرنے کی توقع کی جاسکتی ہے۔ کانگریس کو کچھ زیادہ خرچ نہ کرنا پڑتا کیونکہ ہم لوگ بہت کم گزارہ لیتے لیکن ہندوستان میں لوگوں کے ذہن میں یہ عجیب و غریب اور مہمل خیال جم گیا ہے کہ قومی سرمائے میں سے تنخواہ نہیں لینی چاہیے۔ حالانکہ سرکاری خزانے سے لوگ بہ خوشی تنخواہ وصول کرتے ہیں۔ بہر حال والد نے اس سے سخت اختلاف کیا کہ میں کوئی تنخواہ قبول کروں۔ میرے

شریک کار دوسرے سیکرٹری کو بھی روپے کی سخت ضرورت تھی، لیکن انہوں نے بھی کانگریس سے تنخواہ لینا اپنی شان کے خلاف سمجھا۔ مجھے اس میں ذرا بھی شرم نہیں آتی تھی اور میں تنخواہ لینے کے لئے بالکل تیار تھا، لیکن ان حالات میں مجھے بھی تنخواہ سے دست بردار ہونا پڑا۔

صرف ایک مرتبہ میں نے والد سے اس مسئلے پر گفتگو کی۔ اور ان سے عرض کیا کہ مجھے اپنا سارا بوجھ آپ پر ڈالنا کسی طرح اچھا نہیں معلوم ہوتا۔ میں نے حتی الامکان انتہائی لجاجت سے اور بڑے ایر پھیر سے یہ بات ان سے کہی تھی تاکہ انہیں کسی طرح تکلیف نہ ہو۔ انہوں نے جواب دیا کہ یہ سخت حماقت ہوگی۔ اگر تم قومی کام کرنے کے بجائے روپیہ کمانے میں اپنا تمام یا اکثر وقت صرف کرو۔ میں تو آسانی سے چند روز میں اتنا کما سکتا ہوں کہ تمہاری اور تمہاری بیوی کی سال بھر کی ضروریات کے لئے کافی ہو۔ دلیل نہایت معقول تھی لیکن میرا ضا کسی طرح مطمئن نہ ہوا۔ بہر حال میں ان کی مرضی پر چلتا رہا۔

یہ خانگی معاملات اور مالی مشکلات ۲۳ء کے آغاز سے ۲۵ء کے آخر تک جاری رہیں۔ اس اثناء میں سیاسی حالات میں تبدیلی ہو رہی تھی۔ مجھے میری مرضی کے خلاف آل انڈیا کانگریس کے بہت سے عہدے سپرد کر دئے گئے اور مختلف ذمہ داریوں میں زبردستی کھینچ لیا گیا۔ ۱۹۲۳ء میں کانگریس کی سیاست بھی نہایت ہی عجیب تھی۔ مسٹری۔ آر۔ داس گیا کانگریس کے گذشتہ اجلاس کے صدر ہوئے تھے۔ اس لئے وہ ۱۹۲۳ء میں آل انڈیا کانگریس کمیٹی کے بھی صدر تھے۔ لیکن کمیٹی کی اکثریت ان کے اور ان کی سورا جی پالیسی کے خلاف تھی۔ اکثریت اور اقلیت میں بہت تھوڑا سا فرق تھا اور دونوں جماعتیں قریب قریب برابر تھیں۔ ۲۳ء کی شروع گرمیوں میں جب بمبئی میں آل انڈیا کانگریس کمیٹی کا اجلاس ہوا تو یہ کش مکش حد سے گذر گئی اور مسٹر داس نے استعادے دیا۔ اس کے بعد دونوں کے بین بین ایک

چھوٹی سی وسطی جماعت پیدا ہوئی اور اس نے نئی ورکنگ کمیٹی ترتیب دی۔ اس جماعت کو آل انڈیا کانگریس کمیٹی میں کوئی تائید حاصل نہیں تھی اور وہ سابقہ دو جماعتوں میں سے ایک کی حمایت سے قائم رہ سکتی تھی۔ ان میں سے کسی سے بھی مل کر وہ دوسری جماعت کو شکست دے سکتی تھی۔ ڈاکٹر انصاری اس کے صدر تھے اور میں دو اور حضرات کے علاوہ سیکرٹری تھا۔

بہت جلد ہمیں دونوں طرف سے مشکلات کا سامنا ہوا۔ کجرات تبدیلی کے مخالفوں کا مرکز تھا۔ چنانچہ اس صوبے نے صدر دفتر کے احکام کی تعمیل کرنے سے انکار کر دیا۔ اسی سال گرمیوں کے اختتام پر آل انڈیا کانگریس کمیٹی کا ایک دوسرا جلسہ ناگپور میں ہوا۔ جہاں اس وقت قومی جھنڈے کے معاملے میں ستیا گرہور ہی تھی۔ ہماری ورکنگ کمیٹی جو بد نصیب وسطی جماعت پر مشتمل تھی مختصر اور بے کاری زندگی کے بعد یہاں ختم ہو گئی۔ اسے دراصل اس لئے ہٹا پڑا کہ یہ کسی گروہ کی نمائندگی نہیں کرتی تھی اور پھر ان لوگوں پر جن کے ہاتھ میں کانگریس کی باگ تھی رعب جمانا چاہتی تھی۔ اس کمیٹی نے کجرات کے حکم عدولی پر مذمت کی قرارداد پیش کی اور چونکہ اس میں ناکامی ہوئی اس لئے اسے استعفیٰ دینا پڑا۔ مجھے یاد ہے کہ استعفیٰ دینے سے مجھے بڑی خوشی ہوئی تھی اور ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے ایک بوجھ سر سے اتر گیا۔ پارٹی بازی کا یہ مختصر سا تجربہ بھی مجھے بہت گراں گذرا۔ اور مجھے یہ دیکھ کر بڑا صدمہ ہوا کہ بڑے بڑے کانگریسی بھی کس طرح سے سازشیں کر سکتے ہیں۔

اس جلسے میں مسٹری آر سی۔ داس نے مجھ پر یہ فقرہ کستا تھا کہ تم کو بالکل ٹھنڈی مٹی ہو۔ غالباً اس وقت کا خیال صحیح تھا کیونکہ یہ اس پر منحصر ہوتا ہے کہ مقابلہ کن لوگوں سے ہے۔ اپنے بہت سے احباب اور رفقاء کار کے مقابلے میں واقعی میں ٹھنڈی مٹی ہوں لیکن عام طور پر مجھے ہمیشہ یہی خوف لگا رہتا ہے کہ کہیں جذبات یا غصہ کی لہر میں بہہ نہ جاؤں۔ برسوں سے میری یہ کوشش رہی ہے کہ میں ٹھنڈی مٹی بن جاؤں لیکن میرا خیال ہے کہ اس میں مجھے جس حد تک کامیابی ہوئی ہے وہ محض سطحی ہے۔

ریاست نا بھاکا پر مذاق واقعہ

سوراج پارٹی والوں اور ان کے مخالفوں میں کش مکش جاری تھی اور سوراج زور پکڑ رہے تھے۔ ۱۹۲۳ء کے موسم خزاں میں دہلی میں کانگریس کا ایک خاص اجلاس ہوا اس میں سوراجیوں کو ایک فتح حاصل ہوئی۔ اس اجلاس کے بعد ہی مجھے ایک عجیب اور غیر متوقع واقعہ پیش آیا۔

پنجاب میں سکھوں، خصوصاً ان کی اکالی جماعت اور حکومت کے درمیان لڑائی چھڑی ہوئی تھی۔ ان کے اصلاح پسند طبقے نے یہ طے کر لیا تھا کہ بد اطوار مہنتوں کو نکال کر اپنے گوردواروں کو ان کے وجود سے پاک کرنا چاہیے اور تمام گوردواروں اور ان کے اوقاف پر قبضہ کر لینا چاہیے۔ حکومت نے اس معاملے میں مداخلت کی اور اس سے اور اکالیوں سے جنگ چھڑ گئی۔ یہ تحریک کسی حد تک اس بیداری کی وجہ سے شروع ہوئی جو ترک موالات نے پیدا کر دی تھی اور اکالی پر امن ستیاگرہ ہی کے اصولوں کی پیروی بھی کر رہے تھے۔ اس سلسلے میں بہت سے اہم واقعات پیش آئے ان میں سے خاص واقعہ گورو کے باغ کی مشہور جنگ کا ہے جس میں بیسیوں سکھوں کو (ان میں بہت سے سابق فوجی بھی تھے) پولیس نے نہایت بے دردی سے پٹیا۔ لیکن انہوں نے نہ تو پولیس پر ہاتھ اٹھایا اور نہ اپنے مقصد سے منہ موڑا۔ سارے ہندوستان کو ان کی جرات و استقلال پر حیرت ہو گئی۔ حکومت نے گوردوارہ کمیٹی کو خلاف قانون جماعت قرار دے دیا اور یہ جنگ کئی برس تک جاری رہی۔ آخر کار سکھوں کو فتح ہوئی۔ کانگریس کو قدرتی طور پر سکھوں سے ہمدردی تھی۔ چنانچہ کچھ عرصے تک اس نے بطور اظہار دوستی اپنی طرف سے ایک ذمہ دار شخص کو امرتسر میں متعین کر دیا تھا تا کہ وہ اکالی تحریک کی تمام سرگرمیوں سے پوری طرح باخبر رہے۔

جس واقعہ کا میں ذکر کروں گا اسے سکھوں کی عام تحریک سے کچھ زیادہ تعلق نہیں

تھا۔ لیکن اس میں بھی کوئی شک نہیں کہ اس کی وجہ سکھوں کی یہی ہل چل تھی۔ پنجاب کی وہ سکھ ریاستوں یعنی پٹیالہ اور نابھا کے ریسوں میں آپس میں سخت عداوت تھی۔ آخر اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ حکومت ہند نے مہاراجہ نابھا کو گدی سے اتار دیا۔ اس معزولی سے تمام سکھوں میں سخت بے چینی پیدا ہو گئی۔ اور انہوں نے ریاست میں بھی اور ریاست سے باہر بھی اس کے خلاف سخت عمل احتجاج کیا۔ اس احتجاج کے دوران میں ریاست کے نئے منتظم نے جیتو میں ایک مذہبی تقریب کو روک دیا۔ اس حکم کے خلاف احتجاج کرنے اور اس ممنوعہ تقریب کو منانے کے لئے سکھوں نے جیتو میں جتھے بھیجنا شروع کئے۔ پولیس ان جتھوں کو روک کر خوب مارتی۔ پھر گرفتار کر کے دور کہیں جنگل میں لے جا کر چھوڑ دیتی۔ میں وقتاً فوقتاً اخباروں میں اس مار دھاڑ کا حال پڑھا کرتا تھا۔ کانگریس کے خاص اجلاس کے بعد دہلی میں مجھے معلوم ہوا کہ ایک اور جتھا عنقریب جانے والا ہے اور مجھے دعوت دی گئی کہ میں وہاں چل کر اپنی آنکھ سے سب کچھ دیکھ لوں۔ میں نے خوشی سے یہ دعوت قبول کر لی اور سوچا کہ جیتو دہلی کے قریب ہی تو ہے۔ صرف ایک دن کا معاملہ ہے کیوں نہ چلا چلوں۔ میرے دو کانگریسی رفیق۔ اے۔ ٹی۔ گڈوانی اور مدارس کے مسٹر کے سنتا نم بھی میرے ہمراہ ہوئے۔ جتھا بہت دور سے پیدل چل کر آ رہا تھا۔ انتظام یہ کیا گیا کہ ہم لوگ قریب اسٹیشن پر اتر جائیں۔ پھر سڑک سے ٹھیک اس وقت جیتو پہنچ جائیں جب جتھا وہاں پہنچنے والا ہو۔ غرض ہم ٹھیک وقت پر وہاں پہنچ گئے اور جتھے سے کچھ فاصلے پر اسکے پیچھے پیچھے بیل گاڑی پر روانہ ہوئے۔ جیتو پہنچنے پر پولیس نے جتھے کو روکا اور فوراً ہم پر ایک حکمنامے کی تعمیل کی جس پر نابھے کے انگریز منتظم کے دستخط تھے۔ اس کی رو سے ہمیں یہ حکم دیا گیا تھا کہ نابھے کی حدود میں ہرگز داخل نہ ہو یا اگر ہو چکے ہو تو فوراً واپس چلے جاؤ۔ اسی قسم کے حکمنامے سنتا نم اور گڈوانی کو بھی دئے گئے لیکن ان پر ان کے نام درج نہیں تھے کیونکہ نابھے کے افسر شاید ان سے واقف نہ تھے۔ میرے

ہمراہیوں نے اور میں نے پولیس افسر کو یہ جواب دیا کہ ہم جتھے میں شامل نہیں بلکہ محض تماشائی کی حیثیت سے یہاں آئے ہیں۔ ہمارا یہ ارادہ ہے کہ ریاست کے قوانین کی خلاف ورزی کریں۔ اس کے علاوہ چونکہ ہم نابھے کے حدود میں داخل ہو چکے ہیں اس لئے داخل نہ ہونے کو تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ رہا واپس جانا تو ہم یکا یک ہوا میں غائب ہونے سے رہے۔ جیتو سے اگلی گاڑی کئی گھنٹے بعد جاتی ہے اس لئے گاڑی چھوٹنے تک یہیں ٹھہریں گے چنانچہ ہم فوراً گرفتار کر کے حوالات میں بند کر دئے گئے۔ ہمارے وہاں سے چلے جانے کے بعد جتھے کے ساتھ وہی برتاؤ کیا گیا جو ہمیشہ ہوتا تھا۔

سارے دن پولیس نے ہمیں حوالات میں رکھا اور شام کو پیدل اسٹیشن لے چلی۔ سنتا نم اور میں ایک ہتھکڑی میں بندھے تھے ان کی بانیں کلانی میں کڑا پڑا تھا اور میری سیدھی میں۔ اور ہتھکڑی کی زنجیر پولیس کا ایک سپاہی پکڑے ہوئے آگے آگے چل رہا تھا۔ گڈوانی کے بھی ہتھکڑی پڑی تھی اور پیچھے پیچھے تشریف لا رہے تھے۔ غرض ہم اس طرح جیتو کی سڑکوں پر گزر رہے تھے جیسے کوئی شخص کتوں کے گلے میں زنجیر ڈالے انہیں گھسیٹتا لئے جا رہا ہو۔ شروع شروع میں ہمیں کسی قدر غصہ آیا مگر واقعے کے مضحک پہلو کا احساس ہوا اور ہم نے اس کا پورا لطف اٹھایا لیکن رات بڑی بے لطیفی سے کٹی۔ ریل کے تیسرے درجے کے ڈبیت کھچا کھچ بھر تھے اور گاڑی بہت آہستہ آہستہ چل رہی تھی اور شاید آدھی رات کو کہیں گاڑی بدلنا بھی پڑی، کچھ رات تو اس طرح گزری اور کچھ نابھے کی حوالات میں۔ ساری رات بلکہ دوسرے دن دوپہر تک (جب تک ہم نابھا جیل میں داخل نہ ہو گئے) ان مشترک ہتھکڑیوں اور زنجیروں نے ہمارا ساتھ نہ چھوڑا۔

ہم میں سے ہر شخص ایک دوسرے کی مدد کے بغیر اپنی جگہ سے حرکت نہیں کر سکتا تھا۔ ساری رات اور آدھے دن دوسرے شخص کے ساتھ ہتھکڑی میں بندھا رہنا ایسا

تلخ تجربہ ہے کہ دوبارہ اس کا مزہ چکھنے کی ہوس نہیں۔

نا بھاجیل میں ہم تینوں ایک نہایت ہی مکروہ اور گندی کوٹھڑی میں بند کر دئے گئے۔ یہ بہت چھوٹی اور مرطوب جگہ تھی اور چھت اتنی نیچی کہ ہم ہاتھ سے چھو سکتے تھے۔ رات کو ہم زمین ہی پر سوئے۔ بارہا ایسا ہوا کہ کوئی چوہا یا چوہیا میرے چہرے پر سے گزری اور میں سوتے سوتے یکا یک خوف سے اچھل پڑا۔

دو تین دن ہم عدالت میں پیش کئے گئے اور وہاں ایک مدت تک کچھ عجیب و غریب مسخرے پن کی کاروائیاں ہوتی رہیں۔ ججزیٹ اور جج صاحب بالکل بے پڑھے معلوم ہوتے تھے۔ انگریزی تو وہ سرے سے جانتے ہی نہ تھے اور میرے خیال میں عدالتی زبان یعنی اردو لکھنے سے معذور تھے۔ ہم ہفتوں ان کے سامنے پیش ہوئے لیکن مقدمے کی سماعت کے دوران میں کبھی انہوں نے ایک حرف بھی نہ لکھا۔ جب کچھ لکھنا ہوتا تو وہ پیشکار سے لکھوا لیتے تھے۔ اس دوران میں ہم نے بہت سے معمول درخواستیں بھی دیں لیکن انہوں نے اس وقت ان پر کوئی حکم نہیں لکھا۔ وہ ہمیشہ انہیں رکھ لیتے۔ پھر دوسرے دن کسی اور سے حکم لکھوا کر لے آتے۔ ہم نے اپنے مقدمے کی باضابطہ پیروی نہیں کی۔ ترک موالات کے زمانے سے ہم مقدموں کی پیروی نہ کرنے کے ایسے عادی ہو گئے تھے کہ جب یہ جائز بھی رکھا جاتا تب بھی ہم اسے اپنی شان کے خلاف سمجھتے تھے۔ بہر حال میں نے عدالت میں ایک طویل بیان پیش کیا جس میں تمام واقعات پر روشنی ڈالی اور ریاست نا بھاجیل برطانیہ کے دور انتظام میں جو اندھر مچا ہوا تھا اس پر کھلم کھلا تنقید کی۔

ہمارا مقدمہ اگرچہ معمولی سا مقدمہ تھا لیکن ایک مدت تک چلتا رہا۔ یکا یک اس نے ایک پلٹا لیا اور ایک نئی صورت رونما ہوئی۔ ایک دن عدالت کے برخاست ہونے کے بعد ہم ایک دوسری عمارت میں روک کئے گئے پھر شام کی کوئی سات بجے ہمیں ایک کمرے میں لے گئے جہاں ایک شخص میز کرسی لگائے بیٹھا تھا اور چند اور

شخص بھی جمع تھے۔ ہمارے پرانے دوست وہ پولیس افسر صاحب بھی جنہوں نے
 ہیں جیتو میں گرفتار کیا تھا وہاں موجود تھے۔ انہوں نے کھڑے ہو کر ایک بیان دینا
 شروع کر دیا۔ ہم نے دریافت کیا کہ آخر معاملہ کیا ہے اور یہ کیا تماشہ ہو رہا ہے۔ اس
 پر ہمیں بتایا گیا کہ یہ عدالت کا اجلاس ہے اور سازش کے جرم میں تم پر مقدمہ چلایا جا
 رہا ہے۔ یہ اس مقدمے سے بالکل جدا گانہ کاروائی تھی جواب تک ہم پر چل رہا تھا اور
 جس میں ہم ریاست نا بھا میں داخل نہ ہونے کے حکم کی خلاف ورزی میں ماخوذ
 تھے۔ شاید یہ خیال کیا گیا کہ اس جرم کی زیادہ سے زیادہ سزا صرف ۶ ماہ ہے اور یہ
 ہمارے لئے کافی نہیں ہے اس لئے کوئی زبردست الزام لگانا ضروری ہے۔ سازش
 کے لئے ۳ کی تعداد کافی نہ تھی اس لئے ایک چوتھا شخص جسے ہم سے قطعی کوئی واسطہ نہ
 تھا گرفتار کیا گیا اور ہمارے ساتھ مقدمے میں نہ تھی کر دیا گیا۔ ہم اس بد قسمت سکھ کو
 جانتے بھی نہ تھے۔ ہاں جب ہم جیتو آ رہے تھے تو اسے کھیتوں میں دیکھا ضرور تھا۔

ایک وکیل کی حیثیت سے یہ دیکھ کر ششدر رہ گیا کہ کس قدر آسانی سے بے
 تلف سازش کا ایک مقدمہ کھڑا کر دیا گیا۔ الزام از سر تا پا جھوٹا تھا۔ لیکن دکھاوے ہی
 کے لئے یہی کچھ نہ کچھ ضابطہ کی پابندی تو ضروری تھی۔ ہم نے جج صاحب سے کہا
 کہ ہمیں اس مقدمے کی کوئی اطلاع نہیں دی گئی اور نہ اس کا موقع دیا گیا کہ ہم اپنی
 پیروی کا کوئی انتظام کر سکیں۔ لیکن اس معقول اعتراض سے انہیں کوئی پریشانی نہیں
 ہوئی۔ انہوں نے کہا کہ نا بھٹے کا یہی طریقہ ہے اگر تم وکیل کرنا چاہتے ہو تو یہیں سے
 کسی کو مقرر کر لو۔ جب میں نے کہا کہ شاید میں باہر سے کوئی وکیل بلانا مناسب
 سمجھوں، تو جواب ملا کہ نا بھٹے کے قانون کی رو سے اس کی اجازت نہیں ہے۔ اس
 کے بعد ریاست کے عجیب عجیب قواعد و ضوابط کا ہمیں پتہ چلا اور ہم نے پریشان ہو
 کر جج سے یہ کہہ دیا کہ جو آپ کے جی میں آئے کیجئے، ہم اس مقدمے کی کاروائی
 میں کوئی حصہ نہیں لیں گے لیکن میں اس فیصلے پر برابر قائم نہ رہ سکا۔ ہمارے متعلق جو

بے سرو پا جھوٹ تراشا جا رہا تھا اسے سننا اور چپ رہنا ناممکن تھا۔ چنانچہ کبھی کبھی ہم گواہوں کے متعلق مختصر مگر معقول رائے زنی کر دیتے تھے۔ ہم نے عدالت میں ایک بیان تحریری بھی داخل کیا جس میں تمام واقعات درج کر دئے۔ یہ دوسرے جج جو مقدمہ سازش کی سماعت کر رہے تھے پہلے جج سے زیادہ ذہین اور تعلیم یافتہ معلوم ہوتے تھے۔

عرصے تک یہ دونوں مقدمے چلا کئے۔ ہم ان دونوں عدالتوں کا بڑی بے چینی سے انتظار کیا کرتے تھے کیونکہ اس طرح تھوڑی دیر کے لئے جیل کی گندی کوٹھڑی سے نجات مل جاتی تھی۔ اسی دوران میں منتظم ریاست کی جانب سے سپرنٹنڈنٹ جیل میرے پاس آئے اور کہا کہ اگر آپ معافی مانگ لیں اور اقرار کریں کہ فوراً نابھے سے چلے جائیں گے تو مقدمہ بالکل ختم کر دیا جائے گا۔ میں نے جواب دیا کہ ہم کس بات کی معافی مانگیں۔ معافی تو ریاست کو مانگنا چاہیے کہ اس نے ہمارے ساتھ بدسلوکیاں کیں۔ اس کے علاوہ ہم کوئی اقرار کرنے کو بھی تیار نہیں ہیں۔

ہماری گرفتاری کے کوئی پندرہ دن بعد دونوں مقدمے ختم ہو گئے۔ یہ تمام وقت ثبوت فراہم کرنے میں صرف ہوا تھا اور ہم نے کوئی صفائی پیش نہیں کی تھی اس میں زیادہ عرصہ وقفوں میں گزرا کیونکہ جہاں کوئی دقت پیش آتی فوراً مقدمہ ملتوی کر دیا جاتا اور پس پردہ غالباً انگریز منتظم سے مشورے کئے جاتے۔ آخری روز جب ثبوت ختم ہو گیا تو ہم نے اپنے بیان تحریری داخل کر دئے۔ پہلی عدالت درخواست ہوئی اور ہمیں یہ دیکھ کر حیرت ہو گئی کہ تھوڑی ہی دیر میں جج صاحب اردو لکھا ہوا ایک طویل طویل فیصلہ لئے برآمد ہوئے۔ ظاہر ہے کہ یہ لمبا چوڑا فیصلہ اس قلیل وقفہ میں نہیں لکھا جاسکتا تھا اور یہ ہمارے بیان داخل کرنے سے پہلے ہی تیار کر لیا گیا تھا۔ فیصلہ ہمیں پڑھ کر سنایا بھی نہیں گیا۔ صرف اتنا بتا دیا گیا کہ ریاست نابھے سے نکل جانے کا حکم کی خلاف ورزی میں تمہیں چھ مہینے کی سزا دی جاتی ہے۔

اس دن سازش کے مقدمے میں مجھے ڈیڑھ یا دو برس کی سزا ہوئی۔ صحیح حدت مجھے یا نہیں ہے۔ یہ سزا پہلی ۶ مہینے کی سزا کے علاوہ تھی۔ گویا مجموعی طور پر ہمیں دو یا ڈھائی برس جیل میں گزارنے تھے۔

مقدمے کے دوران شروع سے آخر تک بہت سے دلچسپ واقعات ہوئے جن سے ہم پر ہندوستانی ریاستوں کے طرز حکومت کی، یا یوں کہنے کے ریاستوں کی برطانوی حکومت کی حقیقت آشکار ہو گئی۔ ساری کاروائی محض ایک دھوکا تھا شاید اسی وجہ سے اخباروں کے نامہ نگاروں یا باہروالوں کو عدالت میں آنے کی اجازت نہیں تھی۔ پولیس من مانی کاروائی کرتی تھی۔ اکثر جج یا مجسٹریٹ کی بھی کوئی پرواہ نہیں کرتی تھی۔ بلکہ کبھی کبھی تو کھلم کھلا ان کے حکم عدولی کرتی تھی۔ بچارہ مجسٹریٹ چپ چاپ اسے گوارا کرتا تھا۔ لیکن ہم ایسا کیوں کرتے اس نے اکثر موقعوں پر میں کھڑا ہو جاتا اور اس پر زور دیتا کہ پولیس کو اپنا طرز عمل درست کرنا چاہیے اور مجسٹریٹ کا حکم ماننا چاہیے۔ بعض اوقات پولیس نہایت بے ہودہ طریقے سے ہاتھوں میں سے کاغذات چھین لیتی اور چونکہ عدالت کا نہ کوئی رعب تھا نہ وہ اس کی اہل تھی کہ کوئی حکم دے یا اپنے اجلاس میں امن و سکون قائم رکھ سکے اس لئے اس کا بہت کچھ کام ہمیں انجام دینا پڑتا تھا۔ بے چارہ مجسٹریٹ بڑی مشکل میں تھا۔ ایک طرف وہ پولیس سے خائف تھا۔ دوسری طرف ہم سے بھی کچھ سہا ہوا تھا کیونکہ ہماری گرفتاری پر ملک کے تمام اخباروں نے شور مچا رکھا تھا۔ جب ہمارے ساتھ جو سیاسیات میں ذرا نمایاں حیثیت رکھتے تھے۔ یہ کیفیت تھی تو بے چارے غیر معروف لوگوں کا نہ جانے کیا حشر ہوتا ہوگا؟

میرے والد ہندوستانی ریاستوں سے واقف تھے اس لئے نا بھے میں میری غیر متوقع گرفتار سے وہ سخت پریشان ہو گئے۔ انہیں بس اتنا معلوم ہوا تھا کہ میں گرفتار کر لیا گیا۔ اس کیا آگے انہیں کوئی خبر نہ ملتی تھی۔ پریشانی میں انہوں نے

وائسرائے کو تار بھی دیا کہ میرے خیریت سے مطلع کیا جائے۔ شروع میں تو مجھ سے ملنے کے لئے ان کے نابھے آنے میں بھی روڑے اٹکائے گئے۔ آخر کار انہیں جیل خانے میں مجھ سے ملاقات کرنے کی اجازت مل گئی۔ وہ میری کیا مدد کر سکتے تھے کیونکہ میں مقدمے کی پیروی ہی نہیں کر رہا تھا۔ میں نے ان سے درخواست کی کہ آپ الہ آباد واپس تشریف لے جائیں اور پریشان نہ ہوں وہ واپس تو چلے گئے لیکن ہمارے ایک ہمعصر نوجوان وکیل کپل دیو مالویہ کو نابھے میں چھوڑتے گئے تاکہ وہ مقدمے کی نگرانی کرتے رہیں۔ یقین ہے کہ نابھے کی عدالتوں کے اس مختصر سے تجربے سے کپل دیو کی قانون اور ضابطہ کی معلومات میں بہت کچھ اضافہ ہو گیا ہوگا۔ پولیس نے کھلی عدالت میں ان کے ہاتھ سے بھی زبردستی چند کاغذات چھیننے کی کوشش کی تھی۔

ہندوستان کی اکثر ریاستیں اپنی پستی اور قدیم جاگیرداری طریقے کی وجہ سے بد نام ہیں۔ عموماً وہاں استبدادی حکومت ہے جس میں وہ شخصی قابلیت اور مروت بھی نہیں ہے جو ایسی حکومتوں میں کبھی کبھی ہوا کرتی ہے۔ اکثر وہاں عجیب عجیب واقعات ہوتے رہتے ہیں جن کا ہمیں علم نہیں ہوتا۔ پھر بھی ان کی یہ نااہلی بعض وقت غنیمت ہوتی ہے اور بد نصیب رعایا کے بوجھ کو ہلکا کر دیتی ہے کیونکہ ایسی صورت میں عملہ کمزور ہوتا ہے۔ جس کی وجہ سے ظلم اور نا انصافی بھی کامیابی کے ساتھ نہیں کی جاسکتی۔ اس سے ظلم کی شدت میں کمی نہیں ہوتی مگر اس کا دائرہ عمل محدود ہو جاتا ہے۔ مگر جو بکوئی ریاست براہ رات برطانوی حکومت کی نگرانی میں آجاتی ہے تو یہ تو زن بگڑ جاتا ہے اور عجیب و غریب صورت پیدا ہو جاتی ہے۔ جاگیرداری نظام بدستور قائم رہتا ہے۔ استبدادیت اسی طرح باقی رہتی ہے۔ پرانے قانون قاعدے ویسے ہی جاری رہیت ہیں اور انفرادی اور اجتماعی آزادی اور ہر طرح کے اظہار رائے پر وہی پابندیاں عاید رہتی ہیں۔ لیکن ایک تبدیلی ایسی ہو جاتی ہے جس

سے تمام پس منظر بدل جاتا ہے۔ یعنی عملہ زیادہ مضبوط ہو جاتا ہے اور اس میں کسی حد تک اہلیت پیدا ہو جاتی ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ان استبدادی بندشوں میں زیادہ سختی آ جاتی ہے۔ کچھ عرصے بعد برطانوی حکومت چند قدیم رسم و رواج اور قاعدے ضرور بدل دیتی ہے کیونکہ اچھی طرح حکمرانی کرنے میں اور تجارتی حیثیت سے حاوی ہونے میں یہ حارج ہوتے ہیں۔ لیکن شروع شروع میں رعایا پر اپنی گرفت مضبوط کرنے کے لئے وہ ان سے پورا فائدہ اٹھاتی ہے اور اب غریب رعایا کو نہ صرف جاگیر داری نظام اور استبدادیت کے اصول گوارا کرنے پڑتے ہیں بلکہ ایک مضبوط عملے کے ذریعے سے ان پر سختی سے عمل بھی ہونے لگتا ہے۔

میں نے نابھے میں ایک حد تک ان باتوں کا مشاہدہ کیا۔ ریاست ایک انگریز منتظم کی نگرانی میں تھی جو انڈین سول سروس کا رکن تھا۔ اسے مطلق العنان حکمران کے پورے اختیارات حاصل تھے اور وہ صرف حکومت ہند کے ماتحت تھا۔ پھر بھی جب کبھی ہمیں معمولی سے معمولی حقوق دینے سے پہلو تہی کرنی ہوتی فوراً ریاست کے قانون قاعدوں کا حوالہ دیا جاتا۔ ہمیں قدیم جاگیر داری نظام اور جدید قسم کی استبدادی طرز حکومت دونوں کے ایک معجون مرکب سے واسطہ پڑا تھا۔ یعنی اس میں دونوں کی خرابیاں موجود تھیں اور دونوں کی خوبیاں مفقود تھیں۔

بہر حال ہمارا مقدمہ ختم ہو گیا اور ہمیں سزا ہو گئی۔ ہمیں نہیں معلوم کہ فیصلے میں کیا لکھا تھا لیکن محج طویل سزا کی وجہ سے ہم پر اس کا رعب تھا۔ ہم نے فیصلوں کی نقل مانگی تو حکم ہوا کہ باضابطہ درخواست دو۔

اسی دن شام کے وقت جیل میں سپرنٹنڈنٹ نے ہمیں طلب کیا۔ اور ضابطہ فوجداری کے ماتحت منتظم کا ایک حکم دکھایا جس کی رو سے ہماری سزائیں کمائی گئی۔ اس التوا کے ساتھ کوئی شرط نہ تھی۔ جس کے معنی یہ تھے کہ ہم قانونی طور پر بالکل آزاد تھے۔ اس کے بعد سپرنٹنڈنٹ نے ایک دوسرا حکم پیش کیا جسے وہ عاملانہ حکم کہتے

ہتے۔ یہ بھی انہیں منتظم صاحب نے جاری کیا تھا۔ اس کی رو سے ہمیں یہ حکم دیا گیا تھا کہ ہم فوراً ناجھے سے نکل جائیں اور پھر کبھی بلا اجازت ریاست کے حدود میں داخل نہ ہوں۔ میں نے ان دونوں حکموں کی نقل مانگی لیکن سپرنٹنڈنٹ نے انکار کر دیا۔ اس کے بعد ہمیں ریلوے اسٹیشن پر لے جا کر رہا کر دیا گیا۔ ہم ناجھے میں کسی سے واقف نہ تھے اس کے علاوہ ساری رات شہر کے پھانک بھی بند رکھے گئے۔ پھر ہمارے لئے باہر جانے کے سوا اور چارہ ہی کیا تھا۔ ہمیں معلوم ہوا کہ ایک ٹرین تھوڑی دیر میں انبالے جانے والی ہے چنانچہ ہم اسی میں بیٹھ گئے۔ انبالے سے میں دہلی سے پھر الہ آباد پہنچا۔

الہ آباد پہنچ کر میں نے منتظم کو خط لکھا اور ان سے دونوں فیصلوں اور دونوں حکام کی نقلیں بھیجنے کی درخواست کی تاکہ مجھے یہ معلوم ہو سکے کہ ان میں کیا لکھا تھا۔ انہوں نے نقلیں دینے سے انکار کر دیا۔ میں نے پھر انہیں لکھا کہ شاید میں اپیل دائر کروں لیکن وہ برابر انکار کرتے رہے۔ متواتر کوششوں کے باوجود مجھے آج تک ان فیصلوں کی زیارت نصیب نہیں ہوئی جن کی رو سے مجھے اور میرے دو ساتھیوں کو دو ڈھائی سال کی سزدی گئی تھی۔ ممکن ہے یہ سزا کے احکام آج بھی موجود ہوں وار جب برطانوی حکومت یا ناجھے کے حکمران چاہیں ان کو نافذ کر دیں۔

ہماری سزائیں اس طرح ملتی کر کے ہم تینوں تو رہا کر دئے گئے لیکن یہ پتہ نہ چلا کہ اس گھڑی ہوئی سازش کو چوتھے رکن کا کیا حشر ہوا یعنی اس پچارے سکھ کا جو ہمارے ساتھ دوسرے مقدمے میں خواہ مخواہ نہتی کر دیا گیا تھا۔ غالباً وہ رہا نہیں ہوا۔ اس کے نہ کوئی قوت و اقتدار والے دوست تھے نہ پبلک کو اس سے کوئی ہمدردی تھی کہ اسے کوئی امداد پہنچتی۔ غرض اور بہت سے لوگوں کی طرح اس پر بھی ریاست کے قید خانے میں گمنامی کا پردہ پڑ گیا لیکن ہم نے اسے فراموش نہیں کیا۔ جو کچھ ہمارے امکان میں تھا وہ ہم نے کیا مگر اس سے کیا ہو سکتا تھا۔ مجھے یقین ہے کہ گوردوارہ کمیٹی

نے اس کا معاملہ اپنے ہاتھ میں لے لیا تھا۔ بعد میں ہمیں معلوم ہوا کہ وہ ’’کوما گٹا مارڈ‘‘ کے ستم زدوں میں سے تھا اور بہت طویل عرصہ کے بعد حال ہی میں جیل سے باہر آیا تھا۔ پولیس کو ایسے آدمیوں کا باہر رہنا ایک آنکھ نہیں بھاتا۔ چنانچہ اس نے ہمارے ساتھ اسے بھی پھانس لیا۔

گڈوانی سنتا نم اور میں تینوں نا بھے جیل کی کوٹھڑی سے ایک بلا اپنے ساتھ لائے یعنی معیادی بخار کے جراثیم۔ چنانچہ ہم تینوں معیادی بخار میں مبتلا ہو گئے مجھ پر بخار کا خاصا سخت حملہ تھا اور کچھ عرصے کے لئے خطرناک بھی ہو گیا تھا۔ لیکن ان دونوں کے مقابلے میں پھر بھی ہلکا تھا۔ میں تین چار ہفتے لوٹ پوٹ کے اٹھ کھڑا ہوا۔ لیکن وہ دونوں تو ایک مدت تک سخت بیمار رہے۔

نا بھے کے اس حادثے کے بعد ایک اور واقعہ پیش آیا۔ اس کے کوئی چھ مہینے بعد گڈوانی کانگریس کے نمائندے بنا کر امرتسر بھیجے گئے تاکہ سکھ گوردوارہ کمیٹی کے حالات سے باخبر رہیں۔ کمیٹی نے جیتو کو پانچ سو آدمیوں کا ایک خاص جتھہ روانہ کیا اور گڈوانی محض نگران کی حیثیت سے نا بھے کے حدود تک ان کے ساتھ گئے۔ ریاست میں داغ ہونے کا ان کا ارادہ نہ تھا۔ نا بھے پہنچتے ہی جتھے پر گولیاں برسائی گئیں اور غالباً بہت سے شخص ہلاک اور زخمی ہوئے۔ گڈوانی زخمیوں کی مدد کو بڑھے لیکن ریاست کی حدود میں قدم رکھتے ہی پولیس ان پر جھپٹ پڑی۔ اور انہیں اٹھا کر لے گئی۔ عدالت میں ان کے خلاف کوئی مقدمہ نہیں چلایا گیا۔ لیکن قریب قریب سال بھر تک وہ جیل خانے میں رکھے گئے۔ پھر جب ان کی صحت بالکل جواب دے گئی تو رہا کر دئے گئے۔

میرے نزدیک گڈوانی کی گرفتاری اور قید کے معاملے میں عاملانہ اختیارات کا نہایت ہی بے جا استعمال کیا گیا تھا۔ میں نے منتظم کو (جواب بھی وہی انگریز آئی سی۔ ایس تھا) خط لکھا اور اس سے دریافت کیا کہ گڈوانی کے ساتھ آخر بدسلوکی

کیوں کی گئی۔ انہوں نے جواب دیا کہ گڈوانی کو اس لئے قید کیا گیا ہے کہ انہوں نے ہمارے پچھلے حکم کی خلاف ورزی کی اور اجازت لئے بغیر نا بھے کے حدود میں داخل ہو گئے۔ میں نے لکھا کہ آپ کا یہ طرز عمل قانونی حیثیت سے قطعی غلط ہے اس کے علاوہ جو شخص زخمیوں کو امداد پہنچانے آگے بڑھا ہو اس کا گرفتار کر لینا کہاں تک مناسب ہے۔ میں نے ان سے مطالبہ کیا کہ اپنے حکم کی نقل یا تو مجھے ارسال فرمائیے یا اخباروں میں شائع کر دیجئے۔ لیکن انہوں نے ان دونوں باتوں سے انکار کر دیا۔ میں نے ارادہ کیا کہ میں خود نا بھے جاؤں اور منتظم صاحب کو موقع دوں کی انہوں نے گڈوانی سے جو سلوک کیا تھا وہی میرے ساتھ بھی کریں لیکن میرے بہت سے احباب نے اس کی مخالفت کی اور مجھے وہاں جانے سے باز رکھا۔ سچ پوچھئے تو میں نے ان دوستوں کو نصیحت کی آرٹلی اور اپنی کمزوری کو چھپانے کا ایک بہانہ نکال لیا۔ کیونکہ حقیقت میں اپنی کمزوری اور نا بھاجیل میں دوبارہ قدم رکھنے کے خوف ہی کی وجہ سے مجھے وہاں جانے کی ہمت نہیں ہوئی۔ اپنے ایک ساتھی کو اس طرح چھوڑ دینے پر میں ہمیشہ شرمندہ رہوں گا لیکن جیسا کہ ہم سب اکثر کرتے ہیں میں نے بھی شجاعت پر مصلحت کو ترجیح دی۔

کوکونا ڈو، اور مولانا محمد علی

دسمبر ۲۳ء میں کانگریس کا سالانہ اجلاس کوکونا ڈا (دکن) میں ہوا۔ مولانا محمد علی صدر تھے۔ حسب عادت انہوں نے ایک بے حد طویل خطبہ صدارت پڑھا۔ لیکن تھا وہ دلچسپ۔ انہوں نے مسلمانوں کے سیاسی اور فرقہ وارانہ احساسات کی نشوونما کا خاکہ کھینچا اور یہ دکھایا کہ ۱۹۰۸ء میں مسلمانوں کا جو مشہور وفد آغا خاں کی سرکردگی میں وائسرائے کے پاس گیا تھا اور جس کے جواب میں حکومت نے جداگانہ انتخاب کی پہلے پہل سرکاری طور پر حمایت کی تھی وہ ایک فرمائشی سوانگ تھا اور حکومت کے اشارے سے ترتیب دیا گیا تھا۔

محمد علی نے میری مرضی کے خلاف مجھے مجبور کیا کہ ان کی صدارت کے دوران میں آل انڈیا کانگریس کمیٹی کے سیکرٹری کا عہدہ قبول کر لوں۔ ایسی حالت میں کہ ملک کے آئندہ پروگرام کے متعلق کوئی بات صاف طور پر میرے ذہن میں نہ تھی میں کوئی انتظامی ذمہ داری قبول نہیں کرنا چاہتا تھا۔ لیکن محمد علی سے انکار نہ کر سکا۔ اس کے علاوہ ہم دونوں اس نتیجے پر پہنچے کہ اگر کوئی دوسرا شخص سیکرٹری مقرر ہوا تو شاید وہ نئے صدر کے ساتھ اس ہم آہنگی سے کام نہ کر سکے جس طرح میں کر سکتا تھا۔ جنہیں وہ پسند کرتے تھے۔ ہم میں الفت و محبت کے تعلقات تھے اور ہم ایک دوسرے کی بہت قدر کرتے تھے۔ ان پر مذہب کا رنگ بہت گہرا تھا جس میں میرے خیال میں عقلیت کی جھلک تک نہ تھی۔ میں اس معاملے میں اس کا بالکل برعکس تھا۔ مگر اس اختلاف کے باوجود ان کی غیر معمولی سرگرمی، زبردست قوت عمل اور انتہائی ذکاوت کا دلدادہ تھا۔ اکی تیزی طبع کی کوئی حد نہ تھی لیکن بعض اوقات ان کے طنز کا وار بہت گہرا پڑتا تھا۔ اس کی وجہ سے کتنے دوست ان سے چھوٹ گئے۔ یہ ناممکن تھا کہ کوئی چست فقرہ ان کے ذہن میں آئے اور وہ اسے بے کہے چھوڑ دیں۔ اس وقت انہیں اس کا ذرا خیال نہ آتا کہ نتیجہ کیا ہوگا؟

ان کی صدارت کے زمانے میں ہم دونوں میں اچھی طرح نبھی۔ اگرچہ معمولی اختلافات اکثر ہو جاتے تھے۔ میں نے آل انڈیا کانگریس کمیٹی میں یہ طریقہ رائج کرنا چاہا کہ تمام اراکین کو القاب و آداب کے بغیر مخاطب کیا جائے۔ ہندوستان میں القاب کی بڑی کثرت سے مثلاً مہاتما، مولانا، پنڈت، شیخ، سید، منشی، مولوی اور پھر مسٹر اور سکوائر۔ اب کچھ دن سے اس فہرست میں شریٹ اور شری کا بھی اضافہ ہو گیا ہے۔ ان کا استعمال بے موقع اور بے ضرورت اس کثرت سے ہوتا ہے کہ میں انہیں مٹا کر ایک اچھی مثال قائم کرنا چاہتا تھا لیکن میری ایک بھی نہیں چلی۔ محمد علی نے مجھے ایک زور شور کا تار بھیجا جس میں صدر کی حیثیت سے یہ ہدایت کی تھی کہ پرانے دستور کو جاری رکھوں اور خصوصاً گاندھی جی کو ہمیشہ مہاتما کے لقب سے مخاطب کروں۔

ان میں اور مجھ میں خدا کے وجود کے بارے میں اکثر بحث ہوا کرتی تھی۔ محمد علی کو یہ عادت تھی کہ کانگریس کی قرارداد میں بھی کسی نہ کسی عنوان سے خدا کا ذکر ضرور کر دیا کرتے تھے۔ مثلاً شکر کے طور پر یا دعا کے انداز میں۔ میں اس کے خلاف احتجاج کرتا تو وہ مجھ پر برس پڑتے اور میری بے دینی پر مجھے خوب ڈانٹتے۔ لیکن یہ عجیب بات ہے کہ بعد میں وہ ہمیشہ مجھ سے کہتے تھے کہ چاہے تم ظاہری طور پر کچھ بھی کرو لیکن دل سے تم مذہبی آدمی ہو۔ میں نے اکثر اس پر غور کیا کہ ان کے اس بیان میں کہاں تک صداقت ہے۔ پھر اس نتیجہ پر پہنچا کہ اس کا فیصلہ اس بات پر منحصر ہے کہ مذہب اور مذہبی کا مفہوم کیا قرار دیا جاتا ہے۔

میں مذہبی بحث سے ہمیشہ بچتا تھا کیونکہ میں جانتا تھا کہ اس طرح ہم دونوں کو غصہ آجائے گا۔ اور ممکن ہے کہ میری کسی بات سے ان کو تکلیف پہنچے۔ ان لوگوں سے جو کسی عقیدے کے سختی سے پابند ہوں اس موضوع پر بحث کرنا ہمیشہ دشوار ہوتا ہے خصوصاً مسلمانوں سے مذہب کے معاملے میں گفتگو کرنا غالباً دشوار تر ہے اس

لئے کہ ان کے مذہب میں آزادی رائے کی زیادہ گنجائش نہیں ہے۔ جہاں تک عقیدے کا تعلق ہے ان کا تو ایک سیدھا اور تنگ راستہ ہے جس سے مومن کو بال بھر بھی ادھر ادھر نہیں ہٹنا چاہیے۔ ہندو اس سے کچھ مختلف ہوئے ہیں اگرچہ ہمیشہ نہیں۔ چاہے عمل میں وہ کتنے ہی کڑ کیوں نہ ہوں۔ اور چاہے وہ کتنی ہی دقیقہ نوسی۔ رجعت پسندانہ اور فاسد رسوم کی پابند کیوں نہ ہوں، لیکن عام طور پر وہ مذہب کے متعلق سخت سے سخت انقلابی خیالات سننا اور ان پر گفتگو کرنا گوارا نہیں ہے۔ مسلمانوں کی طرح وہ بھی ایک تنگ اور سیدھے راستے پر چلتے ہیں۔ ذی فہم ہندوؤں کے پاس کچھ فلسفیانہ روایات ایسی ہیں جن کا اثر ان کے اعمال پر تو نہیں پڑتا لیکن مذہبی مسائل پر عقلی نقطہ نظر سے بحث کرنے میں ضرور فرق ہو جاتا ہے۔ میرے خیال میں اس کی ایک وجہ تو یہ ہے کہ ہندو مت کے دائرے میں بے حد مختلف اور بعض اوقات متضاد خیالات اور رسوم داخل ہیں۔ اکثر یہ بھی کہا جاتا ہے کہ ہندو مت پر صحیح معنی میں لفظ مذہب کا اطلاق نہیں ہوتا۔ لیکن اس کے باوجود اس کی گرفت کتنی سخت ہے اور اس میں بقا کی کتنی زبردست قوت موجود ہے۔ یہ بھی ممکن ہے کہ ایک شخص کھلم کھلا خدا کا منکر ہو (جیسے قدیم ہندو فلسفی چاروک تھا) لیکن کوئی یہ نہیں کہہ سکتا کہ یہ شخص ہندو نہیں رہا۔ جو لوگ ہندو گھرانوں میں پیدا ہوئے وہ چاہے کتنی ہی کوشش کریں۔ ہندو مت ان کا پیچھا نہیں چھوڑتا۔ میں برہمن پیدا ہوا تھا اور برہمن ہی سمجھا جاتا ہوں چاہے مذہبی اور سماجی رسموں کے متعلق میرے خیالات اور میرے اعمال کچھ ہی کیوں نہ ہوں۔ ہندوستان میں میرے نام سے پنڈت کا لقب کسی طرح جدا نہیں ہوتا۔ حالانکہ میں انتہائی کوشش کرتا ہوں کہ میرے نام کے ساتھ یہ یا اسی قسم کا اور کوئی لقب استعمال نہ کیا جائے۔ مجھے یاد ہے کہ سوزر لینڈ میں ایک مرتبہ ایک ترکی عالم سے ملنے گیا۔ ان کے پاس ایک تعارفی خط میں پہلے ہی بھیج دیا تھا اس خط میں میرا نام پنڈت جواہر لال نہرو لکھا ہوا تھا۔ جب ان سے ملاقات ہوئی تو وہ بہت متعجب

اور کچھ مایوس بھی ہوئے۔ کیونکہ پنڈت کے لقب سے وہ اس امید میں تھے کہ ان سے کوئی مقدس اور سن رسیدہ عالم ملنے آ رہا ہے۔

مجھ سے اور محمد علی سے مذہبی بحثیں نہیں ہوتی تھیں لیکن ان میں خموشی کا وصف نہیں تھا۔ آخر چند سال بعد (غالباً ۱۹۲۵ء یا شروع ۱۹۲۶ء میں) ان کو یارائے ضبط نہ رہا اور ایک دن جب میں دہلی میں ان کے گھر ان سے ملنے گیا تو برس ہی پڑے۔ کہنے لگے کہ تم سے مذہب کے معاملے میں بحث کئے بغیر نہ مانوں گا۔ میں نے انہیں باز رکھنے کی ہزار کوشش کی اور ان کو لاکھ سمجھایا کہ میرے اور آپ کے نقطہ نظر میں اتنا اختلاف ہے کہ ایک کا اثر دوسرے پر نہیں پڑ سکتا۔ لیکن وہ بھلا کب ماننے والے تھے کہنے لگے کہ ”یہ بحث تو آج ہوگی ضرور۔ تم سمجھتے ہو گئے کہ مجھے مذہبی جنون ہے لیکن میں آج یہ ثابت کر کے رہوں گا کہ مجھے جنون نہیں سچا جاذبہ ہے۔ انہوں نے مجھ سے کہا کہ میں مذہبی مسئلہ کا بہت گہرا اور وسیع مطالعہ کر چکا ہوں اور مجھے ایک الماری دکھائی جس میں مختلف مذاہب خصوصاً اسلام اور عیسائیت پر کتابیں بھری ہوئی تھیں۔ ان میں بعض جدید کتابیں ہی تھیں۔ مثلاً ایچ۔ جی۔ ویلس کی کتاب ”خدا، نا دید بادشاہ“ جنگ کے زمانے میں جب ہوئی سال نظر بند رہے تھے تو انہوں نے قرآن کو بار بار پڑھا تھا اور سب تفسیروں کا بھی مطالعہ کیا تھا۔ اس مطالعہ کے بعد وہ اس نتیجہ پر پہنچے تھے کہ قرآن میں ۹۷ فیصد ایسی باتیں جو سراسر عقل کے مطابق ہیں اور قرآن سے الگ کر کے اپنی جگہ پر بھی انہیں ثابت کیا جاسکتا ہے۔ باقی ۳ فیصد باتوں کو اگرچہ عقل پہلی نظر میں تسلیم نہیں کرتی لیکن یہ زیادہ ترین قیاس ہے کہ جب قرآن کی ۹۷ فیصد باتوں کو اگرچہ عقل پہلی نظر میں تسلیم نہیں کرتی لیکن یہ زیادہ ترین قیاس ہے کہ جب قرآن کی ۹۷ فیصد باتیں یہی طور پر صحیح ہیں تو باقی ۳ فیصد بھی صحیح ہوں گی، بہ نسبت اس خیال کے کہ ہماری ناقص صحیح ہے اور قرآن غلط۔ اس طرح قرآن کے حق میں شہادت اتنی قوی تھی کہ وہ اسے سو فیصد صحیح تسلیم کرنے لگے۔

اس دلیل کی منطق اگرچہ واضح نہ تھی لیکن میں بحث سے گریز کر رہا تھا۔ اس کے بعد جو کچھ انہوں نے کہا اس پر واقعہ مجھے بہت تعجب ہوا۔ کہنے لگے میرا ایمان ہے کہ جو کوئی بھی قرآن کے بے تعصب ہو کر تلاش حق کے خیال سے پڑھے گا وہ اس کی صحت کا ضرور قائل ہو جائے گا۔ میں جانتا ہوں کہ باپو (گاندھی جی) نے قرآن کو غور سے پڑھا ہے اور وہ ضرور اسلام کی حقانیت کے قائل ہوں گے۔ لیکن محض خود بینی کی وجہ سے اس کا اعلان نہیں کر سکتے۔

اپنے زمانہ صدارت کے بعد محمد علی رفتہ رفتہ کانگریس سے دور ہونے لگے یا شاید ان کے الفاظ میں، کانگریس ان سے دور ہونے لگی۔ یہ صورت بہت آہستہ آہستہ واقع ہوئی۔ اس کے بعد بھی کئی سال تک وہ کانگریس اور آل انڈیا کانگریس کمیٹی کے جلسوں میں شریک ہوتے اور زور شور سے حصہ لیتے رہے۔ لیکن اختلاف کی خلیج وسیع ہوتی گئی اور بیکانگی برابر بڑھتی گئی۔ اس میں غالباً کسی فرد یا افراد کا قصور نہیں تھا۔ بلکہ ان حالات کا جو ملک میں رونما ہوئے یہ لازمی نتیجہ تھا۔ وجہ کچھ بھی ہو لیکن اس افسوسناک نتیجے سے ہم میں سے بہتوں کو رنج ہوا۔ اس لئے کہ فرقہ وارانہ مسائل پر خواہ کتنا ہی اختلاف کیوں نہ رہا ہو۔ سیاسی معاملے میں بہت کم اختلاف تھا۔ ہندوستان کی آزادی کے وہ دل سے شیدائی تھے۔ اس بنا پر اس کا بہت زیادہ امکان تھا کہ فرقہ وارانہ مسائل پر بھی ان سے کوئی ایسا سمجھوتا اس بنا پر اس کا بہت زیادہ امکان تھا کہ فرقہ وارانہ مسائل پر بھی ان سے کوئی ایسا سمجھوتا ہو جاتا جو دونوں فریقوں کو پسند ہوتا۔ سیاسی حیثیت سے وہ ان رجعت پسندوں سے جو فرقہ وارانہ مفاد کے علمبردار بنتے ہیں کوسوں دور تھے۔

یہ ہندوستان کی بد قسمتی تھی کہ وہ ۱۹۲۸ء کی گرمیوں میں یورپ چلے گئے اس زمانے میں فرقہ وارانہ مسائل حل کرنے کی جان توڑ کوشش کی گئی اور کامیابی کی امید ہو چلی تھی۔ اگر محمد علی اس وقت موجود ہوتے تو یقین ہے کہ حالات کچھ اور ہوتے

لیکن ان کے واپس آنے تک پھوٹ پڑ چکی تھی۔ اور جب وہ ناچار انہیں مخالف گروہ کے ساتھ ہونا پڑا۔

دو برس بعد ۱۹۳۰ء میں جب سول نافرمانی پورے زور پر تھی اور ملک کے بیشتر آدمی قید میں پڑے تھے محمد علی کانگریس کے فیصلے کا کوئی پاس نہیں کیا اور گول میز کانفرنس میں شریک ہوئے۔ مجھے ان کے جانے سے بہت دکھ ہوا۔ میرے خیال میں وہ خود اپنی شرکت سے خوش نہ تھے۔ ان کی لندن کی سرگرمیوں سے بھی میرے اسی خیال کی تائید ہوتی ہے۔ وہاں انہیں یہ احساس ہوا کہ ان کی اصلہ جگہ آزادی کی جنگ میں تھی جو ہندوستان میں چھڑی ہوئی تھی نہ کہ اس بے نتیجہ کانفرنس کے اجلاس میں جو لندن میں ہو رہا تھا۔ مجھے یقین ہے کہ اگر وہ اپنے ملک کو واپس آ گئے ہوتے تو ضرور اس جنگ میں شریک ہو جاتے۔ ان کی صحت جواب دے چکی تھی اور کئی سال سے ان کی حالت بگڑتی جاتی تھی۔ لندن پہنچ کر انہیں یہ فکر چین نہیں لینے دیتی تھی کہ کچھ حاصل کرنا چاہیے اور کوئی معقول کام کرنا چاہیے۔ حالانکہ اس وقت انہیں علاج اور آرام کی سخت ضرورت تھی اسی فکر نے ان کی زندگی کا چراغ بہت جلد بجھا دیا۔ مینی جیل میں جب ان کی موت کی خبر پہنچی تو مجھے بہت سخت صدمہ پہنچا۔

ان سے میری آخری ملاقات ۱۹۲۹ء میں لاہور کانگریس میں ہوئی تھی۔ میرے خطبہ صدارت کے بعض حصے ان کو پسند نہیں آئے اس لئے ان پر انہوں نے بڑی سختی سے اعتراض کئے۔ انہوں نے دیکھا کہ کانگریس آگے بڑھ رہی ہے اور اس کی سیاسی سرگرمیاں زیادہ جارحانہ ہوتی جاتی ہیں۔ وہ خود جارحانہ طبیعت رکھتے تھے اس وجہ سے انہیں یہ بات پسند نہیں آتی تھی کہ وہ تو کچھلی صف میں بیٹھے رہیں اور کوئی دوسرا ان سے آگے نکل جائے۔ انہوں نے مجھے اس واقع پر یوں منبہ کیا۔ ”جواہر! میں تمہیں آگاہ کرنا چاہتا ہوں کہ تمہارے موجودہ ساتھی تمہیں چھوڑ کر بھاگ جائیں گے۔ جب نازک وقت آئے گا تو یہ لوگ تمہارا ساتھ نہیں دیں گے۔ اور تمہارے

اپنے کانگریسی تمہیں پھانسی کے تختی تک پہنچا دیں گے۔‘ کیسی ہیبت ناک پشین گوئی تھی!

کوکونا ڈا کانگریس میں جو دسمبر ۱۹۲۳ء میں منعقد ہوئی تھی۔ میری دلچسپی کا ایک خاص سامان بھی تھا۔ تمام ہندوستان کے رضا کاروں کی جماعت ’ہندوستانی سیوا دل‘ کی بنیاد وہیں رکھی گئی۔ انتظامی کام یا جیل جانے کے لئے رضا کاروں کی کمی پہلے بھی نہ تھی۔ لیکن اتحاد عمل و انضباط کی کمی ضرور تھی۔

ڈاکٹر ن۔س۔ ہارڈیکر کے ذہن میں یہ بات آئی کہ تمام ہندوستان کے رضا کاروں کی ایک ضابطہ اور منتظم جماعت قائم کی جائے اور اسے کانگریس کی ہدایات کے مطابق قومی کام کی تعلیم دی جائے۔ انہوں نے مجھ سے اصرار کیا کہ میں اس کام میں ان کی مدد کروں اور میں نے خوشی سے اسے منظور کر لیا۔ کیونکہ یہ خیال مجھے خود بہت پسند تھا۔ کوکونا ڈا میں اس کام کی ابتدا ہوئی۔ بعد میں ہمیں یہ معلوم کر کے بہت تعجب ہوا کہ کانگریس کے بڑے رہنماؤں میں سے بہت سے حضرات سیوا دل کے مخالف تھے۔ بعض کا خیال تھا کہ یہ خطرناک بدعت ہے اور اس کا مقصد یہ ہے کہ کانگریس میں ایک فوجی عنصر کا اضافہ کیا جائے۔ ان کو یہ خوف تھا کہ کہیں یہ فوجی عنصر سول عنصر پر غالب نہ آجائے۔ دوسروں کا یہ خیال معلوم ہوتا تھا کہ رضا کاروں کو صرف اتنی تربیت درکار ہے کہ اوپر سے انہیں جو حکم ملے اس کی بے چون و چرا تعمیل کریں۔ انہیں اس کی بھی ضرورت نہیں کہ وہ قدم ملا کر چلنا سیکھیں۔ اس رائے کی تہ میں غالباً یہ خیال تھا کہ ایک ایسی جماعت کا وجود جسے صف بندی اور فوجی قواعد کی تعلیم دی گئی ہو، کانگریس کے عدم تشدد کی اصول کے منافی تھا۔ لیکن ہارڈیکر نے اپنی زندگی اس کام کے لئے وقف کر دی اور سالہا سال کی ان تھک کوشش سے یہ ثابت کر دکھایا کہ تربیت یافتہ رضا کار کتنے مستعد۔ کارآمد اور اسی کے ساتھ عدم تشدد کے پابند ہو سکتے ہیں۔

جنوری ۱۹۲۴ء میں کوکونا ڈاسے واپسی کے بعد ہی الہ آباد میں مجھے ایک نئی قسم کا واقعہ پیش آیا۔ میں اپنی یادداشت سے لکھ رہا ہوں۔ لیکن ممکن ہے تاریخوں میں گڑبڑ ہو جائے، لیکن جہاں تک مجھے خیال ہے یہ کبھی یا اردھ کبھی کا زمانہ تھا جب الہ آباد میں گنگا کے کنارے اشنان کا زبردست میلہ ہوتا ہے۔ لاکھوں یاتری وہاں آتے ہیں اور گنگا جمنہ کے سنگم پر اشنان کرتے ہیں اسے تر بنی کہتے ہیں۔ کیونکہ لوگوں کا عقیدہ ہے کہ سرسوتی ندی جس کے افسانے مشہور ہیں زمین کے نیچے نیچے ان دونوں میں آ ملی ہے۔ یہاں گنگا کا پاٹ عموماً کوئی ایک میل چوڑا ہوتا ہے لیکن جاڑوں میں دریا سوکھ جاتا ہے اور بہت بڑا ریتلا میدان چھوڑ دیتا ہے۔ اس میں یاتری اترا کرتے ہیں۔ اس حصے میں گنگا کی دھار بدلتی رہتی ہیں ۱۹۲۴ء میں گنگا کی دھار کچھ اس طرح واقع ہوئی تھی کہ یاتریوں کے لئے تر بنی میں نہانا صریحاً خطرناک تھا اور اگر بعض احتیاطیں کر لی جاتیں اور ایک وقت میں اشنان کرنے والوں کی تعداد مقرر کی جاتی تو خطرے کے امکانات کم ہو سکتے تھے۔ مجھے اس معاملے میں کوئی دلچسپی نہ تھی۔ کیونکہ میں ان مقدس ایام میں گنگا میں اشنان کر کے ثواب حاصل کرنے کا قائل نہ تھا لیکن میں نے اخباروں میں پڑھا کہ صوبے کی حکومت (یا مقامی حکومت) نے یہ حکم دے دیا تھا کہ کوئی شخص تر بنی پر ہرگز نہ نہائے۔ اور اس معاملے میں پنڈت مدن موہن جی مالویہ اور حکومت کے درمیان جھگڑا چل رہا تھا۔ مالویہ جی کو اس پر مذہبی نقطہ نظر سے اعتراض تھا کیونکہ اس تقریب کا سارا مقصد ہی ہے تھا کہ تر بنی میں اشنان کیا جائے۔ حکومت بھی اپنی جگہ پر بالکل حق بجانب تھی کہ احتیاط کی تدابیر اختیار کے تاکہ زیادہ حادثے نہ ہونے پائیں اور جانیں ضائع نہ ہوں۔ لیکن حسب معمول اس نے اپنا کام نہایت کھرے اور ناگوار طریقے سے شروع کیا۔

خاص کبھی کے دن میں صبح صبح اٹھ کر میلہ دیکھنے کے لئے سنگم پر گیا۔ نہانے کا کوئی خیال نہ تھا۔ گھاٹ پر پہنچ کر مجھے معلوم ہوا کہ مالویہ جی نے ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ

کو کوئی مہذب قسم کا الٹی میٹم بھیجا تھا۔ یعنی ان سے تربیتی میں اشراف کرنے کی اجازت طلب کی تھی۔ مالویہ جی بہت برہم تھے اور ساری فضا پر جوش چھایا ہوا تھا۔ مجسٹریٹ نے اجازت دینے سے انکار کر دیا۔ اس پر مولوی جی نے سیتا گروہ کرنا طے کر لیا اور کوئی دوسو آدمیوں کو ساتھ لے کر سنگم پر روانہ ہوئے۔ مجھے اس قسم کے واقعات سے خاص دلچسپی تھی۔ چنانچہ وقت کے وقت میں بھی سیتا گروہوں میں شامل ہو گیا۔ سنگم کے قریب ریتلے میدان میں لکڑیوں کا ایک زبردست کھڑا بنا دیا گیا تھا تا کہ لوگ تربیتی تک نہ پہنچ سکیں۔ جب ہم اس اونچے کٹہرے کے قریب پہنچے تو پولیس نے ہمیں روک دیا اور ہمارے پاس جو سیڑھی تھی اسے چھین لیا۔ چونکہ ہم عدم تشدد کے ماننے والے سیتا گروہ تھے اس لئے ہم کٹہرے کے پاس ہی ریت پر خاموشی سے بیٹھ گئے۔ ہم وہاں صبح سے سہ پہر تک برابر بیٹھے رہے۔ دن چڑھتا جاتا تھا۔ دھوپ تیز ہوتی جاتی تھی۔ ریت گرم ہونے لگی اور ہم سب کو بھوک بھی لگنے لگی۔ پیدل اور سوار پولیس ہمارے دونوں طرف، پرے جمائے کھڑی تھی۔ شاید باضابطہ فوج بھی وہاں موجود تھی۔ اب ہم میں سے اکثر کو صبر کا یا راندہا اور سوچنے لگے کہ کچھ نہ کچھ کرنا چاہیے۔ میرا خیال ہے کہ حکما بھی بے چین ہو رہے تھے اس لئے انہوں نے طے کیا کہ پیش قدمی کرنا چاہیے۔ سواروں کو کچھ حکم دیا گیا۔ چنانچہ وہ گھوڑوں پر سوار ہونے لگے۔ مجھے یہ خیال پیدا ہوا (نہ جانے صحیح تھا یا غلط) کہ وہ ہم پر حملہ کرنے والے ہیں اور اس طرح ہمیں مار کر بھگانا چاہتے ہیں۔ سواروں کے ہاتھوں یوں رگیداجانا مجھے کسی طرح گوارا نہ تھا اس کے علاوہ میں بیٹھے بیٹھے بھی اکتا گیا تھا۔ اس لئے جو میرے پاس بیٹھے تھے ان سے میں نے یہ کہا کہ اب کٹہرے پر چڑھائی کرنا چاہیے۔ یہ کہہ کر میں یکا یک اس پر چڑھ گیا۔ فوراً ہی میسوں آدمی اس پر چڑھنے لگے۔ بعض نے اس میں سے چند لکڑیاں کھینچ کر پھینک دیں۔ بس پھر راستہ بن گیا کسی نے میرے ہاتھ میں ایک قومی جھنڈا دے دیا۔ میں نے اسے

کٹہرے کے ار پر لگا دیا اور خود وہیں بیٹھا رہا۔ میں اس وقت بڑے جوش میں تھا اور یہ دیکھ دیکھ کر مجھے ایک خاص لطف آ رہا تھا کہ لوگ کٹہرے پر چڑھ رہے ہیں۔ اسے پھاند پھاند کر آگے بڑھ رہے ہیں اور سوار پولیس انہیں دھکے دے دے کر پیچھے ہٹا رہی ہے۔ یہاں میں یہ ضرور کہوں گا کہ سواروں نے اپنا کام حتی الامکان اس طرح انجام دیا کہ کسی کے چوٹ نہ آنے پائے۔ وہ اپنے لکڑی کے ڈنڈے چاروں طرف گھماتے تھے۔ لوگوں کو ان سے دھکے دیتے تھے لیکن مارتے نہیں تھے۔ اس وقت انقلابی محاصروں کا ایک دھندلا سا خاکہ میری نظروں کے سامنے کھینچ گیا۔

آخر کار میں بھی دوسری طرف کو دو گائے اور چونکہ سخت تنگ و دو کی وجہ سے مجھے بوی گرمی لگ رہی تھی اس لئے میں نے بڑھ کر گنگا میں ایک غوطہ لگالیا۔ جب میں واپس آیا تو یہ دیکھ کر مجھے حیرت ہوئی کہ مالویہ جی اور بہت سے دوسرے ستیا گرہی اب بھی وہیں بیٹھے ہیں۔ لیکن اب سوار اور پیدل پولیس کاندھ سے کاندھا ملائے ستیا گرہوں اور کٹہرے کے درمیان کھڑی تھی اس لئے میں ذرا چکر کاٹ کر گیا اور مالویہ جی کے پاس پھر بیٹھ گیا۔ تھوڑی دیر تک ہم اسی طرح بیٹھے رہے۔ میں دیکھ رہا تھا کہ مالویہ جی پیچ و تاب کھا رہے ہیں۔ معلوم ہوتا تھا وہ کسی زبردست اندرونی جذبے پر قابو پانے کی کوشش کر رہے ہیں۔ یکا یک بغیر کسی سے کچھ کہے سنے پولیس والوں اور گھوڑوں کے پیچ سے عجیب و غریب طریقے سے کود کر نکل گئے۔ کوئی بھی اس طرح جست لگاتا تو دیکھ کر تعجب ہوتا۔ لیکن مالویہ جی جیسے بوڑھے اور نحیف الجشہ شخص کے لئے یہ پھرتی اور بھی حیرت انگیز تھی۔ غرض ہم سب ان کے پیچھے پیچھے چلے اور سب نے اس طرح کود کود کر نکلنا شروع کیا۔ پیدل اور سوار پولیس نے کچھ دیر تو ہمیں روکنے کی کوشش کی۔ اس کے بعد چپ ہو رہی۔ پھر تھوڑی دیر بعد وہاں سے ہٹالی گئی۔

ہمیں کچھ کچھ خیال تھا کہ حکومت ہم پر مقدمہ چلائے گی لیکن اس قسم کی کوئی

کاروائی نہیں کی گئی۔ غالباً حکومت مالویہ جی کے خلاف کوئی کاروائی نہیں کرنا چاہتی تھی اس لئے ان کے طفیل میں چھوٹے لوگ بھی صاف بچ گئے۔



میرے والد اور گاندھی جی

۱۹۴۴ء کے آغاز میں یکا یک یہ خبر ملی کہ گاندھی جی جیل میں سخت بیمار ہیں اس کے بعد وہ اسپتال میں منتقل کر دئے گئے اور وہاں ان کا آپریشن ہوا۔ سارے ملک میں انتہائی تشویش پھیلی ہوئی تھی۔ سب سناٹے میں تھے کہ دیکھیں کیا ہوتا ہے بہر حال یہ نازک وقت گزر گیا اور ملک کے گوشہ گوشہ سے جوق در جوق لوگ انہیں دیکھنے کے لئے پونا جانے لگے۔ ابھی وہ زیر حراست قیدی کی حیثیت سے اسپتال ہی میں تھے لیکن دوستوں کی ایک مقررہ تعداد سے انہیں ملنے کی اجازت تھی چنانچہ والد اور میں بھی ان سے اسپتال میں ملنے گئے۔

وہ اسپتال سے پھر جیل خانے نہیں بھیجے گئے۔ جب وہ ذرا رویہ صحت ہوئے تو حکومت نے ان کی باقی سزا معاف کر دی اور انہیں رہا کر دیا۔ وہ چھ سال میں سے دو سال کی سزا پوری کر چکے تھے۔ بمبئی کے قریب ساحل سمندر پر ایک مقام جو ہو ہے۔ رہائی کے بعد وہ بحالی صحت کے لئے وہاں چلے گئے۔

ہمارا خاندان بھی جو ہو گیا اور وہاں سمندر کے کنارے ایک چھوٹی سی کٹی میں ٹھہر گیا۔ ہم کئی ہفتے وہاں رہے اور ایک عرصے کے بعد مجھے دل بھر کر تفریح کا موقع ملا۔ میں بے تکلف سمندر میں تیرتا تھا۔ ساحل پر دوڑتا تھا اور گھوڑے کی سواری کرتا تھا۔ لیکن ہمارے وہاں جانے کا اصل مقصد تفریح نہ تھا۔ بلکہ ہم گاندھی جی سے گفتگو کرنے لے لئے وہاں گئے تھے۔ والد یہ چاہتے تھے کہ ان کے سامنے سوراخیوں کا نقطہ نظر پیش کریں اور اگر عملی امداد نہیں تو کم سے کم ان کا خاموش تعاون ہی حاصل ہو جائے۔ میں بھی ان مسائل پر جو دن رات میرے لیے دل میں کانٹے کی طرح کھٹکتے تھے ان سے گفتگو کرے تسکین حاصل کرنا چاہتا تھا۔ اصل میں مجھے یہ معلوم کرنا تھا کہ آئندہ ان کا عملی پروگرام کیا ہوگا۔

جو ہو کے بحث مباحثے میں سورا جی گاندھی جی کی تائید حاصل کرنے میں

کامیاب نہیں ہوئے اور نہ انہیں ذرا بھی متاثر کر سکے۔ بات چیت بہت دوستانہ طریقے سے ہوئی اور ایک دوسرے سے بہت اخلاق سے پیش آئے لیکن اس کے باوجود حقیقت میں کوئی سمجھوتہ نہیں ہو سکا۔ دونوں کو یہ تسلیم کرنا پڑا کہ ہم ایک دوسرے سے متفق نہیں ہو سکتے چنانچہ اخباروں میں اسی مضمون کے اعلان شائع کر دئے گئے۔

میں بھی جو ہو سے کچھ مایوس لوٹا۔ کیونکہ گاندھی جی میرے شبہات کو بھی رفع نہیں کر سکے۔ حسب عادت انہوں نے آئندہ کی فکر میں سرکھپانے سے یا ایک طویل عرصے کے لئے کوئی پروگرام بنانے سے انکار کر دیا۔ ان کا قول تھا کہ ہمیں نہایت استقلال کے ساتھ قوم کی خدمت کرتے رہنا چاہیے اور کانگریس کی تعمیری اور اصلاحی پروگرام پر عمل کرنا چاہیے۔ یہاں تک کہ جارحانہ کارروائی کا وقت آجائے لیکن میرے دل میں اصلی شبہ یہ تھا کہ فرض کیجئے وہ وقت آ بھی جائے تو کیا چورا چوری کا سا کوئی واقعہ پیش نہ آئے گا جو ہماری تمام امیدوں پر پانی پھیر دے اور دوبارہ ہماری تحریک کو روک دے؟ اس نے سوال کا انہوں نے کوئی جواب نہیں دیا۔ اس کے علاوہ ان کے ذہن میں کوئی واضح اومعین منزل مقصود نہیں تھی لیکن ہم میں سے اکثر لوگ یہ سمجھنا چاہتے تھے کہ آخر ہم کدھر جا رہے ہیں۔ ہمیں اس پر اصرار نہیں تھا کہ آیا کانگریس مکمل آزادی اور کسی حد تک سماجی انقلاب کی حامی ہے یا ہمارے رہنما اس سے بہت کم پر راضی ہو جائیں گے؟ ابھی چند مہینے پہلے میں نے صوبہ متحدہ کی کانفرنس ۲۳ء کے موسم خزاں میں ہوئی تھی۔ یعنی نابھے سے میری واپسی کے تھوڑے ہی دن بعد۔ ان دونوں میں اس مرض میں مبتلا تھا جو نابھے سے تحفے کے طور پر اپنے ساتھ لایا تھا۔ میں کانفرنس میں شریک تو نہیں ہو سکا لیکن میرا خطبہ صدارت وہاں پڑھ کر سنایا گیا جو میں نے تیز بخار میں لیٹے لیٹے لکھا تھا۔

ایک طرف تو ہم کانگریس میں مکمل آزادی کے مسئلے کو صاف کرنا چاہتے تھے اور

دوسری طرف ہمارے لبرل دوست ہم سے اتنے دور ہوتے جاتے تھے۔ (یایوں کہیںے کہ ہم انہیں اتنا پیچھے چھوڑتے جاتے تھے) کہ وہ کھلم کھلا سلطنت برطانیہ کے جاہ و حشم پر اترتے تھے۔ حالانکہ سلطنت ہمارے ہموطنوں کی طرح رکھتی تھیں یا انہیں گھسنے تک نہیں دیتی تھیں۔ مسٹر شاستری سفیر بن بیٹھے تھے۔ اور سر تیج بہادر سپرو نے ۱۹۲۳ء کی اپریل کانفرنس (لندن) میں بڑے فخر سے یہ اعلان کیا تھا کہ ”مجھے اس بات پر ناز ہے کہ آج میرا ہی ملک سلطنت کو سلطنت بنائے ہوئے ہے۔“

غرض ہمارے اور ان لبرل لیڈروں کے درمیان کوئی معمولی خلیج نہیں بلکہ زبردست سمندر حائل تھا۔ ہم ایک دوسرے سے مختلف دنیا میں بستے تھے مختلف زبانیں بولتے تھے اور مختلف قسم کے خواب دیکھتے تھے (مجھے اسی میں شک ہے کہ وہ کوئی خواب دیکھتے بھی تھے) اس لئے کیا یہ مناسب نہیں تھا کہ ہماری منزل مقصود واضح اور معین ہو جاتی؟ لیکن یہ خیالات اس وقت معدودے چند اشخاص تک محدود تھے تعین اکثر حضرات کو پسند نہیں ہوتا۔ خصوصاً قومی تحریک میں جو فطرتاً بہم اور تھوڑی بہت پر اسرار ہوتی ہے۔

۱۹۲۴ء کے آغاز میں پبلک کی توجہ زیادہ تر ان سوار جیوں کی طرف تھی جو اسمبلی اور کونسلوں میں گئے تھے۔ لوگ انتظار میں تھے کہ دیکھیں یہ جماعت ”گھر میں گھس کر مخالفت کرنے“ اور کونسلوں کو توڑنے کے لمبے چوڑے دعوں کے بعد وہاں کیا کرتی ہے۔ بہر حال شروع شروع میں سوار جیوں نے دو چار اثر ڈالنے والے کام کئے۔ اسمبلی نے سال آئندہ کا بجٹ نام منظور کر دیا۔ اور ہندوستان کی آزادی کا مسئلہ طے کرنے کے لیے گول میز کانفرنس کے مطالبے کی قرارداد منظور کی۔ بنگال کونسل نے بھی دیش بندھو کی رنہری میں سرکاری اخراجات کے مطالبے کو ٹھکرا دیا لیکن اسمبلی اور صوبوں کی کونسلوں دونوں میں وائسرائے یا گورنر نے ان نام منظور شدہ بجٹوں پر اپنی منظوری صادر فرمادی اور یہ حسب معمول نافذ ہو گئے۔ کونسلوں میں کچھ ذوردار

تقریریں ہونیں، کچھ جوش و خروش کا مظاہرہ ہوا۔ تھوڑی دیر کے لئے سوراہیوں کو اپنی فتح کا نشہ ہو گیا۔ اور اخباروں میں موٹی موٹی سرخیوں سے مضمون نکلے لیکن اس کے آگے اور کچھ نہ تھا۔ اس سے زیادہ کربہی کیا سکتے تھے، سو اس کے کہ وہ انہیں ترکیبوں کو بار بار دہراتے۔ مگر اب ان میں کوئی جدت نہیں رہی تھی۔ لوگوں کو جوش و خروش ختم ہو گیا اور وہ اس کے عادی ہو گئے کہ وائسرائے یا گورنر نے نامنظور بجٹ یا قانون کو منظور کر کے نافذ کر دیا۔ اس کے آگے جو قدم اٹھایا جاسکتا تھا وہ کونسلوں کے اندر سوراہیوں کے امکان سے باہر تھا۔ وہ تو صرف ایوان کونسل کے باہر ہی ممکن تھا۔ اسی سال وسط ۱۹۲۴ء میں آل انڈیا کانگریس کمیٹی کا ایک جلسہ احمد آباد میں ہوا۔ اس جلسے میں گاندھی جی اور سوراہیوں کے درمیان خلاف توقع ایک تیز جھڑپ ہو گئی۔ اور عجیب تماشا ہوئے۔ ابتدا گاندھی جی نے کی۔ انہوں نے کانگریس کے دستور میں بعض بنیادی تبدیلیوں کی تجویز پیش کی جس سے رکنیت کے قواعد اور رائے دہندگی کی نوعیت بدل گئی۔ اب تک جو شخص کانگریس کے آئین کی پہلی دفعہ کو تسلیم کرتا تھا۔ (یعنی سوراج کامسک اور پر امن ذرائع سے اس کا حاصل کرنا) اور چار آنے سالانہ ادا کرتا تھا وہ کانگریس کا رکن بن سکتا تھا۔ اب وہ رکنیت ان لوگوں تک محدود کر دینا چاہتے تھے۔ جو چار آنے کے بجائے اپنے ہاتھ کے کتے ہوئے سوت کی ایک مقررہ مقدار داخل کریں۔ اس تجویز سے حق رائے دہی پر زبردست اثر پڑتا تھا۔ اس لئے آل انڈیا کانگریس کمیٹی کو یہ اختیار نہ تھا کہ وہ اس مسئلے کا فیصلہ کرے۔ لیکن اگر دستور کے الفاظ یا اس کے ظاہری شکل کبھی گاندھی جی کے راستے میں حائل ہوتی تھی تو اس کی ذرا بھی پروا نہیں کرتے تھے۔ میں اسے کانگریس کے دستور کی توہین سمجھتا تھا اس لئے مجھے گاندھی جی کے اس طرز عمل سے سخت صدمہ ہوا اور میں نے ورکنگ کمیٹی کے سامنے سکرٹری کے عہدے سے استعفیٰ پیش کر دیا۔ اس کے بعد بعض نئی صورتیں پیدا ہو گئیں اور میں نے اپنے استعفیٰ پر اصرار نہیں کیا۔ آل انڈیا کانگریس کمیٹی کے

جلے میں میرے والد اور مسٹری۔ آر۔ داس نے اس تجویز کی بڑی شد و مد سے مخالفت کی۔ اور بالآخر اپنی ناپسندیدگی کا اظہار کرنے کی غرض سے وہ اپنے بہت سے ساتھیوں سمیت رائے شماری سے پہلے جلے سے اٹھ کر چلے گئے۔ پھر بھی وہ اپنے بہت سے مخالف جلے میں بیٹھے رہے۔ یہ تجویز اکثریت سے منظور ہو گئی۔ لیکن آخر کار واپس لے لی گئی۔ کیونکہ گاندھی جی پر سوار جیوں کے اٹھ کر چلے جانے کا اور اس مسئلے پر دلہش بندھوا اور والد کے سخت رویہ کا بے حد اثر ہوا۔ ان کے جذبات میں سخت ہیجان تھا۔ کسی رکن نے اتفاقاً کوئی ایسا فقرہ کہہ دیا جس سے وہ پھوٹ پڑے۔ صاف ظاہر ہوتا تھا کہ انہیں روحانی تکلیف پہنچی ہے۔ انہوں نے کمیٹی کے سامنے بڑے رقت انگیز انداز میں تقریر کی۔ جس سے اکثر اراکین کے آنسو نکل آئے۔ یہ بڑا غیر معمولی اور دل ہلا دینے والا سماں تھا (۱)

معلوم نہیں کہ وہ صرف سوت کا تنے کو رائے دہندگی کی شرط قرار دینے پر اتنے کیوں مصر تھے۔ کیونکہ انہیں علم تھا کہ اس کی سخت مخالفت ہو گئی۔ شاید وہ چاہتے تھے کہ کانگریس میں صرف وہ لوگ رہیں جو ان کے کھادی وغیرہ کے تعمیری پروگرام کے حامی ہوں۔ اس لئے وہ چاہتے تھے کہ دوسرے یا تو اس کے قائل ہو جائیں یا نکل جائیں لیکن اگرچہ انہیں اکثریت حاصل تھی پھر بھی وہ اپنے ارادے میں نرم پڑ گئے۔ اور فریق ثانی سے سمجھوتا کرنے لگے۔ مجھے یہ دیکھ کر سخت حیرت ہوتی کہ آئندہ دو تین ماہ میں انہوں نے اس مسئلے میں کتنے پلٹے کھائے۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ وہ خود چکر میں ہیں اور ان کی سمجھ میں نہیں آتا کہ کہاں ہیں اور کدھر جانا چاہتے ہیں۔ کم سے کم ان کی نسبت مجھے یہ توقع نہ تھی کہ ان کی بھی ایسی حالت ہو سکتی ہے۔ میرے تعجب کی بس یہی وجہ تھی ورنہ خود یہ مسئلہ کوئی بڑی اہمیت نہیں رکھتا تھا۔ یہ خیال اپنی جگہ پر بہت مناسب تھا کہ جسمانی محنت رائے دہندگی کی شرط قرار دی جائے لیکن اس محدود شکل میں اسے پیش کرنے سے اس کا سارا مفہوم ہی خبط ہو جاتا تھا۔

میں اس نتیجے پر پہنچا کہ گاندھی جی کو ان مشکلات کا سامنا محض اس لئے ہے کہ وہ نامانوس میدان سے گزر رہے ہیں۔ ستیاگرہ کی عملی جدوجہد کے نشیب و فراز سے وہ خوب واقف ہیں اس لئے خود بخود ان کا قدم بالکل صحیح پڑتا ہے۔ وہ سماجی اصلاح کے لئے عوام میں نہایت خاموشی سے خود کام کرنے اور دوسروں سے کام لینے میں ید طولیٰ رکھتے ہیں وہ خالص جنگ یا خالص صلح کے قائل تھے۔ کسی درمیانی چیز کو پسند نہیں کرتے تھے۔ اس لئے سورا جیوں کے اس پروگرام سے کہ کونسلوں کے اندر جا کر حکومت کو پریشان کریں انہیں کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ ان کا خیال تھا کہ اگر کوئی شخص کونسلوں میں جانا چاہتا ہے تو وہ اس مقصد سے جائے کہ حکومت کے ساتھ تعاون کر کے اچھے اچھے قوانین بنوائے گا۔ اسے زیادہ آئینی طریقے سے حکومت کرنے پر مجبور کرے گا، وغیرہ وغیرہ، لیکن مخالفت کے خیال سے وہاں جانے کے کوئی معنی نہیں ہیں اور اگر مخالفت کرنا ہے تو اسے کونسلوں کے باہر رہنا چاہیے۔ سورا جی ان دونوں حالتوں کے بین بین تھے۔ یہی وجہ تھی کہ گاندھی جی کے اور ان کے تعلقات میں گتھیاں پڑ گئی تھیں۔

آخر کار انہوں نے لوگوں کے ساتھ تصفیہ کر لیا۔ سوت کا تنے کی شرط اختیاری قرار دے دی گئی اور چار آنے ادا کر کے ممبر بننے کا اصول بھی قائم رہا۔ کونسلوں میں سورا جیوں کے کام کو گاندھی جی نے آشر باد بھی دی، لیکن جہاں تک ان کی ذات کا تعلق تھا وہ قطعاً علیحدہ رہے۔ لوگ یہ کہنے لگے کہ وہ سیاسیات سے کنارہ کش ہو گئے ہیں۔ اور حکومت اور اس کے عمال نے یہ سمجھ لیا کہ ان کی ہر دھڑکی کم ہو گئی اور ان کی قوت ختم ہو چکی ہے۔ بعض لوگوں کا خیال تھا کہ داس اور نہرو نے انہیں میدان میں نکال دیا۔ اور اب سیاسیات میں انہیں دونوں کا سکہ چلتا ہے۔ گذشتہ پندرہ برس میں کم و بیش انہیں خیالات کا بار بار اعادہ کیا گیا ہے اور ہر مرتبہ ثابت ہو گیا ہے کہ ہمارے حکمران ہندوستانیوں کے جذبات سے کس قدر نا آشنا ہیں۔ حقیقت یہ ہے

کہ جب سے گاندھی جی ہندوستان کے سیاسی مطلع پر نمودار ہوئے ہیں جہاں تک عوام کا تعلق ہے ان کی مقبولیت میں کبھی کمی نہیں آئی بلکہ اس میں بتدریج اضافہ ہوتا رہا ہے اور یہ ترقی اب بھی جاری ہے۔ لوگ چاہے ان کے حکم کی تعمیل نہ کریں کیونکہ انسان فطرتاً کمزور ہوتا ہے۔ لیکن ان کے دل مہاتما کی عقیدت سے معمور ہیں۔ جب حالات موافق ہوتے ہیں تو لوگ اٹھ کھڑے ہوتے ہیں اور زبردست تحریکوں میں شامل ہو جاتے ہیں ورنہ خاموش بیٹھے رہتے ہیں۔ دنیا کا کوئی رہنما کسی عام تحریک کو جادو کے ذریعے وجود میں نہیں لاتا۔ بلکہ جب موزوں حالات پیدا ہو جاتے ہیں تو ان سے فائدہ اٹھاتا ہے۔ وہ ان حالات کے لئے لوگوں کو تیار کر سکتا ہے۔ حالات کو پیدا نہیں کر سکتا۔

ہاں یہ صحیح ہے کہ تعلیم یافتہ طبقے میں ان کا اثر گھٹنا بڑھتا رہتا ہے۔ جب تحریک کا زور ہوتا ہے تو یہ لوگ ان کی پیروی کرنے لگتے ہیں، جب وہ سست پڑ جاتی ہے تو نکتہ چینی شروع کر دیتے ہیں۔ پھر بھی ان کی جو عظمت لوگوں کے دلوں میں ہے اس میں کوئی فرق نہیں آنے پاتا۔ شاید اس کی وجہ یہ بھی ہے کہ کوئی دوسرا موثر پروگرام موجود نہیں ہے۔ لبرل اور ان ہی کی طرح کی دوسری جماعتیں، مثلاً جوابی تعاون کے حامی، کسی شمار میں نہیں ہیں۔ تحویف پسند جدید تہذیب میں ٹکسال باہر ہیں۔ اور ان کو کوئی اثر نہیں ہے۔ اشتراکی پروگرام ابھی اچھی طرح روشناس نہیں ہوا ہے اور کانگرس کے اونچے طبقے کے اراکین اس سے ڈرتے ہیں۔

۱۹۲۳ء کے وسط میں معمولی سے سیاسی اختلاف کے بعد گاندھی جی اور والد کے درمیان قدیم مراسم بھی پھر قائم ہو گئے بلکہ ان میں اور زیادہ خلوص پیدا ہو گیا۔ چاہے ان میں کتنا ہی اختلاف کیوں نہ ہوتا، لیکن ایک دوسرے کا غیر معمولی لحاظ کرتے اور حفظ مراتب میں کبھی فرق نہ آنے پاتا۔ آخر گاندھی جی میں وہ کون سی بات تھی جس کی وہ اتنی عزت کرتے تھے؟ گاندھی جی کی تحریروں کا ایک انتخاب

خیالات کے دھارے“ کے نام سے کتابی صورت میں شائع ہوا ہے۔ والد نے اس پر مقدمہ لکھا ہے۔ یہ مقدمہ اس معاملے میں ان کے خیالات کا آئینہ ہے۔

وہ تحریر فرماتے ہیں ”میں نے مہاتماؤں اور مانوق الفطرت انسانوں کے تذکرے سنے ہیں۔ لیکن کبھی ان کی زیارت کا اتفاق نہیں ہوا ہے۔ اس لئے مجھے ان کے وجود میں شک ہے۔ میں تو انسانوں اور انسانی باتوں کا قائل ہوں۔ یہ خیالات کے دھارے“ جو اس کتاب میں جمع کئے گئے ہیں۔ ایک انسان کی فکر کا نتیجہ اور انسانی باتیں ہیں۔ وہ انسانی فطرت کی وہ زبردست خصوصیات کے مظہر ہیں یعنی عقیدہ اور طاقت۔۔۔۔۔

جو شخص نہ عقیدہ رکھتا ہے اور نہ طاقت، یہ سوال کرتا ہے کہ آخر ان سب باتوں کا نتیجہ کیا ہے؟ یہ جواب کہ ”فتح یا موت“ اسے معمن نہیں کر سکتا۔۔۔۔۔ لیکن ایک عاجز اور مسکین شخص غیر متزلزل عقیدے اور غیر مفتوح طاقت کی بنیادوں پر قدم جمائے سیدھا کھڑا ہے اور اپنے ہموطنوں کو مادر وطن کی خاطر قربانی کرنے اور مصیبتیں بھیلنے کا پیغام دے رہا ہے۔ اور یہ پیغام لاکھوں کروڑوں دلوں پر اثر کر رہا ہے۔۔۔۔۔

اس کے بعد انہوں نے سوئن برن کے ایک مصرعہ پر اپنے مقدمے کے ختم کیا ہے۔

”کیا ہم میں شاہانہ آن بان کے لوگ نہیں،

جو دنیا کی چیزوں پر اپنا سکہ بٹھا دیتے ہیں۔“

یعنی وہ اس چیز پر زور دینا چاہتے ہیں کہ وہ ولی یا مہاتما کی حیثیت سے نہیں بلکہ انسان کی حیثیت سے گاندھی جی کے قائل ہیں۔ وہ خود بہت قوی اور محکم ارادہ رکھتے تھے اس لئے گاندھی جی کے عزم و استقلال کی بھی قدر کرتے تھے۔ کیونکہ ظاہر ہے کہ اس دبلے پتلے کمزور شخص میں فولاد کی سی قوت اور پہاڑ کا ثبات موجود ہے اور وہ

دنیا کی بڑی سے بڑی طاقت کے سامنے نہیں جھکتا۔ اگرچہ گاندھی جی شکل سے کم رو معلوم ہوتے ہیں اور ان کا لباس ایک لنگوٹی سے زیادہ نہیں لیکن ان میں ایک شاہانہ رعب و جلال موجود ہے جس کی وجہ سے لوگ خود بخود ان کے سامنے جھک جاتے ہیں۔ وہ جان بوجھ کر عجز و انکسار کرتے ہیں لیکن وہ زبردست قوت و اقتدار کے مالک ہیں اور نہیں خود اس کا احساس ہے۔ کبھی کبھی تو وہ ایسے تحکم کے انداز سے حکم دیتے ہیں کہ جوان کی زبان سے نکلے سب کو ان کی تعمیل کرنی پڑتی ہے۔ ان کی پرسکون اور گہری نظریں لوگوں کو مسحور کر لیتی ہیں اور چپکے چپکے ان کے نفس کی گہرائیوں میں اتر جاتی ہیں۔ ان کی صاف اور واضح آواز سننے والوں کے دل میں سما جاتی ہے اور اس کے جذبات پر اثر ڈالتی ہے۔ چاہے ان کا مخاطب ایک فرد ہو یا ہزاروں افراد، ان کا جادو سب سے برابر چلتا ہے اور اس جذبے کو عقل سے بہت کم تعلق ہے۔ گو وہ اس چیز کو بھی نظر انداز نہیں کرتے کہ اپنی ابت عقلی طور پر لوگوں سے منوالیں لیکن اس میں کوئی شک نہیں کہ عقل اور دلیل کو ان کے یہاں ثانوی حیثیت حاصل ہے انہوں نے تسخیر کا یہ عمل خطابت کے جادو یا دلکش لفظوں کے افسوں کے ذریعے سے نہیں کیا ہے۔ ان کی زبان تو بالکل سیدھی سادی ہوتی ہے اور شاید وہ ایک لفظ بھی بے محل اور بے ضرورت استعمال نہیں کرتے۔ اصل میں ان کے انتہائی خلوص اور ان کی زبردست شخصیت نے لوگوں کے دلوں پر قبضہ کر لیا اور لوگوں کو یہ محسوس ہونے لگا کہ ان کے اندر قوتوں کے خزانے پوشیدہ ہیں۔ شاید اس کی یہ بھی وجہ ہو کہ ان کے متعلق کچھ ایسی روایات قائم ہو گئی ہیں جنہوں نے ایک موثر فضا پیدا کر دی ہے۔ ممکن ہے کہ ایک اجنبی شخص پر جوان روایات سے واقف نہ ہو اور اس فضا سے ہم آہنگ نہ ہو، اس عمل تسخیر کا اتنا اثر نہ ہو۔ پھر بھی گاندھی جی کو یہ کمال حاصل ہے کہ وہ اپنے مخالف کو اپنی طرف کر لیتے ہیں یا کم سے کم اس کے جوش مخالفت کو ٹھنڈا کر دیتے ہیں۔

گاندھی جی حسن فطرت کے شیدا ہیں لیکن انسان کی بنائی ہوئی چیزوں کے حسن اور کاریگری کی انہیں بہت کم حس ہے۔ مثلاً تاج محل کو موزیوروں کے بیگار کی یادگار سمجھتے ہیں۔ ان کی قوت شامہ بھی بہت کمزور ہے لیکن اس کے باوجود انہوں نے اپنی ضرورت کے مطابق فن زندگی کے اصول معلوم کر لئے اور بحیثیت مجموعی اپنی زندگی میں ایک خاص حسن پیدا کر لیا۔ ان کے ہر ادا میں ایک معنویت اور لطافت ہے۔ ایک نغمہ بھی خارج از آہنگ نہیں۔ ان میں وہ ناہمواری اور ناتراشی، وہ سوقیانہ پن اور عامیانہ پن نام کو بھی نہیں جو بد قسمتی سے ہمارے اوسط طبقے میں بہت عام ہے۔ انہیں اطمینان قلب کی دولت حاصل ہے۔ وہ اسے دوسروں کو بانٹتے ہوئے زندگی کی دشوار گزار راستوں پر ہمت اور مضبوطی سے قدم رکھتے ہوئے بڑھتے چلے جا رہے ہیں۔

میرے والد ان سے کس قدر مختلف تھے لیکن وہ زبردست شخصیت کے مالک تھے اور ان میں بھی ایک حد تک وہی شاہانہ انداز موجود تھا۔ انہوں نے سون برن کا جو شعر گاندھی جی کے متعلق لکھا ہے وہ خود ان پر بھی صادق آتا ہے۔ وہ جس مجلس میں بھی بیٹھ جاتے سب سے سر بلند اور ممتاز نظر آتے۔ جس محفل میں موجود ہوتے، بقول ایک مشہور انگریز جج کے، اسکے صدر ہی معلوم ہوتے۔ ان میں نہ عاجزی تھی نہ نرمی اور گاندھی جی کے برعکس وہ اپنے مخالفوں سے بدلہ لئے بغیر نہیں چھوڑتے تھے۔ وہ جان بوجھ کر حکم سے کام لیتے تھے، اس لئے لوگ ان سے یا انتہائی عقیدت رکھتے تھے یا زبردست مخالفت، ان کے ساتھ غیر جانب داری کا احساس رکھنا ناممکن تھا۔ ہر شخص مجبور تھا کہ ان سے محبت کرے یا نفرت، ان کی فراخ پیشانی، بچھے ہوئے ہونٹ، پر عزم ٹھوڑی، غرض مجموعی شکل شاہان روم کے ان مجسموں سے بہت ملتی جلتی تھی جو اٹلی کے عجائب خانے میں محفوظ ہیں۔ میرے بہت سے اطالوی دوستوں نے ان کی تصویر دیکھ کر اس مشابہت کی تصدیق کی۔ آخر عمر میں جب ان کے بال ریشم

کی طرح سفید ہو گئے تھے۔ (میری طرح ان کے بال گرے نہیں بلکہ آ کر تک رہے) تو ان میں ایک عجیب شوکت اور وقار پیدا ہو گیا تھا جو افسوس ہے آج کل کے لوگوں میں ڈھونڈنے نہیں ملتا۔ ممکن ہے کہ میں اپنی محبت کی بنا پر اس معاملے میں کچھ غلو کر رہا ہوں لیکن آج اس دنیا میں جو چھپو رہے پن اور کمزوریوں سے بھری ہے مجھے ان کی شاندار شخصیت کی بڑی کمی محسوس ہوتی ہے چاروں طرف اس زیر دست عزم و ثبات کو تلاش کرتا ہوں جس کے وہ مالک تھے، لیکن آج وہ کہیں نظر نہیں آتا۔

مجھے یاد ہے کہ ۱۹۲۲ء میں جب گاندھی جی اور سوراج پارٹی میں خوب چل رہی تھی میں نے انہیں والد کی ایک تصویر دکھائی تھی۔ اس تصویر میں والد کی مونچھیں نہیں تھیں۔ اس سے پہلے گاندھی جی نے ہمیشہ والد کے چہرے پر بڑی خوشنما مونچھیں دیکھی تھیں۔ وہ اس تصویر کو دیکھ کر چونک پڑے اور دیر تک غور کرتے رہے۔ کیونکہ مونچھوں کے نہ ہونے سے دہانے اور ٹھوڑی کی درشتی نمایاں ہو گئی تھی۔ انہوں نے ذرا خشک مسکراہٹ کے ساتھ کہا اب مجھے معلوم کیسے شخص کا مقابلہ کرنا ہے۔ لیکن والد کی آنکھوں سے اور ان شکنوں سے جو اکثر ہنستے رہنے سے ان کے چہرے پر پڑ گئی تھیں۔ ان کی صورت میں ایک خاص نرمی پیدا ہو گئی تھی البتہ کبھی کبھی یہ آنکھیں غصے سے چمک بھی اٹھتی تھیں۔

والد کے لئے اسمبلی کا کام ایسا تھا جیسے 'مٹچ تالاب' میں تیرتی ہے۔ اپنی قانونی اور دستوری تربیت کی وجہ سے ان کی طبیعت کو اس سے خاص مناسبت تھی۔ وہ ستیا گرہ اور اس کی باریکیوں سے اتنے واقف نہ تھے جتنے اس کام کے نشیب و فراز سے۔ انہوں نے اپنی پارٹی میں سختی سے انضباط قائم رکھا اور دوسرے افراد اور جماعتوں کی حمایت بھی حاصل کر لی۔ لیکن زیادہ عرصہ نہیں گزرنے پایا تھا کہ خود ان کے آدمی انہیں پریشان کرنے لگے۔ سوراج پارٹی کو اپنے ابتدائی زمانے میں کانگریس کے اندر ان لوگوں سے مقابلہ کرنا تھا جو ترک موالات کے پرانے پروگرام

میں تبدیلی کے مخالف تھے۔ اس لئے اس میں بہت سے نااہل لوگ بھی شامل کر لئے گئے تاکہ کانگریس میں پارٹی کو قوت بڑھ جائے۔ اس کے بعد انتخابات کا موقع آیا۔ اس کے لئے روپیہ کی ضرورت تھی اور روپیہ امیروں سے مل سکتا تھا۔ اس لئے ان کی دلجوئی ضروری تھی بلکہ ان میں سے بعض سوراہی امیدوار بنا کر کھڑے کئے گئے۔ سیاسیات کے متعلق امریکہ کے ایک اشتراکی کے رائے سر اسٹیفورڈ کرپس نے لکھ ہے۔ وہ فرماتے ہیں کہ ”سیاست وہ نازک فن ہے جس میں غریبوں سے ووٹ اور امیروں سے اپنے کام کے لئے روپیہ لیا جاتا ہے اور ان میں سے ہر ایک سے یہ وعدہ کیا جاتا ہے کہ ہم تمہیں دوسرے سے بچائیں گے۔“

ان تمام عناصر نے شروع ہی سے پارٹی کو کمزور کر دیا تھا۔ جب اسمبلی اور کونسلوں میں کام شروع ہوا تو اعتدال پسند جماعتوں سے سمجھوتے کرنے پڑے اور وہ جہاد کی شان زیادہ عرصے تک باقی نہیں رہی۔ رفتہ رفتہ پارٹی کی شعلہ مزاجی کم ہونے لگی اور انضباط بگڑنے لگا۔ کمزور طبیعت کے لوگ اور ابن الوقت موقع پا کر اسے بدنام کرنے لگے۔ سوارج پارٹی نے کونسلوں پر اس دعوے کے ساتھ حملہ کیا تھا کہ حریفوں کی صفوں میں گھس کر لڑیں گے، لیکن حریف بھی اس کھیل میں استاد تھے چنانچہ حکومت نے طے کے اکہ وہ سوراہیوں کی صفوں میں پھوٹ ڈال کر اپنا کام بنائے گی۔ ہمارے کمزور طبیعت والے بھائیوں کے سامنے اعلیٰ عہدے پیش کئے گئے اور طرح طرح کی لالچیں دی گئیں۔ ان کا نہیں قبول کرنا تھا کہ ان کی قابلیت ان کے تدبیر اور ان کی معقول پسندی کی تعریفوں کے پل باندھ دئے گئے۔ ان کے چاروں طرف ایسی خوشگوار اور موزوں فضا پیدا کر دی گئی جو کھیتوں اور بازاروں کے شور و غبار سے قطعی مختلف تھی۔ پھر وہ اس سے نکل کر کہاں جاسکتے تھے۔ غرض سوراہیوں کی عام اخلاقی حالت گرنے لگی۔ ایک ایک کر کے دوسری طرف کھسکنے لگے۔ میرے والد بہت چپخے چلائے اور انہوں نے دھمکی دی کی ”بیمار

عضو، کوکاٹ کر پھینک دیں گے لیکن اس دھمکی کا کیا اثر ہو سکتا تھا جبکہ وہ عضو خود ہی جدا ہونے کو تیار تھا۔ بعض سوراہی وزیر بن گئے بعض مختلف صوبوں میں گورنر کی اگزیکیوٹو کونسل کے رکن ہو گئے۔ کچھ نے ایک علیحدہ جماعت ”حامیان جوابی تعاون“ کے نام سے قائم کر لی۔ یہ اصطلاح لوگمانیہ تلک نے بالکل مختلف معنوں میں استعمال کی تھی۔ اب تو اس کا یہ منہ بوم لیا جاتا ہے کہ جب کوئی عہدہ ملے اسے قبول کر لو اور اسے پورا فائدہ اٹھاؤ۔ ان خرابیوں کے باوجود سوراہی پارٹی کا کام چلتا رہا لیکن والد اور مسٹر داس ان باتوں سے بہت دل برداشتہ ہو گئے تھے اس کے علاوہ وہ کونسلوں کے بے نتیجے کام سے بھی اکتا گئے تھے۔ اس پر طرہ یہ کہ شمالی ہندو مسلمانوں میں کشیدگی ہو گئی جو برابر بڑھتی جاتی تھی اور کبھی کبھی فرقہ وارانہ فساد کی صورت اختیار کر لیتی تھی۔

بعض کانگریسی جو ہمارے ساتھ ۱۹۲۱ء اور ۱۹۲۲ء میں جیل گئے تھے اب وزیر تھے یا اعلیٰ سرکاری عہدوں پر مامور تھے۔ ۱۹۲۱ء میں تو ہمیں اس پر فخر تھا کہ اس حکومت نے ہمیں مجرم قرار دیا تھا اور جیل بھیجا تھا جس کے رکن بعض لبرل تھے (یہ بھی کسی زمانے میں کانگریسی تھے) لیکن اب ہم جانتے تھے کہ بعض صوبوں میں ہمیں خود اپنے رفیقوں کے ہاتھوں مجرم بننے اور جیل بھیجے جانے کا فخر حاصل ہو گا۔ یہ نئے وزیر اور اگزیکیوٹو کونسل کے رکن لبرلوں کے مقابلے میں اس کام کے لئے زیادہ موزوں تھے۔ وہ ہم سے اور ہماری کمزوریوں سے واقف تھے اور یہ جانتے تھے کہ ہم سے کس طرح فائدہ اٹھایا جاسکتا ہے۔ وہ ہمارے کام کے طریقوں سے بھی اچھی طرح آشنا تھے اور انہیں عوام کے جذبات اور مجمع کے ذہنیت کا بھی تھوڑا بہت تجربہ تھا۔ نازیوں کی طرح انہوں نے بھی برسر حکومت ہونے سے پہلے انقلابی کھیل کھیلے تھے۔ اس لئے وہ پانی ان معلومات سے فائدہ اٹھا کر اپنے کانگریس کے ساتھیوں کو بہت اچھی طرح کچل سکتے تھے، جو سرکاری عہدے دار اور لبرل وزراء اپنی لاعلمی کی

وجہ سے نہیں کر سکتے تھے۔

۱۹۲۳ء میں کانگریس کا اجلاس لہگام میں ہوا اور گاندھی جی اس کے صدر ہوئے۔ ان کے لئے صدر ہونا گویا تنزل تھا کیونکہ وہ عرصہ سے کانگریس کے مستقل مہا صدر تھے۔ مجھے ان کا خطبہ صدارت پسند نہیں آیا۔ مجھے تو یہ محسوس ہوا جیسے اس میں بالک جان ہی نہیں تھی۔ اجلاس کے اختتام پر میں گاندھی جی کے ایما سے دوبارہ آل انڈیا کانگریس کمیٹی کا سیکرٹری منتخب ہوا۔ اپنی مرضی کے خلاف رفتہ رفتہ کانگریس کا نیم مستقل سیکرٹری بن گیا تھا۔

۱۹۲۵ء کی گرمیوں میں والس کی طبیعت نا ساز ہو گئی اور انہیں دے کا سخت دورا ہ پڑا۔ اس لئے وہ گھر کے سب لوگوں کو ساتھ لے کر ڈلہوزی چلے گئے۔ میں بھی چند روز بعد کچھ عرصے کے لئے ان کے پاس چلا گیا۔ ڈلہوزی سے ہم جمبا کو روانہ ہوئے جو ہمالیہ کے وسط واقع ہے۔ جون کی کسی تاریخ کو ہم وہاں پہنچ گئے۔ پہاڑی راستوں پر سفر کرنے کی وجہ سے ہم تھک گئے تھے۔ ابھی ہماری تکان دور بھی نہ ہونے پائی تھی کہ ہمیں ایک تار ملا جس میں چترنجن داس کی موت کی خبر درج تھی بڑی دیر تک والد سکوت کے عالم میں بیٹھے رہے۔ ان کی زبان سے ایک حرف بھی نہیں نکلا۔ البتہ غم کے بوجھ سے ان کی گردن جھکی ہوئی تھی۔ ان کے لئے یہ بڑا جانکاہ صدمہ تھا۔ میں نے شاید کبھی ان کو اتنا متاثر نہیں دیکھا تھا۔ داس ہی ایک ایسے شخص تھے جو ان کے قریب ترین اور محبوب ترین رفیق بن گئے تھے۔ آج وہی یکا یک ان سے جدا ہو گئے اور انہیں سوراج پارٹی کا سارا بوجھ سنبھالنے کو تنہا چھوڑ گئے۔ یہ بوجھ برابر بڑھ رہا تھا اور دلیش بندھو دونوں اس لالچنی کام سے اور اپنے لوگوں کی کمزوریوں سے گھبرا اٹھے تھے۔ دلیش بندھو کی آخری تقریر سے جو انہوں نے فرید پور کانفرنس میں کی تھی، ایسا ظاہر ہوتا تھا جیسے وہ کچھ تھک سے گئے ہوں۔

دوسرے ہی دن صبح جمبا سے روانہ ہو گئے اور پہاڑوں کو پار کر کے ڈلہوزی پہنچے

ریلوے اسٹیشن یہاں سے بہت دور تھا چنانچہ موٹر سے وہاں پہنچے اور پھر الہ آباد ہوتے ہوئے کلکتے روانہ ہو گئے۔

(۱) میں نے مذکورہ بالا واقعہ جیل میں محض اپنی یاد سے لکھا تھا۔ اب مجھے معلوم ہوا کہ میری یاد نے غلطی کی۔ اور میں نے آل انڈیا کانگریس کمیٹی کے مباحث کے ایک اہم پہلو کو نظر انداز کر دیا جس سے اصل واقعہ کی نوعیت بدل گئی۔ گاندھی جی جس قرارداد سے متاثر ہوئے تھے وہ ایک نوجوان بنگالی تحریف پسند کو پی ناتھ ساہا کے متعلق تھی۔ یہ قرارداد کمیٹی کے جلسے میں پیش ہو کر نامنظور ہو گئی تھی۔ جہاں تک مجھے یاد ہے اس قرارداد کے ذریعہ سے اس کے فعل کی تو مذمت کی گئی تھی۔ لیکن اس کی نیت کی بنا پر اس سے ہمدردی کا اظہار کیا گیا تھا۔ قرارداد سے زیادہ گاندھی جی کو ان تقریروں سے تکلیف پہنچی جو اس کی حمایت میں کئی گئیں۔ اور یہ خیال کہ بہت سے کانگریسی دل سے عدم تشدد کے معتقد نہیں ہیں ان کے لئے زیادہ پریشانی کا باعث ہوا۔ اس کے بعد ہی انہوں نے بنگال میں اس جلسے کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھا تھا ”اپنی چار قراردادوں کے حق میں معمولی سی اکثریت تو مجھے حاصل ہو گئی۔ لیکن میں اپنے آپ کو اقلیت ہی میں سمجھتا ہوں۔ کمیٹی کی رائیں تقریباً برابر پر تقسیم تھیں۔ کو پی ناتھ ساہا والی قرارداد نے مسئلہ کو بالکل صاف کر دیا۔ جو تقریریں اس کی حمایت میں کی گئیں۔ کو پی ناتھ ساہا والی قرارداد کے بعد جلسے کا وقار ختم ہو چکا تھا۔ لیکن اس جلسے کے سامنے مجھے اپنا آخری رزولوشن پیش کرنا پڑا۔ جیسے جیسے جلسے کی کاروائی ہو رہی تھی میری پریشانی بڑھتی جاتی تھی۔ جی چاہتا تھا کہ اس دل دکھانے والی فضا سے نکل کر بھاگ جاؤں۔ میرے سپرد جو قرارداد تھی اسے پیش کرتے ہوئے مجھے خوف معلوم ہوتا تھا۔ معلوم نہیں میں نے اس چیز کو صاف کر دیا ہے یا نہیں کہ کسی مقرر کے دل میں کسی قسم کا بغض مہمہ تھا۔ مجھے صرف یہ خیال ستاتا تھا کہ لوگ غیر ارادی طور پر کتنی غیر ذمہ داری کا ثبوت دے رہے ہیں اور کانگریس کے عدم تشدد کے مسلک کو کس بری طرح ٹھکرارہے ہیں۔ یہ دیکھ کر کانگریس کے اندر ستر آدمی ایسے نکل سکتے ہیں جو اس قرارداد کی حمایت کریں میرا دل تو بیٹھ گیا۔“

یہ واقعہ اور گاندھی جی کی یہ تنقید نہایت اہم ہے۔ کیونکہ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ عدم تشدد کو کتنی غیر معمولی اہمیت دیتے تھے۔ اور اس کی مخالفت کا چاہے وہ بالکل غیر ارادی اور بالواسطہ کیوں نہ ہو ان پر کتنا زبردست اثر ہوتا تھا۔ آگے بھی انہوں نے جو کچھ کیا غالباً اس کا بیشتر حصہ اصل میں انہیں اثرات کا نتیجہ تھا۔ عدم تشدد کو ان کی پالیسی اور ان کی تمام سرگرمیوں کی جان تھی۔

فرقہ پرستی کا زور

جیسا میں پہلے کہہ چکا ہوں ۲۳ء کے موسم خزاں میں نابھے کے جیل سے واپس آکر میں بیمار پڑ گیا۔ یہ علالت جس میں معیادی بخار کے جراثیم سے سابقہ تھا میرے لئے ایک نئی چیز تھی۔ اب تک نہ میں کبھی سخت بیمار پڑا تھا اور نہ معمولی بخار یا نقاہت کی وجہ سے بستر پر پڑے رہنے کا عادی تھا۔ مجھے اپنی صحت پر تھوڑا سا گھنٹھا تھا اور میں اعتراض کیا کرتا تھا کہ ہندوستان میں لوگ ہمیشہ بیمار بنے رہتے ہیں۔ اپنی جوانی اور مضبوطی کی بدولت میں بچ تو گیا لیکن بحران کے گزر جانے کے بعد اس قدر کمزور ہو گیا کہ ایک عرصے تک بستر سے نہیں اٹھ سکا اور کامل صحت پانے میں بہت دن لگ گئے۔ اس زمانے میں، میں اپنے ماحول اور روزمرہ کے کام سے ایک عجیب قسم کی اجنبیت سی محسوس کرنے لگا تھا۔ جیسے کوئی دور سے تماشہ دیکھ رہا ہو۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ میں جزئیات کے چکر سے نکل کر مشاہدہ کر رہا ہوں۔ میرا دماغ بھی پہلے کے مقابلے میں زیادہ پرسکون اور خیالات زیادہ واضح تھے۔ میرا خیال ہے کہ جو لوگ کبھی سخت بیمار پڑے ہیں انہیں بھی اسی قسم کا تجربہ ضرور ہوا ہوگا لیکن میرے لئے تو یہ ایک روحانی تجربے کی نوعیت رکھتا تھا۔ (یہاں محدود مذہبی معنی میں روحانی استعمال نہیں ہوا ہے) کیونکہ اس کا مجھ پر بہت گہرا اثر پڑا۔ میں محسوس کرتا تھا کہ میں سیاست کی جذباتی فضا سے بہت بلند ہو گیا ہوں اور ان چیزوں کو جواب تک میرے عمل کی محرک تھیں زیادہ وضاحت سے دیکھ رہا ہوں مگر اس بصیرت کے بعد پھر دل میں طرح طرح کے سوالات پیدا ہوئے جن کا میرے پاس کوئی جواب نہ تھا بہر حال میں زندگی اور سیاست کے مذہبی پہلو سے روز بروز دور ہوتا چلا گیا۔ میں اپنے اس تجربے کا ذکر زیادہ تفصیل سے نہیں لکھ سکتا۔ کیونکہ اس واردات کو بیان کرنا آسان نہیں ہے۔ اس بات کو اب گیارہ برس ہو چکے ہیں اور ذہن میں اس کے دھندلے سے نشان باقی رہ گئے ہیں پھر بھی اتنا مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ اس کا مجھ پر

اور میرے خیالات پر بہت گہرا اثر پڑا تھا اور آئندہ دو تین سال تک میں اپنا کام اسی بے تعلقی کے انداز سے انجام دیتا رہا۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ اس کی وجہ تغیرات تھے جو سر اسر میرے اختیار سے باہر تھے، اور جن سے میری طبیعت کو کوئی مناسبت نہیں تھی۔ میں پہلے بھی کہہ چکا ہوں کہ ملک کی سیاسی حالت بہت کچھ بدل گئی تھی۔ ان میں سب زیادہ اہم چیز یہ تھی کہ خاص طور پر شمالی ہند میں ہندو مسلم تعلقات رفتہ رفتہ بہت کشیدہ ہو گئے تھے۔ بڑے شہروں میں بہت سے فساد ہوئے جن میں انتہائی بیدردی اور درنگدی کا ثبوت دیا گیا۔ بے اعتمادی اور غصے نے جھگڑے کے ایسے ایسے سبب کھڑے کر دیے جو ہم نے پہلی کبھی سنے بھی نہ تھے۔ پہلے تو نزاع کے خاص وجہ بقرعید کے موقع پر گائے کی قربانی تھی یا اگر کبھی دونوں کے تہورا مثلاً محرم اور رام لیلہ ایک ساتھ پڑ جاتے تھے تب بھی اکثر فساد ہو جاتا تھا۔ محرم ایک دردناک سانحے کی یادگار ہے جو نوحہ و ماتم کے ساتھ ادا کی جاتی ہے۔ اور رام لیلہ ناحق پر حق کی فتح کی یادگار ہے جس کا جشن منایا جاتا ہے۔ یہ دونوں چیزیں ساتھ ساتھ نہیں نہہ سکتیں۔ لیکن خوش قسمتی سے ان کا ساتھ کہیں تیس سال میں ایک بار ہوتا ہے لیکن رام لیلہ تو سہ ماہی سال کے مطابق ایک مقررہ وقت پر ہوتی ہے اور محرم کا زمانہ قمری سال کے لحاظ سے ہر سال بدلتا رہتا ہے یہاں تک کہ تیس سال بعد دونوں مل جاتے ہیں۔

لیکن اب جھگڑے کی ایک نئی صورت پیدا ہو گئی اور یہ ایسی تھی کہ آئے دن پیش آتی تھی۔ یہ مسجد کے سامنے باجا بجا بے کا سوال تھا۔ مسلمانوں کو نماز کے وقت مسجد کے سامنے باجا بجانے اور شور کرنے پر اعتراض تھا کیونکہ اس سے ان کی عبادت میں خلل پڑتا ہے۔ ہر شہر میں بے شمار مسجدیں ہیں اور ہر مسجد میں روزانہ پانچ وقت نماز ہوتی ہے۔ شور و شغب اور جلوس کی بھی کمی نہیں ہے۔ (جس میں برات اور جنازے بھی شامل ہیں) اس لئے جھگڑے کا ہر وقت موقع تھا۔ خاص طور پر مغرب

کی نماز کے وقت مسجد کے سامنے باجا بجانے یا شور کرنے پر زیادہ اعتراض ہوتا تھا اتفاق سے اسی وقت مندروں میں بھی ’سندھیا‘ ہوتی ہے اور سنگھ اور گھڑیاں بجتے ہیں۔ اسے آرتی کہتے ہیں۔ غرض آرتی نماز کے جھگڑوں کی کثرت ہوگئی۔

کتنی حیرت کی بات ہے کہ ایک مسئلہ جو ایک دوسرے کے جذبات کا لحاظ کر کے ذرا سے تدبیر سے طے ہو سکتا ہو آپس کی رنجش اور فساد کا باعث بن جائے لیکن مذہبی جذبات کو عقل، لحاظ یا تدبیر سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ خصوصاً جب کوئی تیسرا فریق ایک کو دوسرے سے لڑا کر اپنا الو سیدھا کرنا چاہتا ہو تو اس کا بھڑک اٹھنا معمولی بات ہے۔

شمالی ہند کے چند شہروں کے ان فسادوں کو لوگ خواہ مخواہ حد سے زیادہ اہمیت دیتے ہیں۔ حالانکہ اکثر شہروں اور قصبوں میں اور قریب قریب تمام دیہاتوں میں بالکل امن و سکون تھا اور ان واقعات کا ان پر کوئی اثر نہیں پڑا تھا لیکن اخبار ہر چھوٹے چھوٹے فرقہ وارانہ جھگڑے کو بہت بڑھا چڑھا کر لکھتے تھے۔ بہر حال یہ بالکل صحیح ہے کہ شہر والوں میں فرقہ وارانہ کشیدگی اور رنجش بڑھ گئی تھی۔ دراصل فرقہ پرست لیڈر اس آگ کو بھڑکا رہے تھے۔ اس کا ثبوت یہ ہے کہ فرقہ وارانہ سیاسی مطالبے زیادہ سخت ہوتے جاتے تھے۔ اس فرقہ وارانہ کشیدگی کی وجہ سے وہ سیاسی رجعت پسند مسلمان جو ترک موالات کے زمانے میں منہ چھپا کر بیٹھ رہے تھے پھر میدان میں نکل آئے، اور حکومت نے اس کام میں ان کی مدد کی۔ اب تو وہ آئے دن نئے نئے اور بھاری بھاری مطالبے پیش کرنے لگے جس سے قومی اتحاد اور ملکی آزادی کی جڑ کٹی تھی۔ ہندوؤں میں بھی خاص خاص فرقہ پرست لیڈر سیاسی اعتبار سے رجعت پسند تھے اور کہنے کو تو وہ ہندو مفاد کی حفاظت کے علمبردار تھے لیکن اصل میں حکومت کے اشاروں پر چلتے تھے۔ اگرچہ انہوں نے مختلف صورتوں سے بہت کوشش کی، لیکن جن مطالبات پر وہ زور دیتے تھے انہیں حاصل کرنے میں نہ وہ کامیاب ہوئے

اور نہ ہو سکتے تھے۔ البتہ انہوں نے ملک میں فرقہ پرستی کا بیج بو دیا۔

کانگریس عجیب کش مکش میں تھی۔ چونکہ وہ قومی احساسات کی نمائندگی کرتی تھی اور ان سے اثر پذیر ہوتی تھی اس لئے ان فرقہ وارانہ جذبات کا بھی اثر اس پر پڑا۔ بہت سے کانگریسی قوم پرستی کے پردے میں فرقہ پرست بن گئے لیکن کانگریس کے رہنما اپنے اصولوں پر قائم رہے اور بحیثیت مجموعی انہوں نے کسی فرقے یا فرقہ وارانہ جماعت کا ساتھ نہیں دیا۔ اب تو سکھ اور دوسری چھوٹی اقلیتیں بھی کھلم کھلا اپنے جداگانہ مطالبات پیش کرنے لگی تھیں۔ غرض ان تمام باتوں کا نتیجہ یہ ہوا کہ کانگریس پر دونوں سے لعن طعن ہونے لگی۔

بہت دن ہوئے یعنی ترک موالات کے شروع میں یا اس سے بھی پہلے گاندھی جی نے فرقہ وارانہ مسئلے کا ایک حل تجویز کیا تھا۔ ان کا خیال تھا کہ یہ مسئلہ صرف اکثریت کی نیک نیتی اور فراخ دلی سے طے ہو سکتا ہے۔ اس لئے وہ مسلمانوں کا ہر مطالبہ ماننے کو تیار تھے۔ وہ ان کا دل ہاتھ میں لینا چاہتے تھے۔ ان سے سودا کرنا نہیں چاہتے تھے۔ دورانہ پیشی اور قدر و قیمت کے صحیح اندازے کی بدولت وہ حقیقت کی تہ کو پہنچ گئے۔ لیکن دوسرے لوگ جو یہ سمجھتے تھے کہ ہمیں بازار کا بھاؤ خوب معلوم ہے حالانکہ وہ کسی چیز کی صحیح قدر و قیمت کو نہیں پہنچانتے تھے مول تول کرنے لگے رہے۔ نہایت افسوس ہے کہ انہیں مہنگے دام تو نظر آئے مگر یہ نہ سوچا کہ مال کیسا ہے۔

دوسروں پر نکتہ چینی کرنا اور انہیں الزام دینا آسان ہے اور اپنی تدبیر کی ناکامی کی کوئی نہ کوئی وجہ تلاش کرنا بھی انسان کی فطرت میں داخل ہے۔ مگر اس ناکامی کا بار کسی کی اصولی غلطیوں یا عمل کی لغزشوں پر ڈالنے کی بجائے کیا یہ کہنا زیادہ صحیح نہ ہوگا کہ دوسروں نے جان بوجھ کر ہمارے راستے میں روڑے اٹکائے؟ ہم حکومت اور فرقہ پرستوں کو الزام دیتے ہیں اور وہ کانگریس کو۔ لیکن اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ

حکومت اور اس کے حلیف برابر ہمارے راستے میں جان بوجھ کر روڑے اٹکاتے رہے۔ اور اس میں بھی کوئی شکل نہیں ہے کہ ماضی میں بھی اور اب بھی برطانوی حکومت کی یہی حکمت عملی رہی ہے کہ ہم کو آپس میں لڑائے۔ محکموں میں پھوٹ ڈال کر حکومت کرنے کے اصول پر تمام سلطنتیں عمل کرتی ہیں اور جس حد تک وہ اپنی اسی ترکیب میں کامیاب ہوتی ہیں اسی حد تک ان کا تسلط محکموں پر ہوتا ہے۔ ہمیں اس کی شکایت کرنے میں حق نہیں ہے یا کم سے کم اس پر تعجب نہیں کرنا چاہیے۔ لیکن اس چیز کو نظر انداز کرنا یا اس کی کوئی تدبیر کرنا خود اپنی جگہ پر ایک زبردست غلطی ہے۔

ہم اس کی کیا تدبیر کریں؟ سودا چکانے، بھاؤ ٹھیرانے اور بازار کا سامول تول کرنے سے تو کام نہیں چلا سکتا۔ کیونکہ ہم کتنی ہی بھاری قیمت لگائیں۔ کتنی ہی بڑھ کر بولی بولیں، ایک تیسرا فریق موجود ہے جو ہم سے زیادہ دام لگا سکتا ہے اور بھی نہیں بلکہ نقد ادا کر سکتا ہے۔ غرض جب تک ہم میں ایک مشترک قومی اور اجتماعی نقطہ نظر نہ پیدا ہو جائے۔ ہم متحد ہو کر دشمن کا مقابلہ نہیں کر سکتے۔ اگر ہم موجودہ سیاسی اور اقتصادی نظام کے چکر میں پڑے رہیں گے اور اسی پر قناعت کریں گے کہ کچھ جزوی اصلاحات ہو جائیں اور حکومت میں ہندوستانیوں کا عنصر بڑھ جائے تو اتحاد عمل کی کوئی صورت نہیں ہو سکتی۔ پھر دونوں فریقوں کا مقصد یہی ہو گا کہ مال غنیمت میں سے ہمیں بھی کچھ حصہ مل جائے اور تیسرا فریق جس کے ہاتھ میں قوت ہے خود بخود سر بیچ بکری بیٹھ جائے گا اور چین چین کر اپنے چہیتوں کو اچھی اچھی چیزیں بانٹے گا۔ ہم اتحاد عمل کی عمارت کو مضبوط بنیادوں پر اس وقت قائم کر سکتے ہیں جب ہم ملک کے سیاسی نظام اور سماجی نظام کو بالکل بدل ڈالیں۔ اس لئے مکمل آزادی کے مطالبے کا مقصد یہی تھا کہ لوگوں کو معلوم ہو جائے ہم جس چیز کی خاطر لڑ رہے ہیں وہ ایک بالکل نیا سیاسی نظام ہے، نہ کہ ”درجہ نوآبادیت“ جس کے معنی اس کے سوا کچھ نہیں کہ موجودہ نظام بدستور قائم رہے۔ حکومت بظاہر ہندوستانیوں کی ہو اور پس

پردہ برطانیہ کا ہاتھ کام کرتا رہے۔ یہ سچ ہے کہ ہمارا مطالبہ آزادی صرف سیاسی آزادی تک محدود تھا اور اس میں سماجی تغیرات اور عام لوگوں کی معاشی آزادی کا ذکر نہیں تھا مگر س کا ایک پہلو یہ بھی تھا کہ وہ زنجیریں توڑ دی جائیں جن میں لندن کے تاجروں نے ہمیں جکڑ رکھا ہے اور ہمیں یقین تھا کہ اس سے سماجی نظام کے بدلنے میں سہولت ہوگی۔ اس وقت میرے یہی خیالات تھے۔ اب میں اس میں اتنا اور اضافہ کرتا ہوں کہ حقیقی سیاسی آزادی عموماً تنہا نہیں آتی، بلکہ اپنے ساتھ بہت کچھ سماجی آزادی بھی لاتی ہے۔

لیکن قریب قریب ہمارے تمام لیڈروں کی نظر موجودہ سیاسی سماجی نظام کی تنگ دائرے تک محدود تھی۔ وہ ہر مسئلے پر چاہے وہ فرقہ وارانہ ہو یا آئینی اسی نقطہ نظر سے غور کرتے تھے، جس کا لازمی نتیجہ یہ تھا کہ وہ برطانوی حکومت کے ڈھب پر آجاتے تھے کیونکہ حقیقت میں وہ انقلاب پسند نہیں بلکہ اصلاح پسند تھے گو کبھی کبھی عملی جدوجہد بھی کرتے رہتے تھے، لیکن اب وہ زمانہ نہیں رہا تھا کہ ہندوستان کا کوئی سیاسی، اقتصادی یا فرقہ وارانہ مسئلہ اصلاحی طریقوں سے پوری طرح حل ہو سکے اب تو انقلابی خیالات اور انقلابی طریق عمل کی ضرورت تھی۔ مگر ہمارے لیڈروں میں ایک شخص بھی ایسا نہ تھا جو اس ضرورت کو پورا کر سکے۔

ہماری جنگ آزادی کا مقصد واضح نہ ہونے سے فرقہ پرستی کو بہت تقویت پہنچی۔ عام لوگوں کی سمجھ میں یہ بات نہیں آتی تھی کہ آخر سوراج کی جنگ کو ہماری روزمرہ کی مصیبتوں سے کیا تعلق ہے۔ کبھی کبھی وہ ایک نامعلوم جذبے کے ماتحت خوب لڑتے تھے لیکن یہ تو بڑا کمزور ہتھیار ہے جو آسانی سے کند بھی کیا جاسکتا ہے اور غلط مقاصد کے لئے بھی کام آسکتا ہے۔ ان کے جوش میں عقل کو دخل نہیں تھا اس لئے رد عمل کے زمانے میں فرقہ پرست بھی اسے آسانی سے بھڑکا سکتے تھے اور مذہب کا نام لیکر اس سے ناجائز فائدہ اٹھاسکتے تھے۔ تعجب ہوتا ہے کہ ہندو مسلمان دونوں کے

اونچے اوسط طبقے کے لوگوں نے کس طرح مذہب کو بیچ میں لا کر ان مطالبات کے لئے عام لوگوں کی تائید اور مدد حاصل کر لی جنہیں عام طبقہ تو درکنار کچھ اوسط طبقے سے بھی کوئی واسطہ نہ تھا۔ اگر تمام فرقہ وارانہ مطالبوں کا تجزیہ کے اجائے تو یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ سارا جھگڑا عہدوں اور ملازمتوں کا ہے اور یہ عہدے اونچے اوسط طبقے کے لوگوں کے حصے میں آتے ہیں۔ اس کے علاوہ کونسلوں میں نشستیں مخصوص کرنے اور ان میں اضافہ کرنے کا بھی مطالبہ تھا کیونکہ انہیں پر سیاسی اقتدار منحصر سمجھا جاتا ہے۔ مگر انہیں بھی یا ان طریقہ نے اپنے ذاتی اثر کے بڑھانے کا ذریعہ بنالیا۔ یہ چھوٹے چھوٹے سیاسی مطالبات جن سے زیادہ سے زیادہ اونچے اوسط طبقے کے مٹھی بھر لوگوں کو فائدہ پہنچ سکتا ہے اور قومی اتحاد و ترقی کے راستے میں طرح طرح کی رکاوٹیں پیدا ہوتی ہیں، بڑی ہوشیاری سے اس طرح پیش کئے گئے، گویا یہ پورے فرقے کے مطالبات ہوں اور ان کے بے وقتی کو چھپانے کے لئے ان پر مذہب کا ملمع کر دیا گیا۔

غرض اس طرح سیاسی رجعت پسند فرقہ وارانہ لیڈروں کے بھیس میں سیاسی میدان میں نکل آئے۔ ان کے طرز عمل سے صاف ظاہر تھا کہ اس کا محرک فرقہ وارانہ تعصب نہیں ہے بلکہ اصل میں وہ سیاسی پیش قدمی کے راستے میں روڑے اٹکانا چاہتے ہیں۔ ہمیں سیاسی معاملات میں ان سے مخالفت کی توقع تو تھی ہی لیکن یہ دیکھ کر اور بھی تکلیف ہوتی تھی کہ وہ اپنا مقصد حاصل کرنے کے لیے کیسی ذلیل حرکتیں کرتے ہیں۔ مسلم فرقہ پرست لیڈر عجیب عجیب باتیں کہتے تھے اور انہیں مذہبی قوم پرستی کی پرواہ تھی اور نہ ہندوستان کی آزادی کی۔ رہے ہندو فرقہ پرست لیڈر یہ زبان سے قوم پرستی کا دعویٰ ضرور کرتے تھے لیکن عمل بالکل اس کے خلاف تھا اور چونکہ وہ کوئی معقول عملی کام کرنے کی اہلیت نہیں رکھتے تھے اس لئے حکومت کے سامنے اپنے کو طرح طرح سے ذلیل کرتے تھے حالانکہ اس سے کوئی فائدہ نہیں تھا

لیکن اشتراکی اور اسی قسم کی ”تخریبی“ تحریکوں کی مذمت کرنے میں دونوں متفق تھے اور جس چیز سے اونچے طبقے کے مستقل حقوق کو نقصان پہنچتا ہو، اس کی مخالفت میں دونوں حیرت انگیز طریقے سے ایک ہو جاتے تھے۔ مسلم فرقہ پرست لیڈر اگرچہ بہت سی ایسی باتیں کہتے اور کرتے تھے جو سیاسی اور اقتصادی آزادی کے منافی تھیں لیکن انفرادی طور پر بھی اور جماعتی حیثیت سے بھی حکومت اور پبلک کے سامنے وہ اپنے آپ کو لئے دے رہتے تھے۔ مگر ہندو فرقہ پرست لیڈروں میں اتنی خوداری بھی نہ تھی۔

کانگریس میں بہت سے مسلمان شریک تھے۔ ان کی تعداد کافی تھی اور ان میں بہت سے قابل آدمی بھی تھے بلکہ یوں کہیے کہ ہندوستان کے سب سے زیادہ مشہور اور ہر دلعزیز مسلمان لیڈر کانگریس کے ساتھ تھے۔ ان کانگریسی مسلمانوں نے اپنی ایک جماعت ”قوم پرست مسلم پارٹی“ کے نام سے ترتیب دی اور فرقہ پرست مسلمان لیڈروں کا مقابلہ کیا۔

شروع شروع میں تو انہیں کچھ کامیابی ہوئی اور تعلیم یافتہ مسلمانوں کا بہت بڑا حصہ ان کے ساتھ ہو گیا۔ لیکن وہ سب اونچے طبقے کے لوگ تھے اور ان میں کوئی موثر شخصیت نہ تھی وہ اپنے پیشے اور کاروبار میں لگ گئے اور انہیں عام لوگوں سے کوئی تعلق نہیں رہا بلکہ سچ پوچھئے تو کبھی تعلق پیدا ہی نہیں ہوا تھا وہ ڈارنگ روم میں بیٹھ کر مشورے اور معاہدے کرتے تھے مگر اس کام میں ان کے حریف یعنی فرقہ پرست لیڈر زیادہ ماہر تھے۔ چنانچہ ان حریفوں نے قوم پرست مسلمانوں کو مورچہ بہ مورچہ پیچھے ہٹانا شروع کیا اور انہیں ایک ایک کر کے اپنے سارے اصول ترک کرنے پڑے۔ بار بار قوم پرست مسلمانوں نے مزید پسپائی سے بچنے کے لئے یہ کوشش کی کہ اپنے مطالبات کو کم کر کے ان پراڈ جائیں لیکن اس کا نتیجہ ہمیشہ یہی ہوا کہ انہیں اور پیچھے ہٹا پڑا اور اپنے مطالبات کو اور کم کرنا پڑا۔ یہاں تک کہ ان کے پاس کوئی

چیز باقی نہ رہی جسے وہ اپنی کہہ سکتے۔ کوئی بنیادی اصول نہ رہا جس پر وہ قدم جام کر کھڑے ہو سکتے، سوائے ایک اصول کے جو ان کی کشتی کا لنگر تھا۔ یعنی مخلوط انتخاب مگر اس کے بعد اور ایک نازک موقع آیا، جب انہیں اپنے مطالبات کم کرنے پڑے اور ان کا یہ لنگر ٹوٹ گیا۔ چنانچہ آج وہ ہر اصول اور عمل کو جس پر انہوں نے اپنی جماعت کی بنیاد رکھی تھی جسے وہ بڑے زور شور سے لے کر اٹھے تھے، کھو چکے ہیں اور ان کے پاس نام کے سوا کچھ باقی نہیں۔

انفرادی حیثیت سے قوم پرست مسلمان اب بھی کانگریس میں نمایاں حیثیت رکھتے ہیں لیکن جماعت کی حیثیت سے ان کی تباہی کی داستان بڑی دردناک ہے۔ یہ تباہی برسوں میں تکمیل کو پہنچی۔ لیکن اس پر آ کر مہر اسی سال ۱۹۳۴ء میں ثبت ہوئی۔ ۱۹۲۳ء میں اور اس کے بعد بھی کئی برس تک ان کی جماعت بہت طاقتور رہی اور انہوں نے مسلم فرقہ پرستوں کے خلاف سخت جارحانہ رویہ اختیار کیا۔ بارہا ایسا ہوا کہ گاندھی جی ان فرقہ پرستوں کے بعض مطالبات اپنی مرضی کے خلاف منظور کرنے کو تیار ہو گئے۔ لیکن ان کے رفقاء کار یعنی قوم پرست مسلم لیڈروں نے خود انہیں روکا اور بڑی سختی سے مخالفت کی۔

۱۹۲۳ء و ۲۵ء میں باہمی مشوروں اور مباحثوں کے ذریعے سے (جو اتحاد کانفرنس کہلاتے تھے) فرقہ وارانہ مسئلے کو حل کرنے کی بہت سی کوششیں کی گئیں۔ ان میں سب سے مشہور وہ کانفرنس تھی جو مولانا محمد علی نے اپنے صدارت کے زمانے میں ۱۹۲۳ء میں کی۔ ان کانفرنسوں میں بہت سے نیک نیت اور پر خلوص لوگ شامل ہوئے۔ انہوں نے سمجھوتا کرنے کی انتہائی کوشش کی۔ چند اچھی اچھی قراردادیں بھی منظور ہوئیں لیکن اصل مسئلہ حل نہیں ہو سکا۔ ظاہر ہے وہ ان کانفرنسوں سے طے نہیں ہو سکتا تھا۔ کیونکہ اس کا طے ہونا کثرت رائے پر نہیں بلکہ اتفاق رائے پر منحصر تھا۔ ان کانفرنسوں میں انتہا پسندوں کی مختلف جماعتیں بھی موجود تھیں حسن کے نزدیک

سمجھوتے کا مفہوم یہ تھا کہ باقی سب لوگ ان کی رائے کے سامنے سر خم تسلیم کر دیں۔ اس لئے اتفاق رائے کیسے ہو سکتا تھا۔ سچ پوچھئے تو ان جلسوں کو دیکھ کر یہ شبہ پیدا ہوتا تھا کہ بعض سربراہ فرقہ پرست کوئی سمجھوتا کرنا ہی نہیں چاہتے۔ ان میں سے اکثر سیاسی رجعت پسند تھے اور ان میں اور دوسرے لوگوں میں جو بنیادی طور پر سیاسی تغیرات کے خواہشمند تھے اتحاد خیال کی گنجائش ہی نہ تھی۔

لیکن مشکلات کی اصل بنیاد زیادہ گہری تھی اور ان کا الزام محض افراد پر نہیں رکھا جاسکتا۔ اب سمجھ بھی اپنے فرقہ وارانہ مطالبوں کو بڑے زور شور سے پیش کرنے لگے تھے اور پنجاب میں ایک نہایت پیچیدہ مسئلہ بن گیا تھا۔ اصل میں پنجاب ہی فرقہ وارانہ نزاع کا مرکز تھا۔ وہاں ہر فرقہ دوسرے سے خائف تھا اس لئے خواہ مخواہ جوش و تعصب کا ماحول پیدا ہو گیا تھا۔ بعض صوبوں میں کسانوں کا مسئلہ بھی فرقہ وارانہ رنگ میں نمودار ہوا۔ خصوصاً بنگال میں جہاں زمیندار عموماً ہندو ہیں اور کاشتکار مسلمان ہیں۔ پنجاب اور سندھ میں دولت مند طبقہ اور مہاجن عموماً ہندو ہیں اور قرضدار زیادہ تر مسلم کاشتکار ہیں اس لئے قرض خواہ کے خلاف جو اپنا ”آدھ سیر گوشت“ لئے بغیر نہیں مانتا۔ غریب قرضداروں میں فطرتاً جو اشتعال ہوتا ہے اس نے فرقہ وارانہ طوفان کو اور بڑھا دیا۔ عام طور پر مسلمان غریب ہیں اس لئے مسلم فرقہ پرست لیڈروں نے اس عداوت سے جو غریبوں اور امیروں میں ہمیشہ رہا کرتی ہے، فرقہ وارانہ مقاصد حاصل کرنے کے لئے ناجائز فائدہ اٹھایا۔ حالانکہ غریبوں کی بہبودی سے ان مقاصد کو کوئی واسطہ نہیں ہے۔ اسی بنا پر یہ کہا جاسکتا ہے کہ مسلم فرقہ پرست رہنما کسی حد تک عوام کی نمائندگی کرتے تھے اور انہیں ایک قوت حاصل تھی۔ لیکن ہندو فرقہ پرست رہنما اقتصادی لحاظ سے دولت مند مہاجنوں اور پیشہ ور طبقوں کے نمائندے تھے۔ انہیں ہندو عوام کی کوئی مستقل تائید حاصل نہ تھی۔ گو کبھی کبھی وہ ان کی ہمدردی حاصل کر لیتے تھے۔

غرض فرقہ وارانہ مسئلہ معاشی جماعت بندی سے کچھ غلط ملط ہو گیا ہے اگرچہ بد قسمتی سے لوگوں کو اس کا احساس نہیں ہوا۔ ممکن ہے آگے چل کر یہ کھلم کھلا معاشی طبقوں کی جنگ کی شکل اختیار کر لے لیکن اگر وہ وقت آیا تو دیکھ لیجئے گا کہ آج کل کے تمام فرقہ پرست لیڈر جو مختلف فرقوں کے اعلیٰ طبقوں کی نمائندگی کرتے ہیں جھٹ پٹ اپنے اختلافات رفع کر لیں گے تاکہ اپنے مشترک دشمن یعنی غریبوں کے طبقے کا مقابلہ کر سکیں۔ موجودہ حالت میں بھی سیاسی سمجھوتا کر لینا زیادہ مشکل نہیں (بشرطیکہ اور یہ شرط بہت زبردست ہے) تیسرا فرقہ موجود نہ ہو۔

۱۹۴۴ء میں دہلی کی اتحاد کانفرنس کے ختم ہوتے ہی الہ آباد میں ایک ہندو مسلم فساد ہو گیا۔ جہاں تک جانیں ضائع ہونے کا تعلق ہے دوسرے فسادوں کے مقابلے میں یہ کوئی بہت بڑا بلوہ نہ تھا۔ لیکن مجھے زیادہ صدمہ اس لئے ہوا کہ یہ خود میرے شہر میں واقع ہوا تھا چنانچہ میں چند اور حضرات کے ساتھ دہلی فوراً الہ آباد پہنچ گیا وہاں جا کر معلوم ہوا کہ اصل فساد ختم ہو چکا ہے۔ لیکن اس کے اثرات فرقہ وارانہ کشیدگی اور مقدمے بازی کی شکل میں عرصے تک باقی رہے۔

مجھے صحیح یاد نہیں کہ فساد کیسے شروع ہوا۔ اسی سال یا شاید اس کے کچھ عرصے بعد الہ آباد میں رام لیا کے موقع پر پھر جھگڑا ہوا گیا اس کی وجہ غالباً یہ تھی کہ مسجد کے سامنے باجا بجانے کی ممانعت ہو گئی تھی۔ چنانچہ یہ تقریب جس میں بڑے بڑے جلوس بھی نکلتے تھے اس وقت سے بالکل بند کر دی گئی۔ اس بات کو اب آٹھ سال کا عرصہ گزر چکا ہے۔ لیکن اب تک الہ آباد میں رام لیا نہیں ہوئی ضلع کے ہزاروں لاکھوں آدمیوں کے لئے یہ سال کا سب سے بڑا جشن ہوتا تھا لیکن اب صرف اس کی حسرتناک یاد باقی رہ گئی ہے۔ مجھے خوب یاد ہے کہ میں بچپن میں اور بچوں کے ساتھ رام لیا دیکھنے جایا کرتا تھا۔ اس وقت ہم خوشی سے پھولے نہ ماتے تھے اور وہ سارا مجمع بھی بہت خوش و خرم نظر آتا تھا جو الہ آباد کے سارے ضلع بلکہ قرب و جوار

کے دوسرے اصناف سے آکر یہ تماشا دیکھنے کو اکٹھا ہو جاتا تھا۔ اگرچہ یہ ہندو تہوار تھا
 لیکن اس میں کسی کے لئے روک ٹوک نہ تھی اس لئے مسلمان بھی بکثرت شریک
 ہوتے تھے اور چاروں طرف مسرت و شادمانی اور چہل پہل نظر آتی تھی۔ اس کے
 علاوہ تجارت کو بھی فروغ ہوتا تھا۔ برسوں کے بعد جب میں جوانی میں وہاں پھر گیا تو
 مجھے کچھ زیادہ لطف نہیں آیا بلکہ اس جلوس اور سوانگ سے وحشت ہونے لگی۔ اب
 میرا فنون لطیفہ اور تفریح کا معیار بہت بلند ہو گیا تھا۔ پھر بھی میں نے دیکھا کہ یہ سارا
 مجمع اس تماشے سے کتنا لطف اٹھاتا ہے اور کیسا خوش ہوتا ہے۔ ان لوگوں کے لئے یہ
 رنگ رلیوں کا زمانہ تھا۔ بوڑھوں اور جوانوں کو چھوڑئے۔ الہ آباد کے بچوں نے
 آٹھ نو برس سے یہ کھیل تماشے نہیں دیکھے ہیں اور ان کی روکھی پھکی بے رس زندگیوں
 میں جوش مسرت کا جو ایک خوش گوار دن آ جاتا تھا اس سے بھی وہ محروم ہو گئے ہیں۔
 یہ سب نتیجہ ہے چھوٹی چھوٹی باتوں پر لڑنے جھگڑنے کا! سچ پوچھئے تو مذہب اور مذہبی
 جوش اس کا ذمہ دار ہے۔ افسوس یہ بھی کتنی مسرت کش چیز ہے!

میونسپلٹی کا کام

دو سال تک میں الہ آباد میونسپلٹی کا کام کرتا رہا لیکن میری بددلی برابر بڑھتی گئی۔ میں تین سال کے لئے چئیرمین منتخب ہوا تھا۔ لیکن ابھی دوسرا سال شروع ہی ہوا تھا کہ میں اس ذمہ داری سے سبکدوش ہونے کی کوشش کرنے لگا۔ مجھے یہ کام دل سے پسند تھا اور میں نے اس میں بہت وقت اور توجہ صرف کی تھی۔ بڑی حد تک مجھے کامیابی بھی ہوئی اور اپنے تمام رفقاء کار کی خوشنودی کا فخر بھی حاصل ہوا۔ صوبہ متحدہ کی حکومت نے سیاسی مخالفت کے باوجود میرے بعض بلدی مشاغل کو سراہا۔ پھر بھی میں اپنے آپ کو جکڑا ہوا پاتا تھا اور یہ دیکھتا تھا کہ جب کوئی معقول کام کرنا چاہتا ہوں تو میری راہ میں طرح طرح کی رکاوٹیں حائل ہوتی ہیں۔

مجھے اعتراف ہے کہ جان بوجھ کر کسی نے بھی میرے راستے میں رکاوٹیں پیدا نہیں کیں بلکہ مجھے اندازہ ہوا کہ لوگوں نے بڑی خوشی سے میرے ساتھ تعاون کیا۔ لیکن اس کا کیا علاج تھا کہ ایک طرف تو حکومت کا ایک مقررہ نظام تھا اور دوسری طرف پبلک اور میونسپلٹی کے اراکین کی بے حسی۔ حکومت نے بلدی نظام کا جو اہنی ڈھانچا تیار کر لیا تھا اس میں بنیادی ترقی یا متنوع کی کوئی گنجائش ہی نہ تھی۔ مالی حیثیت سے میونسپلٹیاں ہمیشہ حکومت کی محتاج رہتی تھیں۔ مروجہ قوانین بلدہ کے ماتحت اس کی اجازت ہی نہ تھی کہ محصول لگانے کی، یا سماجی ترقی کی کوئی غیر معمولی تجویز پیش کی جاسکے۔ جو تجویزیں قانوناً جائز بھی تھیں ان کے لئے بھی حکومت کی منظوری لازمی تھی۔ اور یہ بڑے صبر اور ہمت کا کام تھا کہ اس قسم کی کوئی تجویز پیش کر کے برسوں منظوری کا انتظام کرتے رہیں۔ مجھے یہ دیکھ کر حیرت ہوتی تھی کہ جب کبھی اصلاح یا قومی تعمیر کا کوئی معاملہ ہوتا تو حکومت کی مشین کس مشکل سے اور کتنے آہستہ آہستہ حرکت کرتی۔ لیکن اگر کسی سیاسی مخالف کو کچلنے یا دبانے کا سوال ہوتا تو پھر اس میں کس بلا کی تیزی پیدا ہو جاتی۔ یہ بھی ایک عجیب و غریب تضاد ہے۔

صوبے کی میونسپلٹیاں اور ڈسٹرکٹ بورڈ ایک سرکاری محکمے کے ماتحت ہیں اور اس محکمے کا صدر ایک ہندوستانی وزیر ہوتا ہے لیکن عموماً یہ صدر بلدی معاملات تو کیا تمام امور عامہ میں بالکل کورے ہوتے ہیں۔ اصل میں وہ کسی شمارت میں نہیں ہیں اور خود ان کا محکمہ جسے انڈین سول سروس کے مستقل عہدے دار چلاتے ہیں ان کی ذرا پرواہ نہیں کرتا۔ ہندوستان کے اعلیٰ افسروں کی طرح ان عہدیداروں کی بھی یہی ذہنیت ہے کہ حکومت کا اصل کام نظم و ضبط قائم رکھنا ہے اس میں کسی قدر مربیانہ شفقت کا رنگ بھی ہے لیکن اعلیٰ پیمانے پر سماجی خدمت کی ضرورت مطلق محسوس نہیں کی جاتی۔

میونسپلٹیاں ہمیشہ حکومت کی مقروض ہوتی ہیں اس لئے نظم و ضبط کے بعد اسے ان سے قرض وصول کرنے کی فکر رہتی ہے۔ وہ بس یہی دیکھتی ہے کہ قرض کی قسطیں باقاعدہ ادا ہوتی رہیں۔ میونسپلٹی کی مالی حالت خراب نہ ہونے پائے۔ اس کے پاس تحویل میں کافی روپیہ موجود ہو۔ یہ سب باتیں نہایت ضروری اور بر محل ہیں لیکن یہ چیز ہمیشہ نظر انداز کر دی جاتی ہے کہ میونسپلٹی محض روپیہ قرض لینے اور باقاعدہ ادا کرنے کا ادارہ نہیں ہے بلکہ اسے تعلیم، حفظان صحت وغیرہ کی خدمات بھی انجام دینی ہیں۔ ہندوستان کی میونسپلٹیاں یوں بھی بہت کم سماجی خدمت انجام دیتی ہیں اور جہاں مالی مشکلات پیش آئیں ان میں اور کمی کر دی جاتی ہے اور عام طور پر سب سے پہلے تعلیم پر ہاتھ صاف ہوتا ہے۔ حکمران طبقوں کو ذاتی طور پر میونسپل مدارس سے کوئی دلچسپی نہیں ہے کیونکہ ان کے بچے اعلیٰ درجہ کے گراں خرچ مدرسوں میں پڑھتے ہیں جنہیں عموماً حکومت سے متعدل امداد ملتی ہے۔

ہندوستان کے بڑے شہروں کو عموماً دو حصوں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے ایک تو شہر خاص جہاں بہت گنجان آبادی ہوتی ہے۔ دوسرے وہ وسیع رقبہ جس میں بنگلے اور کوٹھیاں ہوتی ہیں اور ہر بنگلے سے ملحق بہت بڑا احاطہ یا باغ ہوتا ہے۔ اس علاقے کو

انگریز سول لائن کہتے ہیں۔ اسی سول لائن میں انگریز افسر اور تاجر اونچے اوسط طبقے کے ہندوستانی، وکیل، ڈاکٹر، سرکاری عہدیدار وغیرہ رہتے ہیں۔ میونسپلٹی کو سول لائن کے مقابلہ میں شہر خاص سے زیادہ آمدنی ہوتی ہے۔ لیکن خرچ سول لائن پر زیادہ ہوتا ہے۔ کیونکہ سول لائن کے وسیع رقبہ میں زیادہ سڑکیں درکار ہیں۔ ان کی باقاعدہ مرمت، صفائی، چھڑکاؤ اور روشنی بھی ضروری ہے اور وہاں گندے پانی کے نکاس، آب رسانی اور حفظان صحت کا انتظام بھی زیادہ وسیع پیمانے پر کرنا پڑتا ہے۔ شہر کی طرف زیادہ توجہ کی جاتی بلکہ غریبوں کے محلوں کی طرف تو کوئی نظر اٹھا کر بھی نہیں دیکھتا۔ شہر میں اچھی سڑکیں بہت کم ہوتی ہیں۔ گلیوں میں روشنی کافی نہیں ہوتی اور وہاں نہ پانی کے نکاس کا انتظام ہوتا ہے نہ حفظان صحت کا۔ شہر والے ان تمام مصیبتوں کو بہت صبر اور خاموشی سے برداشت کرتے ہیں، اور شکایت کا حرف زبان پر نہیں لاتے۔ اگر کبھی شکایت کرتے ہیں تو سنتا کون ہے، کیونکہ وہ لوگ جو منہ میں زبان رکھتے ہیں اور جن کی شنوائی ہو سکتی ہے سب سول لائن میں رہتے ہیں۔

غرض کچھ تو اس بوجھ کے مساوی طور پر تقسیم کرنے اور کچھ مزید اصلاحیں کرنے کے خیال میں نے زمین کی مالیت پر محصول لگانا تجویز کیا لیکن جیسے ہی میں نے یہ تجویز پیش کی فوراً ایک سرکاری افسر (غالباً ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ) نے اس کے خلاف احتجاج کیا اور لکھا کہ یہ تجویز فلاں فلاں قانون اور ضابطہ آراضی کے خلاف ہے۔ ظاہر ہے کہ اس محصول کی زد میں زیادہ تر وہ لوگ آتے تھے جن کے بنگلے سول لائن میں تھے۔ لیکن حکومت تو چنگی جیسے بالواسطہ محصول کو پسند کرتی ہے جس سے تجارت برباد ہو جاتی ہے۔ مختلف چیزوں کی خصوصاً اشیائے خوردنی کی قیمتیں بڑھ جاتی ہے۔ اور بیچارے غریبوں کو بہت نقصان پہنچتا ہے۔ جہاں تک مجھے معلوم ہے اکثر ہندوستانی میونسپلٹیوں کا دارومدار اسی خلاف معاشرت اور نقصان دہ محصول پر ہے۔ مگر شاید اب بڑے بڑے شہروں میں یہ رفتہ رفتہ ہو رہا ہے۔

غرض میونسپلٹی کے چیرمین کی حیثیت سے ایک طرف تو مجھے حکومت کی اس
 لاشخصی مشین سے سابقہ پڑا جو دفتری گھس گھس کی عادی تھی اور نہ اپنی رفتار تیز کرنا
 چاہتی تھی نہ کسی نئے راستے پر چلنے کو تیار تھی اور دوسری طرف اپنے رفقاءے کار
 میونسپلٹی کے اراکین سے جو اسی طرح پرانی لکیر کے فقیر تھے۔ ان میں سے بعض
 تصور پرست تھے اور اپنا کام بڑے جوش اور انہماک سے کرنے لگے۔ لیکن بحیثیت
 مجموعی ان میں نہ تبدیلی یا ترقی کا جذبہ تھا اور نہ تخیل۔ ان کا خیال تھا کہ پرانے
 طریقے اچھے خاصے ہیں، پھر نئے نئے تجربے کرنی سے کیا فائدہ جن کی کامیابی
 موہوم ہے۔ تصور پرست اور جو شیلے لوگ بھی رفتہ رفتہ بندھے ٹکے معمول کے
 خواب اور اثر کا شکار ہو گئے۔ البتہ جب ملازموں کے تقرر کا موقع آتا تھا تو اراکین
 میں بڑی سرگرمی پیدا ہو جاتی ہے۔ مگر اس سے ان کی کارکردگی میں کوئی اضافہ نہیں
 ہوتا تھا۔

ہر سال سرکاری اعلان، سرکاری عہدیدار اور بعض اخبارات میونسپلٹیوں اور
 لوکل بورڈوں کے کام پر اعتراض کرتے ہیں اور ان کی برائیاں تو مسلم ہیں لیکن کوئی
 یہ بھی تو دیکھے کہ انہیں کس نظام کے اندر کام کرنا پڑتا ہے۔ یہ نظام نہ جمہوری ہے اور
 نہ استبدادی بلکہ ایک درمیانی شکل ہے جس میں دونوں کی برائیاں موجود ہیں اور
 دونوں کی اچھائیاں مفقود۔ اس بات سے انکار نہیں کر مرکزی حکومت کو نگرانی کا
 اختیار ہونا چاہیے، لیکن اگر مرکزی حکومت خود جمہوری حیثیت نہ رکھتی ہو اور عوام
 کی ضروریات کا اسے کوئی لحاظ نہ ہو تو وہ ایسی مقامی مجلس کے ساتھ جسے عوام منتخب
 کرتے ہوں کیونکر نبھا سکتی ہے جہاں یہ صورت ہوتی ہے وہاں یا تو دونوں میں کش
 مکش رہتی ہے یا مقامی مجلس مرکزی حکومت کے سامنے بے چون و چرا تسلیم خم کر
 دیتی ہے اور اس طرح مرکزی حکومت کو موقع ملتا ہے کہ وہ اپنے فرائض ادا کئے بغیر
 اپنے اختیارات کا استعمال کرے۔ ظاہر ہے کہ یہ صورت نہایت نامناسب ہے اور

اس جمہوری حکومت کا منشافوت ہو جاتا ہے۔ میونسپل بورڈ کے اراکین کی نظر اپنے منتخب کرنے والوں کے مقابلے میں مرکزی قوت کی طرف زیادہ رہتی ہے اور پبلک بھی اکثر بورڈ کی پرواہ نہیں کرتی۔ حقیقی سماجی مسائل پر تو بورڈ کبھی غور کرتا ہی نہیں کیونکہ یہ اس کے اختیارات سے باہر ہیں۔ بورڈ کا خاص کام تو بس ٹیکس وصول کرنا ہے اسی وجہ سے وہ زیادہ ہر دھڑیر نہیں ہو سکتا۔

مقامی مجالس کی رائے دہندوں کی تعداد بھی بہت محدود ہے۔ چنانچہ اس کی سخت ضرورت ہے کہ رائے دہی کے لئے جو معیار مقرر کیا گیا ہے اسے کم کیا جائے تاکہ رائے دہندوں کی تعداد بڑھانے کا روزیویشن خود نا منظور کر دیا تھا۔ غالباً کارپوریشن کے اراکین کی اکثریت اپنی موجودہ حالت پر قانع ہے۔ اس لئے انہیں کسی قسم کی تبدیلی کرنے یا اپنے آپ کو خطرے میں ڈالنے کی کوئی وجہ نہیں معلوم ہوتی۔

بہر حال وجہ کچھ بھی ہو لیکن یہ واقعہ ہے کہ ہمارے بلدی ادارے کامیابی اور کار گذاری کی کوئی اچھی مثال پیش نہیں کرتے۔ اگرچہ اس حالت میں بھی وہ ترقی یافتہ جمہوری ممالک کی بعض میونسپلٹیوں سے کم نہیں ہیں۔ عام طور پر ان میں بددیانتی نہیں پائی جاتی، البتہ نا اہلی ضرور ہے۔ ان کی سب سے بڑی کمزوری یہ ہے کہ ان کے ممبر اپنے عزیزوں اور دوستوں کی رعایت کرتے ہیں اور معاملات کی اہمیت کے صحیح تناسب سے ناواقف ہیں۔ لیکن یہ قدرتی امر ہے کیونکہ جمہوریت کی اہمیت کی صحیح تناسب سے ناواقف ہیں۔ لیکن یہ قدرتی امر ہے کیونکہ جمہوریت اسی وقت کامیاب ہو سکتی ہے جب اس کے پیچھے باخبر رائے عامہ ہو اور ہر شخص کو اپنی ذمہ داری کا پورا احساس ہو۔ بخلاف اس کے ہمارے یہاں تو ہر طرف تحکم ہی تحکم نظر آتا ہے اور جمہوریت کے لوازم مفقود ہیں۔ نہ تو یہاں تعلیم عام ہے اور نہ رائے عامہ کو صحیح معلومات کی بنا پر تیار کرنے کی کوشش کی جاتی ہے۔ اس کا لازمی نتیجہ یہ ہوتا

ہے کہ لوگ ذاتیات، فرقہ وارانہ کشاکش، یا اور چھوٹے چھوٹے قضیوں میں الجھ جاتے ہیں۔

میونسپلیٹی کے معاملات میں حکومت کو صرف اتنی دلچسپی ہے کہ ”سیاسیات“ کا کہیں ذکر نہ آنے پائے۔ اگر وہ اپنی کسی قرار دار کے ذریعہ سے قومی تحریک کے ساتھ ہمدردی کا اظہار کرتی ہے تو فوراً حکومت کے ابرو پر بل آجاتا ہے۔ میونسپل مدارس میں ایسی کتابیں پڑھانے کی بھی ممانعت ہے جن میں قوم پرستی کا شائبہ بھی ہو۔ یہاں تک کہ قومی لیڈروں کی تصویریں لگانا بھی ممنوع ہیں۔ میونسپلیٹی کو یہ دھمکی دی جاتی ہے کہ اگر اس کی عمارت سے قومی جھنڈا اتارا گیا تو وہ معطل کر دی جائے گی۔ ادھر کچھ عرصے سے اکثر صوبوں کی حکومتوں کو کد ہو گئی ہے کہ کارپوریشن اور میونسپلیٹی کی ملازمت سے کانگریس والے نکال باہر کئے جائیں۔ عام طور پر اس مقصد کے حصول کے لئے میونسپلٹیوں پر دباؤ ڈالنا کافی ہوتا تھا۔ کیونکہ اس کے ساتھ یہ دھمکی دی جاتی تھی کہ انہیں تعلیمی کاموں اور دوسرے مقاصد کے لئے جو سرکاری امداد ملتی ہے وہ روک دی جائے گی لیکن بعض صورتوں میں خصوصاً کلکتہ کارپوریشن کے معاملے میں یہ قانون بنا دیا گیا کہ جو شخص سول نافرمانی کے جرم میں یا حکومت کے خلاف کسی سیاسی تحریک کے سلسلے میں قید ہو چکا ہے وہ ملازم نہیں رکھا جاسکتا۔ یہ طرز عمل خالص سیاسی وجوہ پر مبنی تھا۔ کیونکہ ان کی نااہلی یا ناموزونی کا کوئی سوال نہ تھا۔

ان چند مثالوں سے یہ اچھی طرح ثابت ہو جاتا ہے کہ ہماری میونسپلٹیوں اور ڈسٹرکٹ بورڈوں کو کتنی آزادی حاصل ہے اور ان میں جمہوریت کو کتنا دخل ہے حکومت نے اپنے سیاسی مخالفین پر (جو ظاہر ہے کہ سرکاری ملازمت نہیں کرنا چاہتے) میونسپلیٹی اور مقامی اداروں کے دروازے بند کرنے کی جو خاص کوشش کی وہ ذرا قابل غور ہے۔ اندازاً ۳ لاکھ افراد گذشتہ چودہ برس میں وقتاً فوقتاً جیل گئے۔ اس

میں ذرا بھی شبہ نہیں کہ ان ۳ لاکھ آدمیوں میں سیاسیات سے قطع نظر بہت سے ایسے لوگ تھے جو ہندوستان بھر میں سب سے زیادہ اثر آفریں، با اصول اور خدمت و ایثار کا جذبہ رکھنے والے تھے۔ ان میں جوش اور عزم، قوت عمل اور دل و جان سے اپنے مقصد میں محو ہو جانے کی صفت تھی۔ غرض مفاد عامہ کے اداروں کو ان میں سے بہترین کارکن مل سکتے تھے۔ اس کے باوجود حکومت نے انتہائی کوشش کی بلکہ قانون تک نافذ کئے گئے کہ یہ لوگ ان اداروں میں نہ گھسنے پائیں گویا اس طرح ان کو اور ان کے ہمدردوں کو سزا دینا منظور تھا۔ حکومت نکلے لوگوں کو پسند کرتی ہے اور آگے بڑھاتی ہے پھر شکایت کرتی ہے کہ مقامی ادارے نا اہل ہیں اور لطف یہ ہے کہ اگرچہ یہ کہا جاتا ہے کہ سیاست ان مقامی اداروں کے دائرہ عمل سے خارج ہے لیکن اگر وہ حکومت کی حمایت میں سیاست میں حصہ لیں تو کوئی اعتراض نہیں ہوتا۔ کیا یہ واقعہ نہیں ہے کہ ان کے مدرسوں کو ملازمت سے برطرفی کی دھمکی دیکر مجبور کیا گیا کہ وہ دیہات میں جا کر حکومت کی طرف سے پروپیگنڈہ کریں۔

گذشتہ پندرہ سال میں کانگریس کے کارکنوں کو بڑی بڑی مشکلات کا سامنا کرنا پڑا ہے۔ انہوں نے بھاری بھاری ذمہ داریوں کو بوجھ سنبھالا ہے اور کم سے کم ایک طاقتور اور منظم حکومت کا کامیابی کے ساتھ مقابلہ کیا ہے۔ اس سخت ترین تربیت نے ان میں خود اعتمادی، لیاقت اور استقلال کی صفات پیدا کر دی ہے۔ غرض ایک تحکم پسند حکومت نے ایک مدت کے نامزد بنانے والی کوششوں کے ذریعہ سے ہندوستانیوں میں جن خوبیوں کو فنا کر دیا تھا وہ اس تحریک نے پیدا کر دی ہیں۔ اس میں شک نہیں کہ کانگریس کی تحریک میں بھی دوسری عام تحریکوں کی طرح بہت سے نا لائق (بیوقوف، نا اہل اور اس سے بھی بدتر لوگ) بھر گئے تھے اور اب بھی موجود ہیں لیکن اس سے بھی انکار نہیں کیا جاسکتا کہ ایک کانگریسی کارکن عموماً اپنے برابر قابلیت رکھنے والے شخص سے زیادہ کارگزار اور اثر آفریں ہوتا ہے۔

اس مسئلے کے ایک پہلو پر شاید حکومت اور اس کے مشیروں کی نظر نہیں گئی اور وہ یہ ہے کہ ملک کے انقلاب پسند حکومت کی اس کوشش کو دل سے پسند کرتے ہیں کہ وہ کانگریسی کارکنوں کو تمام ملازمتوں سے محروم کر دے اور ان پر روزگار کے تمام دروازے بند کر دے۔ عام طور پر کانگریسیاں لئے بدنام ہیں کہ وہ فطرتاً انقلاب پسند نہیں ہوتے۔ نیم انقلابی تحریکوں کا زمانہ ختم ہو جانے کے بعد وہ پھر بے عملی کی زندگی کی بھول بھلیوں میں پھنس جاتے ہیں اور یا کوئی اور کاروبار اور پیشہ کرنے لگتے ہیں یا مقامی سیاست کے چکر میں پڑ جاتے ہیں۔ بڑے بڑے اہم مسائل ان کے ذہن سے محو ہو جاتے ہیں اور وہ پچھلا انقلابی جوش و خروش ٹھنڈا پڑ جاتا ہے۔ ان کے چست اور مضبوط جسم پر چربی چھا جاتی ہے اور جوش و ہمت پر عافیت پسندی غالب آ جاتی ہے، اوسط طبقے کے کارکنوں کے اسی لازمی رجحان کو دیکھ کر زیادہ ترقی پذیر اور انقلاب پسند کانگریسی یہ کوشش کرتے رہتے ہیں کہ اپنے ساتھیوں کو کونسلوں اور میونسپلٹیوں وغیرہ کے آئینی گورکھ دھندوں میں پھنسنے سے روکیں اور انہیں ایسی ملازمت نہ کرنے دیں جن میں انہیں اپنا سارا وقت دینا پڑے اور وہ جوش و عمل سے محروم ہو جائیں۔ حکومت نے کانگریسی کارکنوں کے روزگار حاصل کرنے کے راستے میں مشکلات حائل کر کے گویا ایک طرح سے ان کی مدد کی ہے۔ اب اس کا زیادہ امکان ہے کہ ان کا انقلابی جوش و خروش قائم رہے بلکہ اور بڑھ جائے۔

میونسپلٹی میں ایک سال سے زیادہ کام کرنے کے بعد مجھے محسوس ہوا کہ میں کوئی کارآمد خدمت انجام نہیں دے سکتا تھا۔ زیادہ سے زیادہ اتنا کر سکتا تھا کہ کام ذرا عجلت سے انجام پانے لگے اور کچھ بہتر ہو جائے۔ کوئی معقول تبدیلی عمل میں لانا بالکل ناممکن تھا اس لئے میں چنبر مین کے عہدے سے سبکدوش ہونا چاہتا تھا لیکن تمام ممبروں نے مجھے مجبور کیا کہ میں استعفیٰ نہ دوں۔ سب لوگ میرے ساتھ بڑی مہربانی اور اخلاق سے پیش آتے تھے اس لئے میرے لئے یہ مشکل تھا کہ ان کی

رائے نہ مانوں۔ آخر کار دوسرے سال کے اختتام پر میں نے استعفیٰ دے دیا۔
 یہ ۱۹۲۵ء کا ذکر ہے اسی سال موسم خزاں میں میری بیوی بہت سخت بیمار ہو گئیں
 اور مہینوں لکھنؤ کے اسپتال میں پڑی رہیں۔ کانگریس کا اجلاس اس سال کانپور میں
 ہوا تھا چونکہ میں اب بھی کانگریس کا جنرل سیکرٹری تھا اس لئے ایک پریشانی کے عالم
 میں الہ آباد، کانپور لکھنؤ دوڑا دوڑا پھرتا تھا۔

ڈاکٹروں نے میری بیوی کے متعلق یہ تجویز کیا کہ انہیں علاج کے لئے سوئٹزرلینڈ
 لے جاؤ۔ میں نے بھی اسی خیال کو پسند کیا کیونکہ میں خود ہی ہندوستان سے باہر
 جانے کا بہانہ ڈھونڈ رہا تھا۔ میرے خیالات دھندلے اور الجھے ہوئے تھے اور مجھے
 کوئی صاف اور سیدھی راہ نظر نہیں آتی تھی۔ میں نے سوچا کہ اگر میں ہندوستان سے
 دور ہوں تو شاید مختلف چیزوں کو صحیح نظر سے دیکھ سکوں اور اپنے دماغ کی تاریکی کو دور
 کر سکوں۔

غرض مارچ ۳۲ء کے شروع میں میں اپنی بیوی اور لڑکی کے ساتھ بمبئی سے
 وینس روانہ ہو گیا۔ اسی جہاز میں میری بہن اور نہروئی رنجیت۔ ایس پنڈت بھی
 تھے۔ وہ ہم سے بہت پہلے یورپ کی سیر کا ارادہ کر چکے تھے۔

یورپ میں

میں تیرہ چودہ برس کے بعد یورپ جا رہا تھا۔ اس عرصے میں یورپ جنگ عظیم انقلابات، اور زبردست تبدیلیوں کے دور سے گزر چکا تھا۔ گویا وہ پرانی دناے میں نے دیکھا تھا جنگ کی تباہ کاریوں اور خونریزیوں کی نذر ہو چکی تھی اور اب ایک نئی دناے میری منتظر تھی۔ میرا ارادہ چھ سات مہینے یا زیادہ سے زیادہ آخر سال تک یورپ میں ٹھہرنے تھا۔ لیکن مجھے پورے پونے دو برس وہاں قیام کرنا پڑا۔

اس زمانے میں میرے دماغ اور جسم دونوں کو بڑا سکون اور آرام نصیب ہوا، ہم نے زیادہ قوت سوز لینڈ کے شہر جنیوا اور مونتائے کی صحت گاہ میں گزارا۔ میری چھوٹی بہن کرشنا بھی ۱۹۲۶ء کی گرمیوں کے شروع میں ہندوستان سے آگئی اور آخر تک ہمارے ساتھ یورپ میں رہی۔ میں زیادہ عرصے تک اپنی بیماری کو تنہا نہیں چھوڑ سکتا تھا۔ اس لئے مجھے صرف تھوڑے تھوڑے دن کے لیے دوسرے مقامات پر جانے کا موقع ملا۔ جب انہیں کچھ صحت ہو گئی تو ہم نے فرانس، انگلستان اور جرمنی کی تھوڑی سیر کی۔ پہاڑ کی چوٹی پر جو چاروں طرف سرمائی برف سے ڈھکی ہوئی تھی۔ میں ہندوستان اور یورپ دونوں سے بالکل بے تعلق ہو گیا تھا خصوصاً ہندوستان اور وہاں کے واقعات سے تو کوئی واسطہ ہی نہیں رہا تھا۔ میں دنیا میں اس طرح نظر ڈالت تھا جیسے کوئی دور سے تماشہ دیکھ رہا ہوں۔ کتابوں کا مطالعہ کرتا تھا واقعات کا مشاہدہ کرتا تھا، یورپ کی سیاسی اور اقتصادی حالت اور آزادانہ معاشرتی تعلقات کو غور سے دیکھتا تھا اور ان سب چیزوں کو سمجھنے کی کوشش کرتا تھا۔ ظاہر ہے کہ جینوا کے قیام کے زمانے میں انجمن اقوام اور بین الاقوامی لیبر آفس کے کاموں سے مجھے خاص دلچسپی تھی۔

لیکن سردی شروع ہوتے ہی میں سرمائی کھیلوں میں محو ہو گیا۔ کئی مہینے تک یہی میرا شغل اور یہی شوق رہا۔ برف پر پھسلنے کی مشق تو میں نے پہلے بھی کی تھی، لیکن دو

تین گز لمبی کھڑانویں پہن کر برف پر چلنا میرے لئے نئی چیز تھی اور مجھے بہت پسند آئی۔ شروع شروع میں تو بڑی تکلیف ہوئی لیکن بار بار گرنے کے باوجود میں نے ہمت نہیں ہاری اور آخر کار اس میں لطف آنے لگا۔

بحیثیت مجموعی زندگی دلچسپی واقعات سے خالی تھی۔ دن گذرتے گئے اور رفتہ رفتہ میری بیوی کو صحت اور طاقت حاصل ہوتی گئی۔ اس عرصے میں ہم بہت کم ہندوستانیوں سے ملے بلکہ اس چھوٹی سی پہاڑی بستی کے باشندوں کے سوا اور لوگوں سے ملنے کا موقع ہی بہت کم حاصل ہوا۔ پھر بھی یورپ کے اس پونے دو برس کے قیام میں چند ہندوستانی جلاوطنوں اور پرانے انقلاب پسندوں سے ملاقات ہوئی جن کے نام میں نے اکثر سنے تھے۔

ان میں سے ایک صاحب شام جی کرشن ورماتھے جو اپنی بیمار بیوی کے ساتھ جینوا میں ایک مکان کی سب سے بالائی منزل میں مقیم تھے۔ یہ دونوں بڑھے بڑھیا بالکل تنہا رہتے تھے انکے یہاں کوئی نوکر نہ تھا۔ ان کے کمرے بند بند اور گھٹے ہوئے تھے۔ ہر چیز پر گرد کی موٹی تہ جمی ہوئی تھی۔ شام جی کے پاس روپیہ بہت تھا لیکن وہ خرچ کرنے کے قائل نہ تھے۔ وہ چند پیسے بچانے کے لئے ٹریم پر جانے کی بجائے پیدل چلنا گوارا کرتے تھے۔ ہر شخص کو جو ان کے پاس آتا تھا شے کچی نظر سے دیکھتے تھے، اور جب تک اس کے خلاف ثابت نہ ہو جائے، یہی سمجھتے تھے کہ یا تو یہ انگریزوں کا جاسوس ہے یا میرے روپے کی تاک میں ہے۔ ان کی جیبوں میں ان کے رسالے (انڈین سوشیا لوجسٹ) کے پرانے پرچھے بھرے رہتے تھے اور جہاں موقع ہوتا بڑے جوش سے انہیں نکال کر بارہ برس پہلے کا لکھکا واپا اپنا کوئی مضمون دکھاتے تھے۔ وہ اگلے وقتوں کی باتیں کیا کرتے تھے کہ ہمپیٹھ کے انڈیا ہاؤس میں یہ ہوا اور یہ ہوا۔ برطانوی حکومت نے میرے پیچھے فلاں فلاں جاسوس لگائے، میں نے انہیں اس طرح پہچانا اور یوں چکمہ دیا۔ ان کے کمروں کی تمام دیواروں پر

الماریاں لگی ہوئی تھیں جن میں پرانی کتابیں بھری تھیں لیکن سب گرد آلود اور بے ترتیب تھیں اور آنے والوں کو حسرت کی نظر سے دیکھتی تھیں۔ فرش پر بھی کتابیں اور کاغذات منتشر پڑے رہتے تھے اور اکثر اسی حالت میں انہیں دن اور ہفتے بلکہ مہینے گزر جاتے تھے۔ غرض ساری فضا پر اداسی اور رویرانی چھائی ہوئی تھی۔ زندگی وہاں ایک ناخواندہ مہمان کی حیثیت رکھتی تھی۔ انسان اس مکان کے تاریک اور سنسان برآمدوں میں سے گذرتے ہوئے ڈرتا تھا کہ کہیں موت کے فرشتے سے ٹک بھٹرنے ہو جائے اور وہاں سے باہر نکل کر اطمینان کا سانس لیتا تھا۔

شیام جی کا خیال تھا کہ اپنے روپے کا کچھ انتظام کر دیں یعنی کسی رفاہ عام کے کام کے لئے ایک وقف قائم کر دیں۔ ان کا رجحان زیادہ تر ہندوستانیوں کو غیر ممالک میں تعلیم دلانے کی طرف تھا۔ انہوں نے مجھ سے خواہش ظاہر کی کہ میں بھی ایک متولی بن جاؤں۔ لیکن میں نے اس ذمہ داری کو اپنے سر لینے کے لئے کچھ زیادہ آمدگی ظاہر نہیں کیا۔ اول تو میں ان کی مالی معاملات میں دخل دینا نہیں چاہتا تھا۔ اس کے علاوہ یہ خیال بھی تھا کہ اگر میں نے غیر معمولی دلچسپی کا اظہار کیا تو انہیں فوراً یہ خیال ہو جائے گا کہ میں بھی ان کے روپے کی فکر میں ہوں۔ کسی کو ان کی دولت کا صحیح اندازہ نہیں تھا۔ البتہ یہ ضرور سنا تھا کہ جرمن مارک کا بھاؤ گر اتوا انہیں بہت نقصان ہوا تھا۔

جنیوا میں اکثر بڑے بڑے ہندوستانی آتے رہتے ہیں۔ لیگ اقوام کے جلسوں کی شرکت کے لئے عموماً سرکاری قسم کے آدمی آتے تھے اس لئے شیام جی ان کے پاس تو پھٹکتے بھی نہ تھے البتہ لیبر آفس میں کبھی کبھی مشہور و معروف غیر سرکاری لوگ اور مقتدر کانگریسی بھی آجاتے تھے۔ شیام جی ان سے ملنے کی ضرور کوشش کرتے اور یہ مشاہدہ نہایت ہی لطف ہوتا کہ ان پر شیام جی کی ملاقات کا کیا اثر ہوتا ہے۔ عموماً وہ ان سے گھبراتے تھے، عام صحبتوں میں ان سے بچنے کی کوشش

کرتے تھے اور جہاں تک ممکن تھا گھر پر ملنے سے بھی عذر کر دیتے تھے۔ ان سے ملنا جانایا ان کے صحبت میں دیکھا جانا خطرناک سمجھا جاتا ہے۔

اس طرح شyam جی اور ان کی بیوی اپنے گوشہ عزلت میں زندگی کے دن پورے کرتے تھے، نہ ان کے کوئی اولاد تھی نہ عزیز و اقارب، نہ دوست احباب نہ انہیں کسی چیز سے کوئی تعلق تھا نہ کسی شخص سے کوئی واسطہ۔ گویا وہ گذرے ہوئے زمانے کی یادگار تھے اور اپنا وقت مدت کا ختم کر چکے تھے۔ جدید عہد میں وہ کسی طرح نہیں کھتے تھے۔ دنیا انہیں نظر انداز کرتی ہوئی آگے بڑھتی چلی جا رہی تھی لیکن ان کی آنکھوں میں اب بھی پرانی آگے کے شرارے موجود تھے اور اگرچہ مجھ میں اور ان میں بہت کم چیزیں مشترک تھیں پھر بھی مجھے ان سے پوری ہمدردی تھی اور میں ان کا بہت ادب کرتا تھا۔

حال ہی میں اخباروں سے ان کے انتقال کا حال معلوم ہوا۔ اس کے بعد ہی اس شریف کجراتی خاتون کی موت کی خبر ملی جس نے اس جلاوطنی کے زمانے میں تمام عمر ان کا ساتھ دیا۔ سنا گیا ہے کہ اس خاتون نے غیر ممالک میں ہندوستانی عورتوں کی تعلیم کے لئے بہت کافی رقم چھوڑی ہے۔

ایک اور مشہور شخص جن کا میں اکثر نام سنا کرتا تھا مگر جن سے ملنے کا پہلے پہل سوزر لینڈ میں اتفاق ہوا۔ راجہ مہندر پرتاپ تھے۔ ان دنوں وہ بڑے دلچسپ رجائیت پسند آدمی تھے اور شاید اب بھی ہوں۔ وہ ایک خیالی دنیا میں رہتے تھے حقیقی زندگی سے انہیں کوئی واسطہ نہ تھا۔ میں پہلی مرتبہ انھیں دیکھ کر حیران رہ گیا۔ وہ عجیب قسم کا مخلوط لباس پہنے ہوئے تھے جو تنبت کے پہاڑوں یا ساہریا کے میدانوں کے لئے تو موزوں ہو سکتا تھا لیکن مائٹریو میں گرمیوں کے زمانے میں تو بالکل بے تکل معلوم ہوتا تھا۔ وہ ایک نیم فوجی قسم کی پوشاک اور اونچے روسی بوٹ ڈانٹے ہوئے تھے۔ ان کے کوٹ میں بہت سی بڑی بڑی جیبیں لگی تھیں اور سب میں

کاغذات اور تصویریں وغیرہ بھری رہتی تھیں۔ ان میں جرمنی کے چانسلر بٹھ مین ہالوگ کا ایک خط تھا، قیصر کی دستخطی تصویر تھی، تبت کے دلائی لامہ کا دیا ہوا ایک خوبصورت خریطہ تھا اور قسم قسم کے کاغذات اور نوٹو تھے۔ تعجب ہوتا تھا کہ ان جیبوں میں اتنی چیزیں کیسے سما گئیں۔ انھوں نے مجھے بتایا کہ ایک مرتبہ چین میں ان کا صندوقچہ جس میں بہت سے قیمتی کاغذات تھے کھو گیا تھا۔ اس وقت سے انھوں نے یہ طریقہ اختیار کر لیا تھا کہ اپنے تمام ضروری کاغذات ہمیشہ اپنے پاس رکھیں۔ اسی لئے اس کثرت سے جیبیں لگوائی تھیں۔

راجہ مہندر پرتاپ اپنی چین، جاپان، تبت اور افغانستان کی سیاحی اور مہمات کے بے شمار داستانیں سنایا کرتے تھے۔ انھوں نے بڑی رنگ برنگ کی زندگی گزاری تھی اس لئے اس کا تذکرہ واقعی بہت دلچسپ تھا۔ ان کا تازہ ترین شوق ”مجلس شادمانی“ تھی جو خود انھوں نے قائم کی تھی اور جس کا مسلک یہ تھا کہ ”ہمیشہ خوش رہو“ اس انجمن کو لیڈویا میں (یا شاید لٹھو نیا میں) سب سے زیادہ کامیابی ہوئی۔ جینیوا میں یا دوسرے مقامات پر جو کانفرنسیں ہوتی تھیں ان کے شرکاء کے نام وقتاً فوقتاً وہ بہت سے پوسٹ کارڈ بھیجا کرتے تھے جن پر ان کا پیام چھپا ہوتا تھا۔ اس کو وہ پروپیگنڈہ کہتے تھے۔ ان پیامات کے نیچے وہ اپنے ہاتھ سے دستخط کرتے تھے لیکن جو نام لکھتے تھے وہ ایک عجیب طول طویل معجون مرکب تھا۔ انھوں نے مہندر پرتاپ کے تو صرف ابتدائی حروف (م۔ پ) لے لئے تھے اور اس کے بعد ناموں کی ایک لمبی فہرست تھی، جن میں ان کے ہر محبوب ملک کا ایک ایک نام شامل تھا اس طرح وہ اپنے بین الاقوامی اور آفاقی حیثیت کا اظہار کرتے تھے۔ یہ انوکھا نام ”خادم انسانیت“ کے موزوں لقب پر ختم ہوتا تھا۔ بہت مشکل تھا کہ کوئی شخص مہندر پرتاپ کی باتوں کو سنجیدگی سے سن سکے۔ وہ قرون وسطیٰ کی داستان کے ہیرو معلوم ہوتے تھے، گویا ڈان کونسٹوٹ راہ بھٹک کر بیسویں صدی میں آنکے

تھے۔ مگر اس میں کوئی شک نہیں کہ وہ بہ کھرے اور پر خلوص آدمی تھے۔
 فرانس میں ہم بوڑھی مادام کا ما سے ملے۔ جب وہ قریب سے انسان کے
 چہرے کو گھورتی تھیں اور انگلی سے اشارہ کر کے ڈپٹ کر پوچھتی تھیں کہ تم کون ہو تو اس
 پر ایک ہیبت سی چھا جاتی تھی۔ اس سوال کے جواب پر وہ کوئی توجہ نہیں کرتی تھیں۔
 (غالباً اس قدر بہری تھیں کہ سنتی بھی نہیں تھیں) خود ہی ایک رائے قائم کر لیتی تھیں
 اور پھر اس سے نہیں ہٹتی تھیں، خواہ واقعات کی شہادت اس کے خلاف ہو۔

ہندوستانی جلاوطنوں میں ایک شخص مولوی عبید اللہ بھی تھے جن سے میں تھوڑی
 دیر کے لئے اٹلی میں ملا تھا۔ وہ مجھے بہت تیز آدمی معلوم ہوئے لیکن اس قسم کے جو
 پرانے طرز کی سیاسی جوڑ توڑ کے لئے زیادہ موزوں تھے۔ جدید خیالات سے وہ
 باخبر نہیں تھے۔ انھوں نے ”ریا سہائے متحدہ ہند“ یا ”ہندوستان کی متحدہ
 جمہوریت“ کی ایک اسکیم تیار کی تھی جس میں فرقہ وارانہ مسائل کو بی قابلیت سے حل
 کرنے کی کوشش کی گئی تھی۔ انھوں نے مجھے اپنے قیام استنبول کے (جو اس وقت
 قسطنطنیہ کے نام سے مشہور تھا) بہت سے واقعات سنائے۔ لیکن میں سے اس
 داستان کو کچھ زیادہ اہمیت نہیں دی اور مجھے اس کا خیال بھی نہیں رہا۔ چند مہینے بعد وہ
 لالہ لاجپت رائے سے ملے اور غالباً ان کو بھی وہی قصہ سنایا۔ لالہ جی اس سے بہت
 متاثر ہوئے چنانچہ اسی سال کونسلوں کے انتخاب کے سلسلے میں اس قصے کا بہت چرچا
 رہا اور اس سے طرح طرح کے بیجا اور حیرت انگیز نتائج اخذ کئے گئے۔ کچھ دن
 کے بعد مولوی عبید اللہ حجاز چلے گئے اور اب برسوں سے مجھے ان کی کوئی خبر نہیں ملی
 ہے۔

برلن میں مجھے ایک اور مولوی صاحب یعنی مولوی برکت اللہ سے ملنے کا اتفاق
 ہوا جو بالکل دوسری قسم کے تھے۔ یہ ایک بڑے دلچسپ، نہایت جوشیلے اور نہایت
 خوش خلق بزرگ تھے۔ سیدھے سادے آدمی تھے اور کچھ زیادہ قابل اور ذہین بھی

نہیں تھے لیکن نئے خیالات کو جذب کرنے اور دنیا کی رفتار کو سمجھنے کی کوشش کرتے تھے۔ ۱۹۲۷ء میں جب ہم سوزر لینڈ میں تھے تو ہم کو معلوم ہوا کہ سین فرانسکو میں ان کا انتقال ہو گیا۔ مجھے یہ خبر سن کر بہت صدمہ ہوا۔

برلن میں بہت سے ایسے لوگ ملے جنہوں نے جنگ کے زمانے میں وہاں ایک ”ہندوستانی کمیٹی“ قائم کی تھی۔ لیکن یہ کمیٹی عرصہ ہوا منتشر ہو چکی تھی۔ اس کے اراکین میں آپس میں اختلاف پیدا ہوا اور طرح طرح کے جھگڑے ہوئے کیونکہ ان میں سے ہر شخص دوسرے پر غداری کا شبہ کرتا تھا۔ سیاسی جلاوطنوں کی ہر جگہ یہی کیفیت نظر آتی ہے۔ جرمنی میں جنگ کے بعد روزگار میسر آنا بہت مشکل تھا پھر بھی برلن کے ان ہندوستانیوں میں سے اکثر نے جب موقع ملا اوسط درجے کے پرسکون پیشے اختیار کر لئے اور تمام انقلابی تحریکوں سے علیحدہ ہو گئے۔ یہاں تک کہ وہ سیاست سے بھی بچنے لگے۔

جنگ کے زمانے کی اس ہندوستانی کمیٹی کا قصہ بھی بہت دلچسپ ہے۔ اس کے اراکین میں زیادہ تر وہ ہندوستانی طالب علم تھے جو ۱۹۱۴ء کی ہنگامہ زا گرمیوں میں جرمنی یونیورسٹی میں تعلیم پا رہے تھے۔ وہ جرمن طلبہ کے ساتھ مل جل کر رہتے تھے۔ ان کے گیت گاتے تھے۔ ان کے کھیلوں میں شریک ہوتے تھے۔ ان کے ساتھ بئیر پیتے تھے اور ان کی تہذیب کو ہمدردی اور قدر کی نظر سے دیکھتے تھے۔ جنگ سے انہیں کوئی تعلق نہ تھا لیکن وہ اس قومی جنون کے سیلاب سے نہ بچ سکے جو اس وقت جرمنی کو بہائے لئے جا رہا تھا۔ اصل میں ان میں جرمنیکی دوستی کا جذبہ نہیں بلکہ برطانیہ کی دشمنی کا جذبہ کارفرما تھا اور ان کی وطن پرستی نے انہیں برطانیہ کے دشمنوں کا ہمدرد بنا دیا تھا۔ جنگ چھڑنے کے بعد ہی اور ہندوستانی جو زیادہ کھلے ہوئے انقلابی تھے سوزر لینڈ کے راستے جرمنی پہنچ گئے۔ ان لوگوں نے اپنی ایک کمیٹی بنائی اور فوراً ہر دیال کو طلب کیا جو اس وقت امریکہ کے مغربی ساحل پر تھے۔

ہر دیال تو چند مہینے بعد پہنچے لیکن اس عرصے میں کمیٹی کو خاصی اہمیت حاصل ہو گئی۔ اصل میں جرمن حکومت نے خود ہی اسے اہمیت دے دی تھی۔ کیونکہ ظاہر ہے کہ وہ برطانیہ کی ہر مخالف تحریک سے فائدہ اٹھانا چاہتی تھی۔ دوسری جانب ہندوستانی اس وقت کے بین الاقوامی معاملات کو اپنے قومی اغراض و مقاصد کے لئے استعمال کرنا چاہتے تھے مگر انہیں یہ گوارا نہ تھا کہ جرمنی محض اپنے مفاد کے لئے ان کو آلہ کار بنائے۔ اگرچہ اس وقت وہ جرمن حکومت کے بس میں تھے مگر وہ یہ سمجھتے تھے کہ ہمارے پاس کوئی ایسی چیز ہے جسے حاصل کرنے کے لئے یہ حکومت بے چین ہے۔ اس لئے انہوں نے سودا چکانا شروع کر دیا اور اس پر اصرار کیا کہ ہندوستان کی آزادی کا قول و قرار کر لیا جائے۔ معلوم ہوتا ہے کہ جرمنی کے دفتر خارجہ نے ان سے کوئی بانضبطہ معاہدہ کیا تھا جس کی رو سے اس نے وعدہ کیا تھا کہ اگر جنگ میں جرمنی کو فتح حاصل ہوئی تو وہ ہندوستان کو آزاد ملک تسلیم کر لے گا۔ اس وعدے پر اور بعض اور جزوی شرائط پر ہندوستانی کمیٹی نے جنگ میں جرمنی کو مدد کرنے کا اقرار کیا تھا۔ غرضیکہ اس کمیٹی کا سرکاری طور پر ہر طرح کا اعزاز و اکرام ہوتا تھا۔ اور اس کے نمائندوں کو مختلف سلطنتوں کے سفیروں کے برابر جگہ دی جاتی تھی۔

ایک چھوٹی سی جماعت کو جو زیادہ تر نا تجربہ کار نوجوانوں پر مشتمل تھی یکا یک اتنی اہمیت حاصل ہو جانے کا یہ نتیجہ ہوا کہ ان میں اکثروں کے سر پھر گئے۔ وہ سمجھنے لگے کہ ہم ہندوستان کی تاریخ بدل رہے ہیں اور کوئی زبردست کارنامہ اور عظیم الشان مہم سرانجام دے رہے ہیں۔ ان میں سے بہتوں کو عجیب عجیب حادثات پیش آئے۔ بڑے بڑے خطرات سے بال بال بچے۔ جنگ کے اختتام کے زمانے میں ان کی اہمیت بہت کم ہو گئی تھی اور حکومت جرمنی نے انہیں نظر انداز کرنا شروع کر دیا۔ ہر دیال کا پتا تو بہت پہلے کٹ چکا تھا۔ کیونکہ کمیٹی سے ان کی بالکل نہ تھی۔ حکومت جرمنی اور کمیٹی دونوں انہیں ناقابل اعتماد شخص سمجھتے تھے اس لئے

انہوں نے بہت خاموشی سے رفتہ رفتہ انہیں کھسکا دیا۔ بہت مدت بعد جب ۱۹۲۶ء و ۱۹۲۷ء میں، میں جرمنی گیا تو مجھے یہ دیکھ کر حیرت ہوئی کہ یورپ کہ اکثر قدیم باشندے ہر دیال کے متعلق کتنے بڑے خیالت رکھتے تھے۔ اس وقت وہ سوئیڈن میں مقیم تھے۔ مجھے ان سے ملنے کا اتفاق نہیں ہوا۔

جنگ ختم ہوئی اور اس کے ساتھ ہیبرلن کی ہندوستانی کمیٹی بھی ختم ہو گئی۔ تمام امیدوں کے خاک میں مل جانے کے بعد ان ہندوستانیوں کو زندگی دو بھر ہو گئی، یہ لوگ بہت اونچی بازی لگا کر ہار گئے تھے اور یوں بھی جگن کے زمانے کی سرگرمی اور اہمیت کے بعد انہیں زندگی بہت بے مزہ معلوم ہوتی ہوگی اور پھر اس بے مزہ زندگی میں بھی انہیں اطمینان نصیب نہ تھا۔ ہندوستان تو واپس جا ہی نہیں سکتے تھے اور جنگ کے بعد شکست خوردہ جرمنی میں رہنا آسان نہ تھا پچارے بڑی کشمکش میں بسر کرتے تھے بعد میں ان میں سے بعض لوگوں کو حکومت برطانیہ نے ہندوستان واپس جانے کی اجازت دیدی لیکن اکثر کو جرمنی ہی میں ٹھہرنا پڑا۔ ان کی حیثیت عجیب و غریب تھی۔ لوئی سلطنت انھیں اپنی رعیت تسلیم نہیں کرتی تھی۔ ان کے پاس باضابطہ پاسپورٹ نہیں تھے اس لئے جرمنی سے باہر قدم نکالنا ناممکن تھا اور وہاں رہنے میں بھی بڑی مشکلوں کا سامنا تھا کیونکہ وہ سراسر مقامی پولیس کے رحم و کرم پر تھے۔ غرض ان کی زندگی خطرے اور مصیبت سے پر تھی۔ آئے دن کی پریشانیاں اور روزی کی فکر چین نہیں لینے دیتی تھی۔

۱۹۳۳ء کے آغاز میں نازی دور شروع ہوا۔ اس نے ان کی مصیبتوں میں اور اضافہ کر دیا۔ ان نے سے مفر کی یہی ایک صورت تھی کہ نازی اصولوں کو حرف بحرف تسلیم کر لیں۔ جرمنی میں اب ان غیر ملکیوں کو جو نازی (۱) نسل سے نہ ہوں خصوصاً ایشیاء والوں کا رہنا پسند نہیں کیا جاتا۔ ہاں اگر وہ حکومت کی مرضی پر چلیں تو ان کو وجود گوارا کر لیا جاتا ہے، ہٹلر علی الاعلان یہ کہہ چکا ہے کہ وہ ہندوستان میں

برطانوی شہنشاہی کا حامی ہے۔ غالباً اس وجہ سے کہ وہ برطانیہ کی خوشنودی حاصل کرنا چاہتا ہے۔ ظاہر ہے کہ چند ہندوستانیوں سے حکومت برطانیہ ناخوش ہے ان سے اسے کوئی ہمدردی نہیں۔

برلن میں ہم ایک اور جلاوطن سے ملے جو زمانہ جنگ کی ہندوستانی جماعت کے خاص رکن تھے ان کا نام چمپک رمن پلے تھا۔ وہ اپنے آپ کو بہت بڑا آدمی سمجھتے تھے اور نوجوان ہندوستانی طلبہ نے انہیں طنز کے طور پر ایک شاندار خطاب (۲) دے رکھا تھا۔ ان کا تصور خالص قوم پرستی تک محدود تھا اور کسی مسئلے کو سماجی یا اقتصادی نظر سے نہیں دیکھتے تھے۔ جرمن قوم پرستوں (یعنی نفاذی خودوالوں) کے ساتھ ان کی خوب نہتی تھی۔ وہ جرمنی کے ان معدودے چند ہندوستانیوں میں تھے جن کے نازیوں سے میزان پٹ گئی تھی۔ ابھی چند مہینے ہوئے میں نے جیل میں پڑھا کہ برلن میں ان کا انتقال ہو گیا۔

دیریندر ناتھ چٹوپادھیائے جو ہندوستان کیا ایک مشہور خاندان کے فرد تھے، بالکل دوسری قسم کے شخص تھے۔ عام طور پر وہ چٹو کے نام سے مشہور تھے اور بڑے قابل اور دلچسپ آدمی تھے۔ بیچارے ہمیشہ تنگ دست رہتے تھے، پھٹے پرانے کپڑے پہن کر گزر کرتے تھے اور کبھی کبھی فاقے کی نوبت آ جاتی تھی۔ مگر خوش مزاجی اور زندہ دلی نے کبھی ان کا ساتھ نہ چھوڑا۔ جب میں انگلستان میں تعلیم پاتا تھا تو وہ مجھ سے چند جماعت آگے تھے۔ یعنی جس وقت میں ہیرو میں داخل ہوا تو وہ آکسفورڈ میں پڑھتے تھے۔ اس کے بعد سے پھر انہیں ہندوستان آنا نصیب نہیں ہوا۔ کبھی کبھی وطن کی یاد دلاتی ہے اور ہندوستان واپس آنے کے لئے تڑپتے ہیں۔ وطن سے ان کے تمام تعلقات منقطع ہو چکے ہیں اور یہ یقینی امر ہے کہ یہاں آ کر ان کا جی گھبرائے گا اور یہاں کی زندگی میں ہیں کھپ سکیں گے۔ لیکن اتنی مدت گزر جانے کے بعد، اس جہاں گردی کے باوجود وطن کی کشش اب بھی باقی

ہے۔ یہ روگ جسے میزبنی نے ”روحانی دق“ کہا ہے، سب جلاوطنوں میں عام ہے کوئی اس سے نہیں بچ سکتا۔ اگرچہ میں سیاسی جلاوطنوں کی قربانیوں کی دل سے قدر کرتا ہوں اور مجھے ان کی مصیبتوں اور مشکلوں کا اعتراف اور ان سے ہمدردی ہے لیکن یہ واقعہ ہے کہ جن سے ملنے کا مجھے اتفاق ہوا ان میں بیشتر حضرات سے میں کچھ زیادہ متاثر نہیں ہوا۔ ان کے علاوہ اور بھی بہت سے لوگ ہیں جو دنیا کے مختلف حصوں میں پھیلے ہوئے ہیں۔ ان میں سے بعض کو ہم نام سے جانتے ہیں۔ باقی سب لوگ ہندوستان سے بے تعلق ہو گئے ہیں اور ان کے ہم وطن جن کی خاطر انہوں نے مصیبتیں جھیلیں، انہیں بالکل بھول گئے ہیں۔ بہر حال جن چند جلاوطنوں سے میں ملا، ان میں سے صرف چٹوپادھیہ اور ایم این رائے کی قابلیت نے مجھے متاثر کیا۔ رائے سے ماسکو میں صرف آدھ گھنٹے کی ملاقات ہوئی۔ اس وقت وہ بہت مشہور اشتراکی تھے۔ یکن بعد میں وہ کومنٹرن کی خالص اشتراکیت سے بہت ہٹ گئے تھے۔ اب تین سال سے وہ ہندوستان میں قید ہیں۔ چٹو جہاں تک مجھے معلوم ہے باضابطہ اشتراکی نہیں تھے لیکن ان کا رجحان اشتراکیت کی طرف ضرور تھا۔ اور سینکڑوں ہندوستانی یورپ میں مارے مارے پھرتے ہیں وہ انقلابی طرز کی گفتگو کرتے ہیں۔ انوکھی من چلے پن کی تجویزیں سمجھاتے ہیں اور عجیب و غریب سوالات کرتے ہیں ان پر برطانیہ کے جاسوس ہونے کا شبہ ہوتا ہے۔

ہم بہت سے یورپیوں اور امریکیوں سے بھی ملے۔ جینیوا سے کئی باررو میں رولاں کی زیارت کے لئے وے نو دے بھی گئے۔ پہلی مرتبہ ہم گاندھی جی کا تعارفی خط لے گئے تھے۔ ارنسٹ ٹولر کی ملاقات بھی ایک قابل قدر یادگار ہے۔ یہ جرمن زبان کا نوجوان شاعر اور ڈراما نویس ہے لیکن اب نازیوں کے دور میں وہ جرمن نہیں رہا ہے۔ نیو پارک کی سول لبرٹیز یونین کے بانی، روبر بالڈون کی ملاقات پر بھی ہمیں فخر ہے۔ جینیوا میں مشہور مصنف دھن گوپال مکرجی سے ہماری دوستی ہو گئی

تھی۔ وہ عرصے سے امریکہ میں بودوباش اختیار کر چکے ہیں۔

یورپ کی روانگی سے پہلے میں ہندوستان ہی میں آکسفورڈ کی تحریک کے علمبردار فرینک نجمیں سے بھی ملا تھا۔ انہوں نے اپنی تحریک کے متعلق چند کتابیں مجھے دی تھیں اور میں نے بڑے استعجاب کے ساتھ انہیں پڑھا تھا۔ یہ فوری تبدیل عقائد، اعتراف گناہ اور احیائے مذہب کی عام فضا۔ علم و عقل کے ساتھ کچھ کھپتی نہیں۔ میری سمجھ میں نہیں آتا کہ بعض لوگ جو بظاہر سمجھ دار معلوم ہوتے ہیں ان عجیب و غریب خیالات کو کیسے گوارا کر لیتے ہیں اور کیونکہ ان سے اتنے متاثر ہو جاتے ہیں مجھے اس تحریک کے مطالعہ کا اشتیاق پیدا ہو گیا اور جنیوا میں فرینک نجمیں سے پھر ملا انہوں نے مجھے اپنی بین الاقوامی ہاؤس پارٹی میں شرکت کی دعوت دی جو شاید رومانیہ میں ہونے والی تھی۔ مجھے افسوس ہے کہ وہاں جا کر میں اس نئی جذباتی تحریک کو قریب سے نہ دیکھ سکا۔ میرا اشتیاق اب بھی باقی ہے اور جتنا زیادہ مجھے اس تحریک کی ترقی کا علم ہوتا ہے اتنی ہی حیرت بڑھتی ہے۔

۱۔ لائے قد کورے رنگ اور لمبوترے سر کی نسل جو ناروے، سویڈن، جرمنی اور

شمالی برطانیہ میں آباد ہے۔

۲۔ ہندوستانی انہیں ”گھنم رائٹ“ کہا کرتے تھے جو جرمنی میں ”رائٹ

آزہیل“ کے مساوی ہے۔

ہندوستان میں پھوٹ

ہم ابھی سونز رلینڈ پہنچے ہی تھے کہ انگلستان میں عام ہڑتال ہو گئی۔ یہ سن کر میں جوش سے بیتاب ہو گیا۔ فطرتاً مجھے ہڑتالیوں سے ہمدردی تھی۔ چند روز بعد جب ہڑتال ناکام ہوئی تو مجھے ذاتی طور پر صدمہ ہوا۔ کچھ مہینے بعد مجھے چند روز کے لئے انگلستان جانے کا اتفاق ہوا۔ کان کنوں کی جنگ ابھی جاری تھی اور رات کے وقت لندن میں نیم تاریکی کا عالم رہتا تھا۔ میں خود کانوں کے علاقے میں گیا۔ غالباً یہ ڈربی شائر میں واقع تھا۔ میں نے مردوں، عورتوں، بچوں کے فلاکت زدہ اور ترے ہوئے چہرے دیکھے۔ اس سے زیادہ مجھے یہ دیکھ کر حیرت ہوئی کہ بہت سے ہڑتالیوں اور ان کی بیویوں پر مقامی عدالت میں مقدمے چل رہے تھے۔ کوئی کی کانوں کے ڈاکٹر یا مینجر خود ہی مجسٹریٹ تھے۔ وہ ان مقدموں کی سماعت کرتے تھے اور چھوٹے سے چھوٹے جرموں پر ہنگامی قوانین کے ماتحت کان کنوں کو سزائیں دیتے تھے۔ ایک مقدمے پر تو مجھے بڑا غصہ آیا۔ تین چار عورتیں پیش ہوئیں جن کی گودوں میں ننھے ننھے بچے تھے۔ ان غریبوں کا جرم یہ تھا کہ انھوں نے ہڑتال میں شریک نہ ہونے والوں پر لعن طعن کی تھی۔ یہ نوجوان مائیں اور ان کے بچے دونوں مصیبت اور فاقوں کے مارے معلوم ہوتے تھے۔ اس طویل جنگ نے ان ک اپلیتھن نکال دیا تھا، اور ان کے دلوں میں ان لوگوں کی طرف سے جو ہڑتال میں شریک نہیں ہوئی تھی اور ان سے ان کی روزی چھین رہے تھے۔ نفرت پیدا ہو گئی تھی۔

لوگ کہتے ہیں کہ دنیا میں انصاف ایک طبقے کے ساتھ ہوتا ہے۔ ہندوستان میں تو اس کی مثالیں عام ہیں۔ لیکن کم سے کم انگلستان میں مجھے یہ توقع نہ تھی، کہ اس کی ایسی کھلی ہوئی مثال نظر آئے گی۔ اسی وجہ سے مجھے ایک دھچکا سا لگا۔ ایک اور چیز سے بھی مجھے بڑی حیرت ہوئی یعنی وہاں کے ہڑتالی بالکل سہمے ہوئے

تھے۔ پولیس اور حکام نے انھیں خوف زدہ کر دیا تھا۔ چنانچہ وہ اس ذلت آمیز سلوک کو بڑی مسکینیت سے برداشت کرتے تھے۔ یہ صحیح ہے کہ اس طویل جنگ نے ان کی کمر توڑ دی تھی۔ ان کی ہمتیں جواب دے چکی تھیں اور دوسری مزدور انجمنوں کے لوگ انھیں بیچ منجھدار میں چھوڑ کر الگ ہو گئے تھے۔ پھر بھی ان اور ہندوستان کے غریب مزدوروں میں زمین آسمان کا فرق تھا۔ برطانوی کان کنوں کی اب بھی ایک طاقت اور انجمن موجود تھی۔ ساری قوم بلکہ ساری دنیا کی مزدور انجمنوں کی ہمدردی انھیں حاصل تھی اور نشر و اشاعت کے ذرائع اور دوسرے قسم کے طرح طرح کے وسائل میسر تھے ہندوستانی مزدوروں کو یہ چیزیں بھلا کہاں نصیب! لیکن پھر بھی دونوں کے سہمے ہوئے چہروں میں بہت مشابہت تھی۔

ہندوستان میں اس سال اسمبلی اور کونسلوں کے سہ سالہ انتخابات ہونے والے تھے۔ مجھے ان سے کوئی دلچسپی نہیں تھی لیکن اس سلسلے میں جو ہنگامہ خیز تحریکیں چھڑیں ان کی بھنک سوئٹزرلینڈ میں میرے کانوں تک بھی پہنچ گئی۔ مجھے معلوم ہوا کہ پنڈت مدن موہن مالویہ اور لالہ لاجپت رائے نے سوراج پارٹی کی مخالفت میں ایک نئی پارٹی بنائی ہے، جس کا نام نیشنلسٹ پارٹی ہے۔ نہ اس وقت میری سمجھ میں آیا اور نہ اب تک میں یہ سمجھ سکا ہوں کہ آخر کن اصولوں کی بنا پر یہ نئی پارٹی پرانی پارٹی سے علیحدہ ہر تیب دی گئی۔ سچ پوچھئے تو آج کل ہندوستان کی اکثر پارٹیوں میں محض نام کا فرق ہے۔ کوئی اصولی اختلاف نہیں، اس میں شک نہیں کہ سوراج پارٹی نے پہلے پہل کونسلوں میں ایک نئے اور جارحانہ طرز عمل کا نمونہ پیش کیا اور ایک انتہا پسندانہ پالیسی اختیار کی لیکن اس میں اور دوسری پارٹیوں میں فرق صرف درجے کا تھا، ورنہ تھیں سب ایک ہی قسم کی۔

یہ نئی نیشنلسٹ پارٹی نسبتاً اعتدال پسندانہ خیالات رکھتی تھی اور سوراج پارٹی کی نسبت اس کا رجحان حکومت کی طرف زیادہ تھا۔ اس کے علاوہ یہ خالص ہندو پارٹی

تھی اور مہاسبھا کے ساتھ مل کر کام کر رہی تھی۔ مالویہ جی کا اس کی رہبری کرنا قدرتی بات تھی کیونکہ خود ان کا پبلک معاملات میں قریب قریب یہی رویہ تھا۔ پرانے تعلقات کی وجہ سے وہ کانگریس کے ممبر تو رہے، لیکن خیالات کے اعتبار سے ان میں اور لبرلوں یا اعتدال پسندوں میں کوئی خاص فرق نہ تھا۔ وہ ترک موالات یا کانگریس کی عملی جدوجہد کے نئے طریقے کو کچھ اچھی نظر سے نہیں دیکھتے تھے اور کانگریس کی پالیسی کے طے کرنے میں ان کو کوئی دخل نہ تھا۔ اگرچہ کانگریس والے اب بھی ان کی بڑی عزت کرتے تھے اور انھیں ہاتھوں ہاتھ لیتے تھے۔ لیکن سچ پوچھئے تو جدید کانگریس میں ان کی کھپت نہیں ہو سکتی تھی وہ کانگریس کی ورکنگ کمیٹی کے ممبر نہیں تھے اور انھوں نے کانگریس کے احکام کی خصوصاً آئین ساز مجالس کے معاملے میں تعمیل نہیں کی تھی۔ ہندو مہاسبھا میں وہ سب سے زیادہ ہر دل عزیز تھے اور فرقہ وارانہ معاملات میں ان کی پالیسی کانگریس سے بالکل مختلف تھی۔ کانگریس سے انھیں وہ جذباتی تعلق تھا جو کسی شخص کو اس ادارے سے ہوا کرتا ہے جس سے شروع سے اس کا تعلق رہا ہو اور پھر یہ بھی تھا کہ جنگ آزادی کی کشش انھیں اپنی طرف کھینچتی تھی اور وہ دیکھ رہے تھے کہ ملک میں کانگریس ہی ایک ایسی جماعت ہے جو اس معاملے میں کوئی موثر کام کر رہی ہے۔ گویا ان کا دل تو اکثر کانگریس کے ساتھ ہوتا تھا۔ خصوصاً جب جنگ چھڑی ہوئی ہو۔ لیکن ان کا دماغ دوسروں کی طرف ہوتا تھا۔ اس کی وجہ سے ان کے نفس ہمیں ہمیشہ ایک کش مکش رہا کرتی تھی۔ اور کبھی کبھی وہ ایک وقت میں دو مخالف راستوں پر چلنے کی کوشش کرتے تھے۔ لازمی طور پر اس کا نتیجہ یہ ہوتا تھا کہ قومی معاملات میں ایک خلفشار پیدا ہو جاتا تھا۔ لیکن قوم پرستی خود ایک معجون مرکب ہے اور مالویہ جی خالص قوم پرست تھے۔ سماجی یا اقتصادی تبدیلیوں سے انھیں کوئی سروکار نہ تھا۔ وہ تمدنی سماجی اقتصادی ہر حیثیت سے قدیم دقیانوسی نظام کے حامی رہے ہیں اور اب بھی ہیں۔

چنانچہ ہندوستان کے والیان ریاست تعلقہ دار اور بڑے بڑے زمیندار انھیں بجا طور پر اپنا محسن اور مربی تصور کرتے ہیں۔ وہ صرف اتنی تبدیلی چاہتے ہیں اور دل سے چاہتے ہیں کہ غیر ملکی قبضہ ہندوستان سے اٹھ جائے۔ ان کی نوجوانی کی سیاسی تربیت اور مطالعہ اب بھی ان کے دماغ پر حاوی ہے اور وہ بیسویں صدی کی دنیا کو جو جنگ عظیم کے بعد حرکت پسند اور انقلاب پذیر بن گئی انیسویں صدی کے سکون پسند خیالات، ٹ۔ہ گرین، جان اسٹوارٹ مل، گلیڈ اسٹون اور مارلے کے عینک سے تین چار ہزار سال پرانے ہندو تہذیب و تمدن کی روشنی میں دیکھتے ہیں۔ یہ ایک عجیب مخلوط اور مقصداً نقطہ نظر ہے لیکن مالوی جی کو اپنے اوپر بھروسہ ہے کہ وہ ہر قسم کے متضاد خیالات میں ہم آہنگی پیدا کر سکتے ہیں۔ وہ مسلسل قومی خدمات جو ابتدائے عمر سے اب تک مختلف میدانوں میں انجام دیتے رہے۔ وہ غیر معمولی کامیابی جو انھیں ہندو یونیورسٹی جیسا زبردست قومی ادارہ قائم کرنے میں حاصل ہوئی۔ ان کا جوش اور خلوص ان کا کمال خطابت، ان کی نرمی اور بردباری، ان کی دلکش شخصیت، ان تمام چیزوں نے مل کر ان کو ہندوستانی قوم خصوصاً ہندوؤں میں بہت محبوب اور مقبول بنا دیا ہے۔ ممکن ہے کہ بہت سے لوگ سیاسیات میں ان سے متفق نہ ہوں اور ان کی پیروی نہ کریں مگر سب ان کو محبت اور عزت کی نظر سے دیکھتے ہیں۔ قومی کاموں کے طویل تجربے اور سن و سال کی بزرگی کے لحاظ سے وہ ہندوستانی سیاست کے پیر دانشمند سمجھے جاتے ہیں گر خیالات کے لحاظ سے ذرا پرانے ہو گئے ہیں اور جدید دنیا سے انھیں کوئی تعلق نہیں رہا ہے۔ ان کی آوازاں بھی سب کو متوجہ کرتی ہے مگر ان کی باتیں بہت سے لوگ نہ سمجھتے ہیں نہ سنتے ہیں۔

غرض یہ ایک قدرتی بات تھی کہ مالویہ جی سوراج پارٹی میں شریک نہیں ہوئے کیونکہ سیاسی معاملات میں وہ ان سے بہت آگے بڑھی تھی اور اس میں کانگریس کی باضابطہ پیروی کی شرط تھی۔ وہ ایک ایسی پارٹی چاہتے تھے جو زیادہ اعتدال پسند ہو۔

اور سیاسی فرقہ وارانہ مسائل میں اتنی پابندیاں عائد نہ کرے۔ یہ سب صفات ان کی نئی پارٹی میں موجود تھیں سچ کے وہ خودبانی اور رہبر تھے۔

البتہ یہ سمجھ میں نہیں آتا کہ لالہ لاجپت رائے اس نئی پارٹی میں کیوں شامل ہو گئے۔ اس میں شک نہیں کہ وہ بھی کسی حد تک اعتدال پسند اور فرقہ پرستی کی طرف مائل تھے۔ لیکن اسی سال گرمیوں میں، میں جینوا میں ان سے ملا تھا۔ اور اس وقت ان کی گفتگو سے قطعاً یہ ظاہر نہیں ہوتا تھا کہ وہ سوراج پارٹی کے خلاف جہاد کرنے والے ہیں۔ مجھے اب بھی نہیں معلوم کہ یہ صورت کیسے پیدا ہوئی۔ لیکن انتخاب کے دوران میں انھوں نے چند مبہم الزامات کا ذکر کیا جس سے یہ پتہ چلا کہ وہ کن خیالات کے چکر میں تھے۔ انھوں نے کانگریس کے لیڈروں پر یہ الزام لگایا کہ وہ بیرون ہند کے لوگوں سے ساز باز رکھتے ہیں اور یہ بھی کہا کہ کابل میں کانگریس کی شاخ قائم کرنے کا مقصد یہی تھا۔ باوجودیکہ ان سے بارہا اصرار کیا گیا لیکن انھوں نے نہ کبھی اس الزام کی تفصیلات بتائیں اور نہ کوئی ثبوت پیش کیا۔

مجھے خوب یاد ہے کہ جب ہندوستان کے اخبارات میرے پاس سوزر لینڈ پہنچے اور مجھے لالہ جی کے ان الزامات کا علم ہوا تو میں حیرت میں رہ گیا۔ سکرٹیری کی حیثیت سے میں کانگریس کے تمام معاملات سے اچھی طرح واقف تھا۔ بلکہ کابل کی کمیٹی کا الحاق میں نے خود کرایا تھا (یہ تحریک اصل میں دیش بندھو داس کی تھی) بہر حال مجھے ان الزامات کی تفصیل نہ اس وقت معلوم تھی اور نہ اب معلوم ہے لیکن ان کی عام نوعیت کو دیکھتے ہوئے میں یہ کہہ سکتا ہوں کہ جہاں تک کانگریس کا تعلق ہے وہ محض بے بنیاد تھے۔ معلوم نہیں لالہ جی کو کیونکر غلط فہمی پیدا ہوئی۔ ممکن ہے انھوں نے مختلف افواہوں پر اعتبار کر لیا ہو۔ لیکن میرا خیال ہے کہ وہ مولوی عبید اللہ کی گفتگو سے متاثر ہوئے حالانکہ میرے نزدیک اس میں کوئی غیر معمولی بات نہیں تھی۔ لیکن کونسلوں کا انتخاب عجیب و غریب ہے۔ اس میں انسان کے مزاج کا

توازن بگڑ جاتا ہے اور اس کا اخلاقی معیار بدل جاتا ہے۔ جوں جوں مجھے انتخابات کا تجربہ ہوتا جاتا ہے میری حیرت بڑھتی جاتی ہے اور مجھے ان سے ایک قسم کی نفرت پیدا ہو گئی ہے جو جمہوریت کے منافی ہے۔

لیکن شخصیتوں سے قطع نظر، ملک میں فرقہ وارانہ حالات کی رفتار ایسی تھی کہ یوں بھی نیشنلسٹ پارٹی اس قسم کی کسی دوسری پارٹی کا نمودار ہونا لازمی تھا۔ ایک طرف مسلمانوں کو ہندو اکثریت سے خوف تھا۔ دوسری طرف ہندو اس پر مشتمل تھے کہ مسلمان ہم پر دھونس جماتے ہیں، ان میں سے بہتوں کو یہ شکایت تھی کہ مسلمان ہم پر دباؤ ڈال کر کام نکالنا چاہتے ہیں اور دشمن سے مل جانے کی دھمکی دیکر خاص مراعات کا مطالبہ کرتے ہیں۔ ہندو مہاسبھا کو اسی وجہ سے اہمیت حاصل ہو گئی کہ وہ ہندو قوم پرستی کی یعنی مسلم فرقہ پرستی کے مقابلے میں ہندو فرقہ پرستی کی علمبردار تھی۔ مہاسبھا کی مخالفانہ کاروائیوں نے مسلم فرقہ پرستی میں اور شدت پیدا کر دی۔ اس طرح عمل اور رد عمل کا ایک سلسلہ بندھ گیا اور نتیجہ یہ ہوا کہ ملک میں فرقہ پرستی کا دور دورہ ہو گیا۔ اصولاً یہ اکثریت اور ایک بڑی اقلیت کا مسئلہ تھا اگر عملی طور پر بعض صوبوں میں صورت حال بالکل برعکس تھی مثلاً پنجاب اور سندھ میں سکھ اور ہندو اقلیت میں تھے اور مسلمان اکثریت میں۔ لہذا مسلم اقلیت کو بحیثیت مجموعی سارے ملک میں اکثریت سے جو خوف تھا وہی ان صوبوں کی اقلیتوں کو ان سے تھا۔ بلکہ یہ کہنا زیادہ صحیح تھا۔ بلکہ یہ کہنا زیادہ صحیح تھا کہ کہیں دوسرے فرقہ والے انھیں نکال باہر نہ کر دیں۔ اس کے علاوہ جو مستقل حقوق کے مالک ہیں انھیں، کسی حد تک یہ خوف تھا کہ کوئی ایسا بنیادی تغیر نہ ہو جائے جس سے ان کے ذاتی مفاد خطرے میں پڑ جائیں۔

سوراج پارٹی کو فرقہ وارانہ جماعتوں سے جا ملے۔ اسی طرح بعض ہندو اراکین نیشنلسٹ پارٹی میں شریک ہو گئے۔ جہاں تک ہندوؤں کا تعلق تھا مالویہ جی

اور لالہ جی کا اتحاد نہایت با اثر اور طاقتور ہو گیا تھا۔ لالہ جی کا پنجاب میں خاص اثر تھا اور اس صوبے میں فرقہ پرستی کا سب سے زیادہ زور تھا۔ سوراج پارٹی یا کانگریس کی طرف سے الیکشن لڑانے کا سارا بوجھ والد پر آ پڑا کیونکہ سی۔ آر۔ داس اب ان کا ہاتھ بٹانے کو موجود نہ تھے۔ والد کو لڑائی میں لطف آتا تھا یہ کم سے کم اس سے گھبراتے نہیں تھے۔ بہر حال مخالفوں کی بڑھتی ہوئی قوت کو دیکھ کر انھوں نے بھی اپنا پورا زور لگا دیا۔ دونوں کی طرف سے خوب خوب چوٹیں چلیں۔ ایک نے دوسرے کے ساتھ کسی قسم کی رعایت اور مروت سے کام نہیں لیا۔ انتخاب کے بعد بھی اس کی تلخیاں ایک عرصے تک لوگوں کے دلوں سے نہیں گئیں۔

نیشنلسٹ پارٹی کو خاصی کامیابی ہوئی لیکن اس کامیابی نے اسمبلی کو سیاسی حیثیت سے بہت گرا دیا۔ اس کا پلہ اعتدال پسندی کی طرف جھک گیا۔ خود سوراج پارٹی کانگریس میں اعتدال پسند جماعت کی حیثیت رکھتی تھی۔ پھر اپنی قوت برحانے کے خیال سے اس نے بہت سے مشتبہ لوگوں کو بھی داخل کر لیا جس کا لازمی نتیجہ یہ ہوا کہ اسکے سیاسی وقار کو بہت صدمہ پہنچا۔ نیشنلسٹ پارٹی نے بھی یہی طرز عمل اختیار کیا بلکہ اس سے بھی گرا ہوا۔ چنانچہ اس نے خطاب یافتوں، بڑے بڑے زمینداروں، کارخانوں کے مالکوں اور دوسرے لوگوں کو جنھیں سیاست سے کوئی تعلق نہ تھا اکٹھا کر کے اپنے آپ کو ایک عجیب معجون مرکب کر لیا۔

۱۹۲۶ء کے آخر میں ایک بڑا اندوہناک حادثہ پیش آیا جس نے سارے ہندوستان میں ہل چل ڈال دی۔ اس سے روشن ہو گیا کہ فرقہ پرستی کے جوش میں ہم کتنی ذلیل سے ذلیل حرکت کر سکتے ہیں۔ سوامی شردھانند بسترعلالت پر پڑے تھے۔ اور ایسی حالت میں ایک مذہبی دیوانے نے انھیں قتل کر دیا۔ اس شخص کو جو گورکھوں کے برچھوں کے سامنے سینہ تان کر کھڑا ہو گیا تھا، اور گولیوں کی بوچھاڑ میں بڑھتا چلا گیا تھا۔ یہی موت نصیب ہوئی تھی! ابھی آٹھ سال پہلے آریہ سماجیوں

کے اسی لیڈر نے جامع مسجد دہلی کے منبر پر کھڑے ہو کر ہندو مسلمان کے ”جے“ کے نلک شگاف نعروں سے اس کا خیر مقدم کیا تھا اور پورے مجمع نے ”ہندو مسلمان کی جے“ کے نلک شگاف نعروں سے اس کا خیر مقدم کیا تھا اور باہر سڑکوں پر ایک دوسرے کے دوش بدوش اپنا خون بہا کر اس نعرے پر مہر تو شیع لگا دی تھی۔ آج وہ خود اپنے ہم وطن کے ہاتھوں مارا گیا جو یقیناً ”یہ سمجھتا ہوگا کہ یہ ثواب کا کام ہے اور وہ اس کی بدولت جنت میں جائے گا۔“

میں ہمیشہ سے جسمانی دلیری کا معترف ہوں، اس دلیری کا جس کی بدولت انسان ایک اعلیٰ مقصد کے لئے مرتے دم تک جسمانی مصیبتیں برداشت کرتا ہے۔ میرے خیال میں اور لوگ بھی اس کی اتنی ہی قدر کرتے ہیں۔ سوامی شردھانند میں یہ دلیری انتہا کو پہنچ گئی تھی۔ ان کا لانا بقدر، گیسوے کپڑوں میں لپٹا ہوا شاندار جسم، بڑھاپے کے باوجود تن کر چلنا، آنکھوں سے شرارے ٹکنا، دوسروں کی کمزوری کو دیکھ کر تیوری پر بل آ جانا، یہ تصویر میری آنکھوں میں پھر رہی ہے۔ اور دل پر نقش ہے۔

مظلوموں کا جلسہ بروسیلز میں

میں ۱۹۲۶ء کے آخر میں برلن آیا ہوا تھا۔ وہاں معلوم ہوا کہ مظلوم قوموں کی ایک کانگریس، بروسیلز میں ہونے والی ہے۔ یہ بات میرے دل کو لگی اور میں نے ہندوستان لکھ بھیجا کہ اگر ہماری کانگریس بروسیلز کی کانگریس میں باضابطہ طور پر شرکت کرے تو اچھا ہے۔ میری تجویز پسند کی گئی اور میں اس کام کے لئے انڈین نیشنل کانگریس کا نمائندہ مقرر کر دیا گیا۔

بروسیلز کی کانگریس شروع فروری ۱۹۲۷ء میں ہوئی۔ معلوم نہیں کہ یہ خیال سب سے پہلے کسی کے ذہن میں آیا تھا۔ برلن میں ان دنوں دوسرے ملکوں کے جلاوطن اور انتہا پسند جمع ہو گئے تھے اور یہ شہر اس معاملے میں پیرس کی برابری کر رہا تھا۔ اشتہالی (کیونسٹ) بھی وہاں کثرت سے تھے۔ یہ خیال عام تھا کہ مظلوم قوموں میں آپس میں اتحاد عمل ہونا چاہیے اور انھیں مزدوروں کی انتہا پسند جماعت کے ساتھ مل کر کام کرنا چاہیے۔ یہ احساس روز بروز بڑھ رہا تھا کہ سب قوموں کا وہی ایک دشمن ہے جسے شہنشاہی کہتے ہیں اور سب کو جنگ آزادی میں اسی سے مقابلہ کرنا ہے۔ ظاہر ہے کہ وہ سلطنتیں جو نوآبادیوں پر قابض ہیں یعنی انگلستان، فرانس، اطالیہ وغیرہ اس قسم کی کوششوں کی مخالف تھیں مگر جرمنی جنگ عظیم کے بعد سے نوآبادیوں سے محروم ہو گیا تھا اور وہاں کی حکومت دوسری سلطنتوں کی نوآبادیوں اور ماتحت ملکوں کی تحریک آزادی کو رواداری بلکہ ہمدردی کی نظر سے دیکھتی تھی۔ یہ بھی ایک وجہ تھی کہ برلن دوسرے ملکوں کے ترقی پسندوں اور حکومت کے مخالفوں کا مرکز بن گیا تھا۔ ان میں سب سے نمایاں اور سرگرم چین کے لوگ تھے جو کومن ٹانگ کی انتہا پسند پارٹی سے تعلق رکھتے تھے۔ اس پارٹی کا چین میں بڑا زور تھا اور قدیم جاگیرداری نظام کے حامی اس کے سیلاب میں بہے جا رہے تھے۔ اس نئی قوت سے شہنشاہی پسند سلطنتیں بھی دہتی تھیں اور انھیں زیادتیاں کرنے اور دھمکیاں

دینے کی ہمت نہیں پڑتی تھی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ چین کے اتحاد اور آزادی کا مسئلہ کوئی دن میں حل ہوا چاہتا ہے۔ کومن ٹانگ کامیابی کے نشے میں مگن تھی مگر اسے معلوم تھا کہ ابھی اس کی راہ میں بہت سی حائل ہیں اس لئے وہ دوسری قوموں میں اپنے خیالات کا پرچار کر کے اپنی قوت بڑھانا چاہتی تھی۔ غالباً اس پرچار پر زور دینے والی اس جماعت کی انتہا پسند پارٹی تھی جو باہر کے اشتمالیوں کے ساتھ مل کر چینی قوم کا اثر دوسرے ملکوں میں اور اپنا اثر اپنے ملک اور اپنے جماعت میں بڑھانا چاہتی تھی ابھی یہ جماعت موجودہ زمانے کی طرح کئی فریقوں میں جو ایک دوسرے کے جانی دشمن ہیں تقسیم نہیں ہوئی تھی، اور بظاہر متحد نظر آتی تھی۔

اس لئے کومن ٹانگ کے نمائندوں نے جو یورپ میں موجود تھے مظلوم قوموں کی کانگریس کی تحریک کو ہاتھوں ہاتھ لیا بلکہ شاید انھیں نے کچھ اور لوگوں کے ساتھ مل کر یہ تحریک اٹھائی تھی۔ بعض اشخاص جو اشتمالی پارٹی کے تھے یا اس سے ملتے جلتے خیالات رکھتے تھے شروع سے اس تجویز کے موافق تھے کہ مجموعی طور پر اشتمالی اس میں نمایاں حیثیت نہیں رکھتے تھے۔ امریکا کی لاطینی سلطنتوں (میکسیکو وغیرہ) نے بھی عملی مدد دی کیونکہ وہ ان دنوں ریاستہائے متحدہ امریکا کی معاشی شہنشاہی سے تنگ آ گئی تھیں۔ میکسیکو جس کا صدر ایک انتہا پسند شخص تھا، ریاستہائے متحدہ امریکا کے خلاف لاطینی امریکی قوموں کو جتھہ بنانا چاہتا تھا اس لئے اس نے بریسلز کی کانفرنس سے بڑی دلچسپی کا اظہار کیا۔ باضابطہ طور پر حکومت اس میں شرکت نہیں کر سکتی تھی مگر اس نے اپنے ایک ممتاز ماہر سفارت کو بھیجا کہ وہ ایک ہمدرد تماشائی کی حیثیت سے کانگریس میں شریک ہو۔

اس کے علاوہ جاوا، چینی ہند، فلسطین، شام، مصر، عرب، شمالی افریقہ اور افریقی حبشیوں کی قومی انجمنوں کے نمائندے بھی آئے تھے۔ مزدور جماعتوں کی انتہا پسند پارٹیوں نے بھی اپنے آدمی بھیجے تھے اور کئی مشہور و معروف اشخاص جو سالہا

سال سے یورپ کے مزدوروں کی جدوجہد میں پیش پیش تھے، وہاں موجود تھے۔ بعض اشتہالی بھی کانگریس کی کاروائیوں میں اہم حصہ لے رہے تھے مگر وہ اشتہالیوں کے حیثیت سے نہیں بلکہ مزدوروں کی انجمنوں کے نمائندے بن کر آئے تھے۔

جارج لینسبری کانگریس کے صدر منتخب ہوئے اور انھوں نے بڑی زور شور کی تقریر کی۔ یہ بجائے خود اس بات کا ثبوت تھا کہ کانگریس کوئی سرپھروں کا مجمع یا اشتہالیوں کی جماعت کا دم چھلانہس ہے۔ مگر یہ ضرور ہے کہ جلسے کا برتاؤ اشتہالیوں کے ساتھ دوستانہ تھا اور بہت سے اختلافات کے باوجود بعض چیزوں میں ان کے ساتھ اتحاد کی گنجائش نظر آتی تھی۔

مسٹر لینسبری نے اس مستقل ادارے کا صدر ہونا بھی منظور کر لیا جو انجمن مخالف شہنشاہی کی نام سے قائم کیا گیا۔ مگر تھوڑے ہی دن بعد وہ اپنی اس ناعاقبت اندیشی پر پچھتائے یا شاید ان کے ساتھیوں یعنی برطانوی مزدور پارٹی والوں کے لیڈروں کو یہ بات پسند نہیں آئی۔ مزدور پارٹی ان دنوں پارلیمنٹ میں باضابطہ مخالف حکومت پارٹی تھی اور بہت جلد وزارت کے منصب پر فائز ہونے والی تھی۔ ظاہر کہ ان لوگوں کو جو آگے چل کر وزیر ہونے والے ہیں خطرناک انقلابی سیاست میں پھنسنا نہیں چاہیے۔ مسٹر لینسبری مصروفیت کا عذر کر کے انجمن کی صدرات سے الگ ہو گئے بلکہ انھوں نے اس کی ممبری سے بھی استعفا دے دیا۔ اس شخص کو جس کی تقریر نے دو تین مہینے پہلے میرے دل کو لہلہایا تھا، یکا یک رنگ بدلتے دیکھ کر مجھے بہت صدمہ ہوا۔

پھر بھی ”انجمن مخالف شہنشاہی“ کے بڑے بڑے سرپرست جن میں آئین اسٹائن، میڈمن سین یات سین اور شاندروے رولان بھی تھے۔ چند مہینے کے بعد آئین اسٹائن نے استعفا دے دیا اس لئے کہ وہ انجمن کی اس پالیسی کے مخالف تھے کہ وہ فلسطین کے عربوں اور یہودیوں کے جھگڑے میں عربوں کی حمایت کرتی

ہے۔

بروسلز کی کانگریس اور انجمن کی کمیٹیوں سے جو وقتاً فوقتاً مختلف مقامات پر ہوتی رہیں، مجھے نوآبادیوں اور ماتحت ملکوں کے بعض مسائل سمجھنے میں مدد ملی اور مغرب کے مزدوروں کے آپس کے جھگڑوں سے بھی پوری واقفیت ہو گئی۔ اخباروں اور کتابوں کے ذریعے مجھے ان کا تھوڑا سا حال پہلے سے معلوم تھا مگر یہ معلومات اوپری تھی اس لئے کہ لوگوں سے ذاتی تعلقات نہیں تھے۔ اب تعلقات پیدا ہو گئے اور کبھی کبھی ایسے مسئلوں سے سابقہ پڑنے لگا جن میں ان اندرونی جھگڑوں کی جھلک نظر آتی تھی۔ دوسری اور تیسری بین الاقوامی انجمنوں میں مجھے تیسری کے ساتھ ہمدردی تھی۔ دوسری انجمن کی ساری کاروائیاں جو اس پنجگ عظیم کے بعد کیں مجھے سخت مکروہ معلوم ہوتی تھیں۔ اور اسکی پشت پناہ، برطانوی مزدور پارٹی کی حرکتوں کا ہم ہندوستانیوں کو اچھی طرح تجربہ ہو چکا تھا۔ چنانچہ مجھے لازمی طور پر اشتمالیت سے انس پیدا ہو گیا، اس لئے کہ اس میں چاہے جتنی خرابیاں ہوں مگر کم سے کم وہ ریا کاری سے اور شہنشاہی کی حمایت سے بری ہے۔ میں اصولی طور پر اشتمالیت کا پیرو نہیں ہوا تھا۔ ابھی میں اس کی باریکیوں سے واقف نہیں تھا۔ صرف موٹی موٹی باتیں جانتا تھا اور یہ مجھے پسند آئیں۔ ان کے علاوہ روس میں جو زبردست تغیرات ہو رہے تھے انھوں نے بھی مجھے اس طرف متوجہ کیا۔ البتہ اشتمالیوں کی ان حرکتوں سے مجھے اکثر کوفت ہوتی تھی۔ وہ اپنی بات زبردستی منوانا چاہتے ہیں۔ لڑنے پر اور بدتمیزی کی حرکتوں پر تلے رہتے ہیں اور جوان کی رائے سے اختلاف کرے اس پر فوراً کفر و فتویٰ لگا دیتے ہیں۔ غالباً مجھے یہ احساس بقول ان لوگوں کے اپنی ”بورژوا“، تعلیم و تربیت کی وجہ سے ہوتا تھا۔

یہ عجیب بات تھی کہ انجمن مخالف شہنشاہی کے جلسوں میں چھوٹی چھوٹی باتوں کی بحث میں، میں عموماً انگریز اور امریکی ممبروں کی طرف ہوتا تھا۔ میری اور ان

کی رائے کم سے کم طریق کار کے معاملے میں بہت کچھ ملتی جلتی تھی۔ ہم سب لمبی چوڑی خطیبانہ تحریکوں کو جو روزولیشن نہیں بلکہ اعلان معلوم ہوتی تھیں۔ ناپسند کرتے تھے ہم چاہتے تھے کہ تحریک سیدھے سادھے سادے مختصر الفاظ میں پیش کی جائے مگر یورپ کی روایات اس کے خلاف تھیں۔ اکثر اشتہالی اور غیر اشتہالی ممبروں میں اختلاف رائے ہو جاتا تھا۔ ایسے موقعوں پر ہم کوئی سمجھوتا کر لیتے ہیں۔ تھوڑے دن کے بعد ہم میں سے بعض لوگ اپنے اپنے وطن چلے آئے اور کمیٹی کے اور جلسوں میں شرکت نہیں کر سکتے۔

بروسلز کی کانگریس سے شہنشاہی پسند سلطنتوں کی نوآبادیات اور امور خارجہ کے وزارتیں ذرا گھبرائیں۔ ”اینگر“ نے جو برطانوی وزارت خارجہ کا مشہور مصنف ہے اپنی ایک کتاب میں اس کا ذکر ہیجان خیز طریقے سے کیا ہے اور کہیں کہیں اس کی ہنسی بھی اڑائی ہے۔ غالباً خود کانگریس میں مختلف قوموں کے جاسوس موجود تھے یہاں تک کہ بعض نمائندے بھی خفیہ پولیس سے تعلق رکھتے تھے۔ اس کی ایک دلچسپ مثال یہ ہے۔ میرے ایک امریکی دوست پیرس گئے ہوئے تھے۔ ان س ایک فرنیسی ملنے آیا جو وہاں کی خفیہ پولیس میں ملازم تھا۔ یہ محض دوستانہ ملاقات تھی اور ان سے بعض معاملات کے متعلق کچھ پوچھنے کو آیا تھا۔ جب وہ یہ باتیں دریافت کر چکا تو اس نے پوچھا کہ آپ نے مجھے پہچانا میں آپ سے پہلے بھی مل چکا ہوں۔ امریکی اسے بہت غور سے دیکھتا رہا مگر بالکل نہ پہچان سکا۔ خفیہ پولیس والے نے کہا کہ آپ سے بروسلز کی کانگریس میں ملاقات ہوئی تھی جہاں میں حبشیوں کے نمائندے کی حیثیت سے چہرے اور ہاتھوں وغیرہ پر سیاہ روغن مل کر گیا تھا۔

انجمن مخالف شہنشاہی کا ایک اجلاس کولون میں ہوا جس میں میں بھی شریک تھا، اس کے ختم ہونے کے بعد ہم سیکو اور ونیزی کی حمایت کے ایک جلسے میں شریک ہونے کے لئے ڈوسل ڈورف گئے جو کولون سے بہت قریب ہے۔ ہم اس جلسے

سے واپس آرہے تھے کہ رستے میں پولیس نے ٹوکا اور کہا کہ اپنے پاسپورٹ دکھاؤ
اکثر لوگوں کے پاس پاسپورٹ موجود تھے مگر میں اپنا پاسپورٹ کولون کے ہوٹل میں
چھوڑ آیا تھا اس لئے کہ ڈوسل ڈورف صرف چند ہی گھنٹے قیام کا قصد تھا۔ میں
حراست میں پولیس اسٹیشن پہنچا دیا گیا۔ خوش قسمتی سے اس مصیبت میں ایک انگریز
اور اس کی بیوی بھی میرے ساتھ تھے ہمیں کوئی ایک گھنٹہ وہاں ٹھہرنا پڑا۔ اس اثنا میں
غالباً ٹیلیفون سے پوچھ گچھ کی گئی جس کے بعد پولیس کے افسر نے ہمیں ازراہ
عنایت جانے کی اجازت دی۔

آگے چل کر انجمن مخالف شہنہا بی کا رجحان اشتہائیت کی طرف اور بڑ گیا مگر
جہان تک مجھے معلوم ہے اس نے اپنا علیحدہ رنگ قائم رکھا۔ میرا تعلق اس سے
صرف خط و کتابت کے ذریعے باقی تھی۔ ۱۹۳۱ء میں اس عارضی صلح میں شرکت کی
وجہ سے جو حکومت ہند اور کانگریس کے درمیان ہوئی تھی یہ انجمن مجھ سے بہت خفا ہو گئی
اور اس نے مجھے ایک دم سے ذات باہر کر دیا یعنی ایک روز ولیوشن کے ذریعے میرا
نام انٹیمبروں کی فہرست سے خارج کر دیا۔ میں یہ مانتا ہوں کہ اس کے لئے
اشتعال کی بہت بڑی وجہ تھی مگر اس نے مجھے صفائی کا موقع تو دیا ہوتا۔

۱۹۲۷ء کی گرمیوں میں میرے والد یورپ تشریف لائے۔ میں ان سے وینس
میں مل اور اس کے بعد کئی مہینے تک میرا ان کا اکثر ساتھ رہا ہم سب یعنی والد،
بیوی، بہن اور میں مل کر چند روز کے لئے ماسکونوہر میں گئے تاکہ سوویٹ کی دسویں
سالگرہ کے جشن میں شریک ہوں۔ یہ سفر بہت تھوڑے دن کا تھا اور بہت تنگ وقت
میں طے ہوا تھا مگر ہم سب کو وہاں جا کر خوشی ہوئی اس لئے کہ یہ ذرا سی جھلک بھی
فائدے سے خالی نہیں تھی۔ ظاہر ہے کہ اتنے سے وقت میں ہمیں جدید روس کے
متعلق کچھ زیادہ معلومات حاصل نہیں ہو سکیں مگر اتنا ضرور ہوا کہ ہم اسکے متعلق جو
کچھ پڑھتے تھے اسے سمجھنے لگے۔ میرے والد کے لئے یہ اجتماعی اصول بالکل

انوکھے تھے۔ ان کی ساری ذہنی تربیت قانون اور آئین کی فضا میں ہوئی تھی اور ان کے لئے اس فضا سے نکلنا سہل نہ تھا مگر انھوں نے جو کچھ ماسکو میں دیکھا اس کا ان پر یقیناً اثر ہوا۔

ہم ماسکو میں تھے کہ سائمن کمیشن کے تقرر کا پہلی بار اعلان کیا گیا۔ ہم نے یہ خبر ماسکو کے ایک جریدے میں پڑھی۔ چند روز کے بعد والد پر یوی کونسل کے ایک مقدمے میں پیروی کر رہے تھے اور سر جان سائمن ان کے رفیق تھے۔ یہ ایک پرانا زمینداری کا مقدمہ تھا جس میں ابتدائی منزلوں میں میں خود بھی پیروی کر چکا تھا۔ مجھے اب اس سے کوئی دلچسپی نہیں تھی مگر سر جان سائمن کی فرمائش سے میں بھی ایک بار ان کے دفتر میں والد کے ساتھ گیا اور مشورے میں شریک ہوا۔

۱۹۲۷ء خاتمے پر تھا اور ہمارا یورپ کا قیام بہت طول کھینچ چکا تھا غالباً اگر والد یورپ نہ آئے ہوتے تو ہم پہلے ہی یہاں سے روانہ ہو جاتے۔ ہمارا مقصد تھا کہ واپسی میں کچھ دن جنوب مشرقی یورپ، ترکی اور مصر میں رہیں مگر اب اس کا وقت نہیں رہا تھا۔ اس لئے کہ میری بڑی خواہش تھی کہ کانگریس کے اجلاس میں جو کمرس کے زمانے میں مدراس میں ہونے والا تھا، شرکت کروں۔ شروع دسمبر میں اپنی بیوی، بہن اور بیٹی کے ساتھ مارسیلز کو لبوروانہ ہو گیا۔ میرے والد نے یورپ میں تین مہینے اور قیام کیا۔

ہندوستان کی واپسی اور سیاست کی منجھدھار میں دوبارہ کودنا

میں یورپ سے جسمانی اور دماغی حیثیت سے تازہ دم ہو کر لوٹا تھا۔ میری بیوی کو پوری صحت تو نہیں ہوئی تھی مگر پہلے سے بہت اچھی تھیں اس لئے میں ان کی طرف سے بھی مطمئن تھا۔ میری رگوں میں زندگی کا خون دوڑ رہا تھا اور اندرونی کش مکش اور ناکامی کا احساس جو پہلے رہا کرتا تھا اس وقت بالکل نہیں تھا۔ میری نظر اب زیادہ وسیع ہو چکی تھی اور محض قومیت کا عقیدہ محدود اور ناکافی معلوم ہوتا تھا۔ میرا خیال تھا کہ سیاسی آزادی بے شک بہت ضروری چیز ہے مگر یہ راہ راست کا صرف پہلا ہی قدم ہے۔ بغیر سماجی آزادی اور حکومت اور معاشرت کی تنظیم کے فرد کچھ زیادہ ترقی نہیں کر سکتا۔ مجھے محسوس ہو رہا تھا کہ میں اب عالمگیر مسائل اور معاملات کو پہلے سے بہتر سمجھتا ہوں اور اس زمانے کی دنیا کو جونت نئے رنگ بدلتی ہے نظر جما کر دیکھ سکتا ہوں۔ میں نے اس عرصے میں نہ صرف موجودہ سیاسی معاملات بلکہ ان سب علمی اور تمدنی مسائل کے متعلق بھی جن سے مجھے دلچسپی تھی بہت سے کتابیں پڑھ ڈالی تھیں۔ مجھے ان عظیم الشان، سیاسی، معاشی اور تمدنی تغیرات کے مطالعے میں بہت لطف آتا تھا جو یورپ اور امریکا میں واقع ہو رہے تھے۔ سوویت روس بعض ناگوار پہلوؤں کے باوجود پسند تھا اور ایسا معلوم ہوتا تھا کہ وہ دنائے کے لئے امید کا پیام لایا ہے۔ یورپ اس زمانے میں ایک حد تک امن و امان سے بسر کرنے کی کوشش کر رہا تھا اور وہ زبردست کساد بازاری جو آج کل چھائی ہوئی ہے اس وقت تک رونما نہیں ہوئی تھی مگر میں یہ خیال دل میں لے آیا تھا کہ یہ امن و سکون محض عارضی ہے اور بہت جلد یورپ میں بلکہ ساری دنیا میں زبردست تغیرات اور حادثات ہونے والے ہیں۔

میں سمجھتا تھا کہ اس وقت سب سے ضروری کام یہ ہے کہ ہم اپنے ملک کو ان عالمگیر واقعات کی خبر دیں اور جہاں تک ممکن ہو ان کے لئے تیار رہیں۔ یہ تیاری

زیادہ تر ذہنی حیثیت سے ہونی چاہئے۔ سب سے پہلے تو اس میں کسی طرح کا شبہ نہیں رہنا چاہئے کہ ہماری منزل مقصود کامل سیاسی آزادی ہے، یہ قطعی طور پر طے ہو جائے کہ کامل آزادی ہمارا واحد مقصد ہے، اور اس میں اور ’’درجنو آبادیات‘‘ کے مبہم اور الجھے ہوئے فقرے میں زمین آسمان کا فرق ہے۔ اسی کے ساتھ سماجی مقصد کا تعین ہونا بھی ضروری تھا۔ میرا خیال تھا کہ ابھی کانگریس سے اس معاملے میں زیادہ دور تک قدم بڑھنے کی توقع نہیں رکھنی چاہیئے کانگریس ایک خالص سیاسی قومی جماعت ہے اور قومیت کے خیال کے سوا کسی اور طرز خیال سے آشنا نہیں ہے۔ بس اتنا ہی ہو سکتا ہے کہ اس بحث کی ابتدا کر دی جائے۔ ہاں کانگریس کے باہر مزدوروں کے حلقوں میں اور نوجوانوں میں البتہ یہ چیز آگے بڑھائی جاسکتی ہے۔ اسی لئے میں چاہتا تھا کہ کانگریس میں عہدہ قبول نہ کروں اور ایک دھندلا سا خیال یہ بھی تھا کہ چند مہینے شہروں سیدور دیہات میں جا کر رہوں اور وہاں کے حالات کا مطالعہ کروں مگر یہ ان ہونی بات تھی اور واقعات کی کشش مجھے پھر کانگریسی سیاست کی منجھد ہار میں کھینچ کر لانے والی تھی۔

مدارس پہنچتے ہی میں اس بھنور میں پڑ گیا میں نے ورکنگ کمیٹی میں کئی تحریکیں پیش کیں، جن میں کامل آزادی، خطرہ جنگ، انجمن مخالف شہنشاہی سے اتحاد عمل کے روزلیوشن بھیتھے۔ یہ سب ریزولوشن منظور ہو گئے اور ورکنگ کمیٹی کی باضابطہ تحریکوں میں شامل کر لئے گئے۔ میں نے انھیں کانگریس کے کھلے اجلاس میں پیش کیا اور مجھے بڑا تعجب ہوا کہ سب کے سب یہ اتفاق رائے پاس ہو گئے۔ کامل آزادی کی روزولوشن کی تائید مسز بینٹ تک نے کر ڈالی۔ ہر طرف سے مدد ملنا بڑی خوشی کی بات تھی۔ مگر میرے دل میں یہ کھٹکا تھا کہ کیا تو لوگوں نے ان روزلیوشنوں کو اچھی طرح سمجھا نہیں یا انھیں توڑ مروڑ کر کچھ اور معنی پہنا لئے۔ کانگریس کے اجلاس کے تھوڑے ہی دن بعد یہ حقیقت کھل گئی اور کامل آزادی کے

روزلیوشن کی تاویلیوں کی جانے لگیں۔

میری یہ تحریکیں کانگریس کی معمولی تحریکوں سے مختلف تھیں۔ ان سے ایک نئے طرز خیال کا اظہار ہوتا تھا۔ بہت سے کانگریسی انھیں یقیناً پسند کرتے تھے۔ بعض کچھ مخالف بھی تھے مگر اس حد تک نہیں کہی مخالفت کا اظہار کریں غالباً ان حضرات کا خیال تھا کہ یہ محض نظری تحریکیں ہیں جن سے نہ کوئی فائدہ ہے نہ نقصان اور ان سے پیچھا چھڑانے کی سب سے اچھی ترکیب یہی ہے کہ انھیں پاس کر کے آگے بڑھیں اور ان معاملات پر غور کریں جو واقعی اہمیت رکھتی ہیں۔ غرض کامل آزادی کا روزلیوشن اس وقت تک محض ایک نام جذبے کا اظہار تھا جو روز بروز بڑھ رہا تھا۔ البتہ دو ایک سال بعد اس نے کانگریس کے ہم اور پر زور مطالبے کی حیثیت اختیار کر لی۔

گاندھی جی مدارس میں موجود تھے اور کانگریس کے کھلے اجلاس میں شریک ہوئے مگر انھوں نے پالیسی کی تشکیل میں حصہ نہیں لیا۔ ورکنگ کمیٹی کے ممبر ہونے کے باوجود وہ اس کے جلسوں میں نہیں آئے۔ جب سے سوراج پارٹی کا زور ہوا انھوں نے کانگریس میں یہی طریقہ اختیار کر رکھا تھا مگر ان سے اکثر مشورہ لیا جاتا تھا اور کوئی اہم کاروائی بغیر ان سے کہہ ہوئے نہیں کی جاتی تھی۔ مجھے معلوم نہیں کہ جو تحریکیں میں نے کانگریس میں پیش کیں وہ انھیں کہاں تک پسند آئیں۔ میرا خیال ہے کہ انھوں نے ان کو ناپسند کیا ہوگا۔ ان کے مضمون کی وجہ سے نہیں بلکہ اس طرز خیال کی وجہ سے جو ان سے ظاہر ہوتا تھا۔ مگر انھوں نے کبھی کسی قسم کا اعتراض نہیں کیا۔ میرے والد تو جیسا کہ میں پہلے کہہ چکا ہوں یورپ گئے ہوئے تھے۔

کامل آزادی کے روزلیوشن کا بے اثر ہونا کانگریس کے اسی اجلاس میں ظاہر ہو گیا جب کہ ایک اور ریزولوشن کے ذریعے سائمن کمیشن کی مخالفت اور بائیکاٹ کا اعلان اور اسی کے ساتھ یہ تجویز کی گئی کہ ایک آل پارٹیز کانفرنس منعقد کی جائے جو

ہندوستان کے لئے ایک دستور اساسی مرتب کرے۔

یہ ظاہر تھا کہ اعتدال پسند جماعت جس سے تعاون کرنے کی کوشش کی جا رہی تھی، کامل آزادی کا تصور ہی نہ کر سکتی تھی۔ ان کی پہنچ زیادہ سے زیادہ درجہ نو آبادیات تک تھی۔

میں دوبارہ کانگریس کا سکرٹری بن گیا۔ میں کچھ تو شخصی اثر تھا یعنی میرے پرانے اور عزیز دوست ڈاکٹر انصاری، صدر کانگریس کا اصرار، اور کچھ یہ خیال تھا کہ میرے پیش کئے ہوئے متعدد رزولوشن منظور ہو گئے ہیں اس لئے مجھے خود ہی انھیں عمل میں لانے کی کوشش کرنی چاہئے۔ یہ سچ ہے کہ آل پارٹیز کانفرنس کے رزولوشن نے میری تحریکوں کے اثر کو کسی حد تک زائل کر دیا تھا مگر پھر بھی بہت کچھ باقی تھا۔ لیکن میرے عہدہ قبول کرنے کی اصل وجہ یہ تھی کہ مجھے ڈر تھا کہ کہیں کانگریس آل پارٹیز کے ذریعے یا کسی اور اثر سے اعتدال اور سمجھوتے کی پالیسی نہ اختیار کر لے ان دنوں وہ کچھ ڈمگمار ہی تھی۔ کبھی اس سرے پر جھک جاتی تھی کبھی اس سرے پر۔ میں چاہتا تھا کہ جہاں تک مجھ سے ہو سکے اسے اعتدال پسندی کی طرف نہ لوٹنے دوں اور کامل آزادی کے مقصد کو برقرار رکھوں۔

نیشنل کانگریس کے سالانہ اجلاس کے ساتھ ہمیشہ کچھ ضمنی جلسے ہوا کرتے ہیں چنانچہ مدراس میں ان دنوں جمہوریت پسندوں کی کانفرنس کا پہلا اور آخری اجلاس ہوا اور مجھ سے اس کی صدارت کی فرمائش کی گئی۔ میں بھی اپنے آپ کو جمہوریت پسند سمجھتا تھا اور مجھے یہ تجویز پسند آئی۔ مگر صدارت قبول کرنے میں مجھے تامل تھا اس لئے کہ یہ نہیں معلوم تھا، اس نئی تحریک کے چلانے والے کون ہیں اور میں یہ نہیں چاہتا تھا کہ میرا تعلق کسی ایسی چیز سے ہو جو برساتی مینڈک کی طرف چند روز میں ختم ہو جائے۔ میں نے صدارت تو کر لی مگر بعد میں پچھتانا پڑا۔ اس لئے اور بہت سے انجمنوں کی طرح یہ کانفرنس بھی پیدا ہوتے ہی مر گئی۔ کئی مہینے تک میں

کوشش کرتا رہا کہ اس میں جو رولیشن پاس ہوئے تھے ان کا پورا مضمون معلوم ہو جائے مگر کامیابی نہیں ہوئی۔ ہم لوگوں میں کچھ عجیب بات ہے کہ نئے نئے کام شروع کرتے ہیں اور پھر انہیں چھوڑ چھاڑ الگ ہو جاتے ہیں۔ ہم پر جو بے استقلالی کا اعتراض کیا جاتا ہے اس میں بہت کچھ اصلیت ہے۔

ابھی کانگریس کا اجلاس ختم نہیں ہوا تھا کہ دہلی سے حکیم اجمل خان صاحب کے انتقال کی خبر آئی۔ وہ کانگریس کے سابق صدر تھے اور اس کے بوڑھے مدبروں میں شمار کئے جاتے تھے مگر ان میں ایک اور بات بھی تھی جس کی وجہ سے وہ کانگریس کے تمام لیڈروں میں خاص امتیاز رکھتے تھے۔ انہوں نے بالک قدیم طرز کی تعلیم و تربیت پائی تھی جس میں جدید رنگ کو ذرا بھی دخل نہ تھا اور وہ سر سے پیر تک دلی کی شاہی زمانے کی تہذیب میں ڈوبے ہوئے تھے۔ ان کے شستہ اور پاکیزہ اخلاق کو دیکھے، انہیں ٹھہر ٹھہر کر دھمی آواز سے گفتگو کرتے ہوئے اور سوکھے منہ سے مذاق کے جملے کہتے ہوئے سن کر دل خوش ہو جاتا تھا۔ وہ اپنے اخلاق و آداب کے لحاظ سے پرانے طرز کے رئیس تھے۔ ان کی وضع قطع اور طرز و روش میں شاہانہ وقار کی شان تھی اور ان کا چہرہ بھی مغل نادشاہوں کی تصویر سے بہت مشابہ تھا، ایسے لوگ عموماً سیاست سے سروکار نہ تھا۔ وہ حکیموں کے ایک مشہور خاندان کے سردار تھے اور انہیں اپنے عظیم الشان مطب سے فرصت نہیں ملتی تھی مگر آخر عمر میں جنگ عظیم کے حادثات نے اور ان کے پرانے دوست اور رفیق کارڈاکٹر مختار احمد انصاری کے اثر نے انہیں کانگریس کی طرف مائل کر دیا۔ اس کے بعد کے واقعات خصوصاً پنجاب کے مارشل لا اور تحریک خلافت نے ان کے دل پر بہت گہرا اثر ڈالا اور انہیں گاندھی جی کا نیا طریق کار یعنی ترک موالات پسند آگیا۔ انہوں نے اپنی قابل قدر صفات اور نایاب جوہر سے کانگریس کو مالا مال کر دیا اور ان کی ذات پر انی اور نئی روشنی کے لوگوں کے درمیان رابطے کا کام دینے لگی۔ انکے اثر سے قدیم رنگ کے بزرگ

میں قومی تحریک کے حامی بن گئے اور ان کی بدولت قدیم اور جدید عناصر گھل مل گئے اور قومیت کے ہر اولوں میں ضبط اور متانت کی شان پیدا ہو گئی۔ انھوں نے ہندوؤں اور مسلمانوں کو ایک دوسرے سے قریب تر کر دیا۔ کیونکہ دونوں ان کی عزت کرتے تھے اور ان کی مثال سے متاثر تھے۔ گاندھی جی انھیں اپنا سچا دوست جانتے تھے، ان پر دل سے اعتماد کرتے تھے اور ہندو مسلمانوں کے تعلقات کے بارے میں ان کی رائے کو قول فیصل سمجھتے تھے۔ میرے والد اور حکیم صاحب کو ایک دوسرے سے فطری طور پر انس تھا۔

پچھلے سال ہندو مہاسبھا کے بعض لیڈروں نے مجھ پر یہ الزام لگایا تھا کہ میں ہندوؤں کے جذبات سے ناواقف ہوں اس لئے کہ میری تعلیم بہت ناقص ہے اور ”فارسی“ تہذیب کے رنگ میں ڈوبی ہوئی ہے۔ میرے لئے یہ کہنا مشکل ہے کہ مجھ میں کوئی تہذیب بھی ہے یا نہیں اور اگر ہے تو کونسی تہذیب ہے۔ فارسی زبان سے تو بد قسمتی سے میں بالکل ناواقف ہوں۔ ہاں یہ سچ ہے کہ میرے والد نے ہندی ایرانی تہذیب کی فضا میں پرورش پائی تھی جو دلی کے قدیم دربار کی یادگار ہے۔ اور جس کے مرکز اس گئے گزرے زمانے میں بھی دلی اور لکھنؤ سمجھے جاتے ہیں۔ کشمیری برہمنوں کو زمانے کا رنگ اختیار کرنے میں خاص ملکہ ہے۔ جب وہ ہندوستان کے میدانوں میں آئے اور انھوں نے دیکھا کہ یہاں ہندی ایرانی تہذیب کا دور دورہ ہے تو وہ اسی طرف ڈھل گئے اور ان میں کثرت سے فارسی اور اردو کے اچھے اچھے ادیب پیدا ہوئے۔ آگے چل کر جب انگریزی سیکھنے اور مغربی تہذیب کی ابتدائی چیزیں اختیار کرنے کی ضرورت ہوئی تو وہ اتنی ہی تیزی سے اس نئے سانچے میں ڈھل گئے اور ان میں کثرت سے فارسی اور اردو کے اچھے اچھے ادیب پیدا ہوئے۔ آگے چل کر جب انگریزی سیکھنے اور مغربی تہذیب کی ابتدائی چیزیں اختیار کرنے کی ضرورت ہوئی تو وہ اتنی ہی تیزی سے اس نئے سانچے میں

ڈھل گئے۔ مگر اب بھی ہندوستان کے کشمیریوں میں بڑے بڑے فارسی داں موجود ہیں۔ مثال کے طور پر میں سر تیج بہادر سپرو اور راجہ نریندر ناتھ کا نام پیش کرتا ہوں۔

غرض حکیم صاحب اور مرے والے میں بہت سی باتیں مشترک تھیں۔ بلکہ انھوں نے براداری کے پرانے رشتے بھی ڈھونڈ نکالے تھے۔ ان میں بڑی دوستی ہو گئی اور ایک دوسرے کو بھائی صاحب کہنے لگے۔ منجملہ اور بہت سے رابطوں کے دونوں میں ایک چھوٹا سا رابطہ سیاسی خیالات کا بھی تھا۔ حکیم صاحب کی خانگی زندگی بالکل قدیم طرز کی تھی۔ وہ خود یا ان کے خاندان والے پرانے ڈھرے کو نہیں چھوڑ سکتے تھے۔ جتنا سخت پردہ ان کے یہاں تھا میں نے کسی کے یہاں نہیں دیکھا حالانکہ حکیم صاحب کو دل سے یقین تھا کہ عورتوں کی آزادی کے بغیر کوئی قوم ترقی نہیں کر سکتی۔ ایک بار انھوں نے مجھ سے اس مسئلے پر گفتگو کی اور فرمایا کہ ترکی عورتوں نے آزادی کی جنگ میں جو کام کیا اس کی میں دل سے قدر کرتا ہوں۔ مصطفیٰ کمال پاشا کو جو کامیابی ہوئی وہ زیادہ تر ترکی عورتوں ہی کی بدولت ہوئی۔

حکیم صاحب کے انتقال سے کانگریس کو بہت سخت صدمہ پہنچا اور اس کا ایک بڑا زبردست حامی اٹھ گیا۔ اس کے بعد سے ہم سب جب دلی جاتے ہیں تو یہ محسوس ہوتا ہے کہ اس شہر میں وہ بات نہیں رہی۔ اس لئے کہ دلی کے نام کے ساتھ ہمارے ذہن میں حکیم صاحب اور ان کے بلی ماروں والے مکان کی تصویر بسی ہوئی ہے۔

۱۹۲۸ء سیاسی اعتبار سے بڑی مصروفیت کا سال تھا اور سارے ملک میں ایک ہل چل سی تھی۔ معلوم ہوتا تھا کہ لوگوں کے دل میں ایک نئی امنگ ہے جو انھیں آگے بڑھانے لئے جاتی ہے۔ ایک نئی لہر ہے جو ایک سرے سے تمام مختلف جماعتوں میں دوڑی ہوئی ہے۔ غالباً اس طویل مدت میں جب میں باہر گیا ہوا تھا۔ یہ تبدیلی آہستہ آہستہ ہو رہی تھی۔ میں نے واپس آ کر دیکھا تو مجھے بہت بڑا

فرق معلوم ہوا۔ ۱۹۲۶ء کے شروع تک ہندوستان میں سناٹا چھایا ہوا تھا۔ غالباً ملک اس کشمکش سے جو ۱۹۱۹ء سے ۱۹۲۲ء تک رہی اچھی طرح سنبھلنے نہیں پایا تھا۔ ۱۹۲۸ء میں وہ تازہ دم، مستعد اور دبے جوش سے بھرا ہوا معلوم ہوتا تھا۔ ہر جگہ اس کے آثار نظر آتے تھے: مزدوروں میں، کاشتکاروں میں، اوسط طبقے کے نوجوانوں میں اور عموماً تمام تعلیم یافتہ لوگوں میں۔

ٹریڈ یونین کی تحریک بہت ترقی کی گئی تھی اور آل انڈیا ٹریڈ یونین کانگریس کو جسے قائم ہوئے صرف ساٹھ آٹھ سال ہوئے تھے، اتنے ہی دن میں بہت قوت حاصل ہو گئی تھی اور وہ ہر قسم کے مزدوروں کی نمائندگی کرنے والی جماعت بن گئی تھی۔ ممبروں کی تعداد یا تنظیم کے لحاظ سے تو اس نے کچھ زیادہ ترقی نہیں کی تھی مگر اس کے خیالات میں انتہا پسندی اور جنگجوی آگئی تھی۔ ہڑتالیں اکثر ہوتی تھیں اور مزدوروں میں اپنے طبقے کا احساس بڑھتا جاتا تھا۔ سب سے اچھی تنظیم کپڑے کی صنعت اور ریلوے کے مزدوروں کی تھی۔ ان میں سب سے قوی اور ترقی یافتہ انجمنیں بمبئی کی گرنی کامگار یونین اور جی آئی پی ریلوے یونین تھیں۔ مزدوروں کی تنظیم کی نشوونما سکے ساتھ مغرب سے اندرونی جھگڑوں اور آپس کی تفریق کا بیج یہاں بھی پہنچ گیا تھا۔ ابھی ہندوستان کی ٹریڈ یونین کی تحریک اچھی طرح قدم بھی نہیں جمانے پائی تھی کہ یہ اندیشہ پیدا ہو گیا کہ وہ ٹوٹ کر الگ الگ جتھوں میں تقسیم ہو جائے گی۔ بعض لوگ دوسری بین الاقوامی انجمن کے پیرو تھے، بعض تیسری کے، بعض اصلاح اور اعتدال کو پسند کرتے تھے اور بعض کھلم کھلا انقلاب کے حامی تھے اور ایک سرے سے رہ چیز کو بدلنا چاہتے تھے۔ ان کے بین بین خیالات کے بہت سے درجے تھے اور بد قسمتی سے جیسا کہ عام تحریکوں میں ہوا کرتا ہے بہت سے ابن الوقت بھی موجود ہیں۔

کسانوں میں بھی حرکت نظر آتی تھی اور صوبجات متحدہ خصوصاً اودھ میں زیادہ

نمایاں تھی۔ یہاں جا بجا کسانوں کے احتجاج کے جلسے آئے دن ہوا کرتے تھے۔ لوگوں کو یہ محسوس ہو گیا تھا کہ نئے قانون لگان سے، جس میں کسانوں کو جین حیاتی لگان داری کا حق دیا گیا تھا اور ان سے بہت کچھ وعدے کئے گئے تھے، ان کی حالت زار میں کوئی فرق نہیں ہوا۔ کجرات میں جہاں رعیت داری طریقہ جاری ہے اور حکومت کو براہ راست کاشتکاروں سے سابقہ پڑتا ہے، مال گذاری بڑھانے کی وجہ سے حکومت اور کسانوں میں بہت بڑے پیمانے پر لڑائی چھڑی ہوئی تھی یہ بردولی کی ستیا گرہ کی تحریک تھی جو سردار ولہ بھائی ٹیل کی سرکردگی میں اٹھائی گئی تھی۔ جس آن بان سے یہ تحریک چلائی گئی اس کی تعریفوں سے سارا ملک گونج رہا تھا۔ بردولی کے کسانوں کو بڑی حد تک کامیابی ہوئی مگر ان کی اصلی کامیابی یہ تھی کہ ان کے اس معرکے کا اثر سارے ہندوستان کے کسانوں پر پڑا۔ بردولی کان ہندوستانی کے لئے امید اور تقویت کا نشان اور فتح کو شگون بن گیا۔

۱۹۲۸ء کی ایک اور نمایاں خصوصیت یہ تھی کہ اس سال نو جوانوں کی تحریک نے نشوونما پائی۔ ہر جگہ نو جوان سبائیں قائم کی جا رہی تھیں اور نو جوانوں کی کانفرنسیں ہو رہی تھیں۔ یہ جماعتیں مختلف قسم کی تھیں اور ان میں نیم مذہبی انجمنوں سے لے کر اشتراکی انجمنیں تک شامل تھیں جن میں انقلابی خیالات اور طریقوں پر بحث کی جاتی تھی۔ مگر ان انجمنوں کے اغراض و مقصد چاہے جو کچھ بھی ہوں جب نو جوان ان میں جمع ہوتے تھے تو خود بخود زمانے کے اہم سماجی اور معاشی مسائل کی گفتگو چھڑ جاتی تھی جس کا رجحان عموماً یہی ہوتا تھا کہ سارا نظام ایک سرے سے بدل دیا جائے۔ خالص سیاسی نقطہ نظر سے اس سال کی اہمیت سائمن کمیشن کے بائیکاٹ اور آل پارٹیز کانفرنس کے وجہ سے تھی جسے لوگ بائیکاٹ کا تعمیری پہلو کہتے تھے۔ اس میں حیرت انگیز کامیابی ہوئی۔ جہاں کہیں کمیشن جاتا تھا مخالفوں کا مجمع ”سائمن“ گو بیگ“ کے نعرے لگاتا تھا۔ اس طرح ہندوستان کے کروڑوں باشندے سر جان

سائنس کے نام سے اور انگریزی زبان کے دو الفاظ سے جن کے سوا وہ کوئی لفظ نہیں جانتے ہیں واقف ہو گئے۔ کمیشن کے ممبروں کہ یہ الفاظ بھوت بن کر سنا تے تھے، لوگ کہتے ہیں کہ ایک باریہ لوگ نئی دہلی کے ویسٹرن ہوٹل میں ٹھہرے ہوئے تھے کہ رات کے اندھیریے میں یہ آواز گونجتی ہوئی سنائی دی۔ انھیں بہت برا معلوم ہوا کہ لوگ رات کو بھی چین نہیں لینے دیتے۔ مگر اصل میں یہ آواز جس نے ان کے آرام میں خلل ڈالا گیدڑوں کی آواز تھی جن سے شہنشاہی دارالسلطنت کے لقا و قدق میدان بھرے رہتے تھے۔

آل پارٹیز کانفرنس کو دستور اساسی کے اہم اصول طے کرنے میں کوئی وقت نہیں ہوئی۔ ایک عمومی پارلیمنٹری حکومت کا نظام بنانا تھا جو ہر شخص بنا سکتا تھا مشکل اصل میں ایک ہی تھی۔ یعنی فرقہ وارانہ مسئلہ یا اقلیتوں کا مسئلہ اور چونکہ کانفرنس میں تمام کٹر فرقہ پرست انجمنوں کے نمائندے موجود تھے اس لئے اس مسئلے کا حل کرنا اور بھی مشکل ہو گیا۔ یہ وہی پرانا قصہ تھا جو نام اتحاد کانفرنسوں میں پیش آچکا تھا۔ میرے والد نے جو موسم بہار میں انگلستان سے واپس آگئے تھے اس کانفرنس میں بہت بڑا حصہ لیا۔ جب اور کوئی تدبیر نہ چلی تو آخر میں ایک چھوٹی سے کمیٹی والد کی صدارت میں بنادی گئی کہ دستور اساسی مرتب کرے اور فرقہ وارانہ مسئلے کے متعلق مفصل رپورٹ پیش کرے۔ اس کمیٹی کو لوگ نہر و کمیٹی کہنے لگے اور وہ رپورٹ جو اس نے آگے چل کر پیش کی نہر و رپورٹ نام سے مشہور ہوئی۔ سر تاج بہادر سپرو بھی اس کمیٹی کی رکن تھے اور رپورٹ کا ایک حصہ انھوں نے لکھا تھا۔

میں اس کمیٹی کا ممبر نہیں تھا مگر کانگریس کے سکریٹری کی حیثیت سے مجھے اس سے بہت کچھ تعلق تھا۔ میرے لئے بڑی مشکل تھی اس لئے کہ میرے نزدیک اصل مسئلہ قوت حاصل کرنے کا تھا اور دستور اساسی کے مفصل مسودوں سے کاغذ کے صفحے سیاہ کرنا محض بیکار تھا۔ دوسری مشکل یہ تھی کہ پیچ میل کمیٹی ہمارے مقصد کو محدود کرنے

پرتلی ہوئی تھی، اس نے جو مقصد قرار دیا تھا وہ ”نوا بادیات کا درجہ“ کہلاتا تھا مگر اصل میں اس سے بھی کم تھا۔ میرے خیال میں کمیٹی کی حقیقی اہمیت یہ تھی کہ اس کے ذریعے سے فرقہ وارانہ گتھی کے سلجھنے کا امکان تھا۔ مجھے یہ توقع نہیں تھی کہ یہ مسئلہ کسی معاہدے یا سمجھوتے کے ذریعے قطعی طور پر حل ہو جائے گا کیونکہ قطعی حل کی صورت تو اسکے سوا کچھ نہیں کہ لوگوں کی توجہ سماجی اور معاشی مسئلوں کی طرف پھیر دی جائے مگر اس کا امکان تھا کہ کوئی عارضی معاہدہ ہی ہو جائے اور اسے لوگوں کی ایک معقول تعداد مان لے تو کسی قدر سکون کی حالت ہو جائے گی اور لوگوں کی توجہ دوسرے مسئلوں کی طرف ہو سکے گی۔ اس لئے میں نے کمیٹی کے کام میں رکاوٹ نہیں ڈالی بلکہ جہاں تک ہو سکا، اس کی مدد کی۔

معلوم ہوتا تھا کہ اس کوشش میں کامیابی ہوا ہی چہاں ہی ہے۔ صرف دو تین باتیں طے ہونے کو باقی تھیں اور ان میں واقعی اہمیت صرف پنجاب کا مسئلہ رکھتا تھا جہاں ہندو، مسلمان، سکھ کی سہ رخی لڑائی ہو رہی تھی۔ کمیٹی نے اپنی رپورٹ میں پنجاب کے مسئلے پر ایک نئے پہلو سے نظر ڈالی اور اپنی سفارشوں کی تائید میں آبادی کی تقسیم کے اعداد و شمار پیش کئے۔ مگر یہ ساری کوششیں بیکار ثابت ہوئیں ہر فریق کے دلیں ڈراؤ رشبہ بیٹھا ہوا تھا اور ایک قدم جو منزل مقصود تک پہنچنے میں باقی تھا کسی سے نہیں اٹھاتے بنا۔

آل پارٹیز کانفرنس کا اجلاس کمیٹی کی رپورٹ پر غور کرنے کی غرض سے لکھنؤ میں منعقد ہوا۔ ہم چند آدمی پھر دہری مشکل میں پڑ گئے۔ ہم یہ چاہتے تھے کہ فرقہ وارانہ تصفیہ ہوتا ہو تو اس میں روڑے نہ اٹکائیں، لیکن کامل آزادی کے مقصد کو چھوڑنا ہمیں کسی طرح گوارا نہ تھا۔ ہم نے یہ التجا کی کہ کانفرنس اس مسئلے کو یوں ہی رہنے دے تاکہ ہر جماعت اس خاص معاملے میں جو روش چاہے اختیار کرے۔ کانگریس کامل آزادی پر جمی رہے اور اعتدال پسند جماعتیں ”نوا بادیات کے درجے“

پر مگر میرے والد رپورٹ کو منوانے پر تلے ہوئے تھے اور اپنی جگہ سے ایک قدم ہٹنا نہیں چاہتے تھے اور نہ ان حالات میں ہٹ سکتے تھے۔ چنانچہ کامل آزادی کے حامیوں نے جو وہاں بہت بڑے تعداد میں موجود تھے، مجھ سے فرمائش کی کہ ان کی طرف سے کانفرنس میں اعلان کردوں کہ ہم لوگ کسی ایسی چیز سے واسطہ نہیں رکھنا چاہتے جس سے کامل آزادی کے مقصد میں بڑھتا ہو مگر اسی کے ساتھ ہم نے اس بات کو صاف کر دیا کہ ہم کانفرنس کی راہ میں روڑے لگانا نہیں چاہتے تاکہ فرقہ وارانہ تصفیے میں دقت نہ ہو۔

اتنے بڑے معاملے میں یہ طرز عمل کچھ موثر نہ تھا اور زیادہ سے زیادہ نفی کی حیثیت رکھتا تھا۔ اس میں اثبات کا رنگ پیدا کرنے کے لئے ہم نے اسی دن ”انجمن آزادی ہند“ کی بنا ڈال دی۔

آل پارٹیز کانفرنس کی کاروائی سے مجھے اس سے بھی زیادہ سخت دھچکا اس وجہ سے پہنچا کہ اس نے مجوزہ دستور اساس کے بنیادی حقوق کے سلسلے میں اودھ داروں کی خاطر، ایک دفعہ یہ بھی بڑھادی کہ ان کے حقوق اپنے اپنے تعلقے میں محفوظ رہیں گے۔ یوں تو سارا دستور ہی ذاتی ملکیت کے اصول پر مبنی تھا مگر یہ غضب دیکھئے کہ بڑی بڑی نیم جاگیر داری ریاستوں کے حقوق دستور کی اٹل بنیادوں میں داخل کئے جا رہے تھے۔ اس سے معلوم ہو گیا کہ کانگریس کے لیڈر اور ان سے زیادہ غیر کانگریسی لوگ اپنی جماعت کے ترقی پسند لوگوں کو چھوڑ کر بڑے بڑے زمینداروں کا ساتھ دینے پر تیار ہیں۔ یہ بالکل ظاہر تھا کہ ہمارے اور ہمارے بہت سے لیڈروں کے درمیان بہت بڑی خلیج حائل ہے اور مجھے یہ بات مہمل معلوم ہوتی تھی کہ ایسے صورت میں کانگریس کا جنرل سکریٹری رہوں، چنانچہ میں نے اس بنا پر استعفا پیش کر دیا کہ میں ”انجمن آزادی ہند“ کے بانیوں میں سے ہوں مگر ورکنگ کمیٹی نے اسے منظور نہیں کیا اور مجھ سے اور سبھاش بوس سے (جنہوں نے اسی بنا پر

استفادیا تھا) کہا گیا کہ تم اس انجمن کا کام کرتے رہو۔ اس کے کانگریس کی پالیسی سے ٹکرانے کی کوئی وجہ نہیں اس لئے کہ کانگریس پہلے کامل آزادی کی حمایت کا اعلان کر چکی ہے۔ میں پھر بھی راضی ہو گیا۔ مجھے استفادہ واپس لینے پر آمادہ کر لینا بائیں ہاتھ کا کھیل تھا۔ کئی موقعوں پر میں نے اپنا استفادہ واپس لیا۔ اصل بات یہ ہے کہ دونوں فریقوں میں سے کوئی ایک دوسرے سے الگ ہونا نہیں چاہتا تھا، اور ذرا سا بہانہ ملتے ہی جھگڑا رُف ہو جاتا تھا۔

گاندھی جی نہ آل پارٹیز کانفرنس میں شریک ہوئے اور نہ کمیٹی کی مجلسوں میں یا اس تک کہ لکھنؤ کے اجلاس میں بھی نہیں آئے۔

اس اثنا میں سائمن کمیشن دورہ کر رہا تھا اور جہاں جاتا تھا مخالفوں کا مجمع کالے جھنڈے لئے ”گو بیک“ کے نعرے لگاتا پیچھے ہولیتا تھا۔ کبھی کبھی پولیس میں اور عوام کے مجمع میں معمولی سے جھگڑا بھی ہو جاتا تھا۔ لاہور میں بات بڑھ گئی اور سارا ملک غصے سے لرز گیا۔ وہاں سائمن کمیشن کی مخالفت کا مظاہرہ لالہ لاجپت رائے کی سرکردگی میں ہو رہا تھا۔ اور وہ سڑک کے کنارے ہزاروں مظاہرہ کرنے والوں کے آگے کھڑے تھے کہ پولیس کے ایک نوجوان انگریز افسر نے جھپٹ کر ان کے سینہ پر ڈنڈے مارنا شروع کر دیئے۔ لالہ جی کو تو ذکر ہی کیا ہے سارے مجمع میں کسی شخص نے بھی مطلق تشدد سے کام نہیں لیا تھا بلکہ سب پر امن طریقے سے کھڑے تھے۔ اس پر بھی پولیس ان کو اور ان کے ساتھیوں کو بری طرح مارا۔ ظاہر ہے کہ جو شخص سڑکوں پر مظاہرے میں شریک ہو وہ پولیس سے جھگڑا ہو جانے کی جو کھم اٹھاتا ہے اور لالہ جی جان بوجھ کر اس خطرے میں پڑے ہوں گے مگر پھر بھی جس طریقے پر حملہ کیا گیا اور بلاوجہ جس بے دردی سے کام لیا گیا اس سے بے شمار ہندوستانیوں کو سخت دھچکا لگا۔ ان دنوں ہم لوگ پولیس کے لاشی چارج کے عادی نہیں تھے۔ ہمارا احساس اس وقت تک متواتر وحشیانہ حرکتوں سے کند نہیں ہوا تھا۔

ہمارے اتنے بڑے لیڈر اور پنجاب کے سب سے ممتاز اور ہر دلعزیز بزرگ کے ساتھ یہ برتاؤ نہایت شرمناک معلوم ہوا اور دبے ہوئے غصے کی ایک لہر سارے ہندوستان میں خصوصاً شمالی ہند میں دوڑ گئی۔ ہماری بے بسی اور ذلت کا کیا ٹھکانا تھا کہ ہم اپنے چنے ہوئے لیڈروں کی عزت کو بھی نہیں بچا سکتے تھے

لالہ جی کو جو جسمانی ضرر پہنچا وہ کچھ کم نہ تھا اس لئے کہ انہیں عرصے سے دل کی بیماری تھی اور ضرب ان کے سینے پر لگائی تھی۔ یقینی طور پر یہ نہیں کہا جاسکتا کہ اس چوٹ کا اثر ان کی موت پر جو چند ہفتے کے بعد واقع ہوئی کس حد تک پڑا۔ ان کے معالج ڈاکٹروں کی تو یہ رائے تھی کہ اسی کی وجہ سے وہ اتنی جلدی ختم ہو گئے مگر میرے خیال اس میں شبہ کی ذرا بھی گنجائش نہیں کہ جسمانی ضرر کے ساتھ جو دماغی صدمہ پہنچا اس نے انہیں بے حد متاثر کیا۔ ان کا دل غمو و غصہ سے معمور اپنی ذاتی ذلت سے زیادہ انہیں قومی ذلت کا خیال تھا جو اس حملے کی وجہ سے ہوئی تھی۔

اس قومی ذلت احساس ہندوستان کے دل و دماغ پر چھایا ہوا تھا اور تھوڑے ہی دن بعد جب لالہ جی نے وفات پائی تو لوگوں نے اس کی وجہ اسی حملہ کو قرار دیا اور ان کے دلوں میں طیش کا جذبہ اس شدت سے اٹھا کہ رنج پر بھی غالب آ گیا۔ اس بات کو اچھی طرح ذہن نشین کر لینا چاہیے کیونکہ اس کی مدد سے ہم بعد کے واقعات کو سمجھ سکتے ہیں یعنی بگھٹ سنگھ کا نمودار ہونا اور یا کیا ک سارے شمالی ہند میں اس قدر ہر دلعزیز ہو جانا۔ اشخاص کو اور ان کے کاموں کو بغیر اس پر غور کئے ہوئے کہ ان کے محرکات اور اسباب کیا تھا، قابل ملامت قرار دے دینا بہت سہل ہے مگر محض بے وقوفی ہے۔ بگھٹ سنگھ پہلے سے چمور نہیں تھا، اس کی ہر دلعزیزی کا سبب محض ایک تشدد اور تحویف کا فعل نہیں تھا۔ تحویف پسند ہندوستان میں تیس سال سے وقتاً فوقتاً اٹھتے رہے ہیں اور انہیں سوائے بنگال ایچی ٹیشن کے ابتدائی زمانے کے کبھی اس ہر دلعزیزی کا پانسک بھی نصیب نہیں ہوا جو بگھٹ سنگھ کو حاصل ہو گئی۔ یہ ایک صریحی

حقیقت ہے جس سے انکار نہیں کیا جاسکتا۔ اسی طرح یہ بھی کھلی ہوئی بات ہے کہ تحریف پسندی کی بجھی ہوئی راکھ میں سیکھی کبھی دبی ہوئی چنگاریاں نکل آتی ہیں۔ مگر اب یہ چیز ہندوستان کے نوجوانوں میں مقبول نہیں ہے۔ پندرہ برس کی عدم تشدد کی تلقین نے ہندوستان کے طرز خیال کو بدل دیا ہے اور عوام تحوفے کو سیاسی طریق کار کی حیثیت سے قابل توجہ نہیں سمجھتے، بلکہ اسکے مخالف ہیں۔ نچلے متوسط طبقے اور تعلیم یافتہ طبقے پر بھی جس میں تحریف پسند عموماً پیدا ہوتے ہیں، اس پر چار کا بہت قوی اثر ہو چکا ہے جو کانگریس تشدد کے طریقوں کے خلاف کرتی رہی ہے۔ ان میں جو زیادہ تیز اور جدل باز ہیں اور انقلابی طریقوں کے حامی ہیں وہ بھی اچھی طرح جانتے ہیں کہ انقلاب تحریف کے ذریعے سے نہیں ہوا کرتا بلکہ یہ ایک فرسودہ اور بیکار طریقہ ہے جو انقلابی عمل میں رکاوٹ ڈالتا ہے۔ تحریف ہندوستان میں اور دوسرے ملکوں میں ختم ہوتی جاتی ہے اس کی وجہ حکومت کا جبر نہیں، اس لئے کہ اس سے تو مادہ اکھڑنے کے بجائے دب جاتا ہے اور اندر ہی اندر پکتا رہتا ہے، بلکہ اس کے گہرے اور بنیادی اسباب ہیں جو عالمگیر واقعات سے تعلق رکھتے ہیں۔ جب کسی ملک میں تحریف کا زور ہو تو اس کے بی معنی ہیں کہ انقلابی جدہ بالک ابتدائی حالت میں ہے کچھ دن کے بعد یہ دور گزر جاتا ہے اور اس کے ساتھ تحریف کی تحریک بھی ختم ہو جاتی ہے۔ یہ اور بات ہے کہ کسی مقامی واقعے یا شخصی ظلم کی وجہ سے کبھی یہ آگ بھڑک اٹھے۔ ہندوستان یقینی طور پر اس دور سے گزر چکا ہے اور اکادکا وادائیں جو کبھی بھی ہو جاتی ہیں۔ یہ بھی رفتہ رفتہ بند ہو جائیں گی مگر اس کے یہ معنی نہیں کہ تمام ہندوستان کے لوگ تشدد کے طریقوں کے قائل نہیں رہے۔ انفرادی تشدد اور تحریف کا خیال عام طور پر ترک کر دیا گیا ہے مگر غالباً بہت سے لوگ اب بھی یہ سمجھتے ہیں کہ ایک وقت آئے گا جب آزادی حاصل کرنے کے لئے منظم تشدد کے طریقوں کی ضرورت ہوگی۔ جس طرح دوسرے ملکوں میں اکثر ہوتی رہی

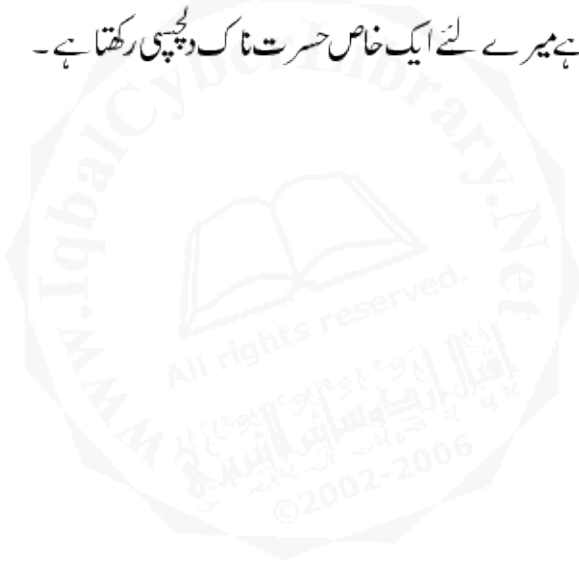
ہے۔ یہ آج کل ایک نظری مسئلہ ہے جس کا فیصلہ وقت آنے پر موقوف ہے، اسے
تخوینی طریقوں سے کوئی تعلق نہیں۔

بھگت سنگھ کو جو ہر دلچیزی حاصل ہوئی وہ اس کے تخوینی فعل کی وجہ سے نہ تھی
بلکہ اس وجہ سے کہ اس وقت لوگوں کا یہ خیال تھا کہ اس نے لالہ لاجپت رائے کی اور
سارے ہندوستان کی لاج رکھ لی۔ اس کی ذات قومی حمیت کی نشان بن گئی۔
فعل کو تو لوگ بھول گئے اور یہ نشانی باقی رہ گئی۔ چند مہینے میں پنجاب کا ہر شہر اور ہر
گاؤں اور ایک حد تک سارا شمالی ہند اس کے نم سے گونج اٹھا۔ اس کی شان میں بے
شمار گیت گائے جانے لگے۔ اور اسے حیرت انگیز ہر دلچیزی حاصل ہوئی۔

سائمن کمیشن کے بائیکاٹ میں چوٹ کھانے کے بعد لالہ لاجپت رائے آل
انڈیا کانگریس کمیٹی کے ایک جلسہ میں شریک ہونے کے لئے دہلی آئے ان کے جسم پر
چوٹ کے نشانی باقی تھے اور اس کی تکلیف بھی دور نہیں ہوئی تھی۔ یہ جلسہ لکھنؤ کی آل
پارٹیز کانفرنس کے بعد ہوا تھا اور اس میں کامل آزادی کا مسئلہ بھی کسی صورت سے
چھڑ گیا تھا۔ مجھے وہ بات تو ٹھیک طور پر یاد نہیں جس پر بحث ہو رہی تھی۔ مگر یہ یاد
ہے کہ میں نے کسی قدر تفصیل سے تقریر کی۔ جس کا منہوم یہ تھا کہ اب وہ وقت
آ گیا ہے جب کانگریس کو دو چیزوں میں سے ایک چیز اختیار کرنا ہے یا تو انقلابی طرز
خیال جو ہمارے سیاسی اور سماجی نظام میں کایا پلٹ چاہتا ہے یا اصلاحی مقصد اور
طریقہ۔ یہ تقریر کوئی اہمیت نہیں رکھتی تھی اور میں اسے بھول گیا ہوتا مگر اس وجہ سے
یاد رہ گئی کہ لالہ جی نے کمیٹی میں اس کا جواب دیا اور اس کے بعض حصوں پر تنقید کی۔
علاوہ اور باتوں کے انہوں نے یہ بات بھی بتائی، کہ ہمیں برطانوی مزدور پارٹی
سے کوئی امید نہیں رکھنی چاہیے۔ مجھے اس تنبیہ کی ضرورت نہیں تھی اس لئے کہ میں کو
برطانوی مزدوروں کے باضابطہ لیڈروں کا قائل نہیں تھا بلکہ مجھے سخت تعجب ہوتا اگر
یہ لوگ ہندوستان کی جنگ آزادی میں مدد دیتے یا ایسا کوئی کام بھی کرتے جس سے

موثر طور پر شہنشاہی کی مخالفت یا اشتراکیت کی حمایت ثابت ہوتی۔

لاہور واپس جا کر لالہ جی نے پھر میری اس تقریر کے موضوع کی طرف توجہ کی اور اپنے ہفتہ وار اخبار ”پیل“ میں اس کے مختلف پہلوؤں پر ایک سلسلہ مضامین لکھنا شروع کیا۔ ابھی پہلا ہی مضمون نکلا تھا اور دوسرے کے چھینے کی نوبت نہیں آئی تھی کہ وہ دنیا سے گذر گئے۔ ان کا وہ پہلا نام تمام مضمون جو غالباً ان کی آخری شائع شدہ تحریر ہے میرے لئے ایک خاص حسرت ناک دلچسپی رکھتا ہے۔



لاٹھی چارج کا تجربہ

لالہ لاجپت رائے کے زخمی ہونے اور وفات پانے کے بعد سائمن کمیشن جہاں کہیں گیا اس کے خلاف اور بھی زیادہ زور شور سے مظاہر کئے گئے۔ اب وہ لکھنؤ آنے والا تھا اور وہاں کی کانگریس کمیٹی نے بہت بڑے پیمانے پر اس کی ”استقبال“ کا انتظام کیا تھا۔ کئی دن سے بڑے بڑے جلوس نکالے جا رہے تھے اور جلسے اور مظاہرے کئے جا رہے تھے تاکہ پروپیگنڈا بھی ہو جائے اور اصل موقع پر کام کرنے کی مشق بھی ہو جائے گی۔ میں لکھنؤ گیا اور ان میں سے بعض چیزوں میں شریک ہوئے اور ان کی کامیابی حکومت کے دل میں کھٹکنے لگی۔ اس نے ان کی راہ میں روڑے اٹکانے شروع کئے اور یہ احکام جاری کئے کہ فلاں فلاں مقام پر جلوس نہ نکالا جائے۔ اسی سلسلے میں مجھے ایک نیا تجربہ ہوا اور میرے جسم نے پولیس کے ڈنڈوں اور لathiوں کا مزہ چکھا۔

جلوس نکالنے کی ممانعت کر دی گئی تھی اور اس کی وجہ یہ ظاہر کی گئی تھی کہ سڑک کی آمدورفت میں حرج ہوتا ہے۔ ہم نے یہ طے کیا کہ جلوس اس طرح نکالیں جس میں کسی کوشکایت کا موقع نہ ملے۔ جہاں تک مجھے یاد ہے ہم نے سولہ سولہ آدمیوں کے جتھے بنا کر الگ الگ سونی سڑکوں سے بھیجے کہ جلسے کے مقام پر پہنچ کر مل جائیں۔ ظاہر ہے کہ قانون کے الفاظ سے یہ حکم کے خلاف ورزی تھی۔ کیونکہ سولہ آدمیوں کا جھنڈا لے کر چلنا جلوس کی تعریف میں داخل ہے ایک جتھے کے آگے آگے میں تھا اور میرے پیچھے کچھ فاصلے سے دوسرا جتھا آ رہا تھا جس کے رہنما میرے رفیق کتر گووند پلہ پنتھ تھے۔ پر کوئی دوسو گزر گیا ہو گا کہ پیچھے گھوڑوں کی ٹاپوں کی آواز سنائی دی۔ ہم نے مڑ کر دیکھا تو معلوم ہوا کہ دو تین درجن پولیس کے سوار ہم پر چڑھے آرہے ہیں تھوڑی دیر کے بعد وہ آن پہنچے اور گھوڑوں کے دھکے سے ہمارا چھوٹا سا جتھا منتشر ہو گیا۔ پولیس کے سواروں نے ہمارے والٹیر وں کو

بڑے بڑے ڈنڈوں سے مارنا شروع کر کیا اور انہیں بھاگ کر گلیوں اور چھوٹی چھوٹی
 دکانوں میں پناہ لینی پڑی۔ سواروں نے وہاں بھی ان کا پیچھا کیا۔ انہیں خوب
 پیٹا۔ میں نے بھی جب یہ دیکھا کہ گھوڑے جڑھے چلے آتے ہیں تو گھبرایا اور جی
 میں آیا کہ بھاگ کر جان بچاؤ۔ مگر تھوڑی دیر میں دیکھا کہ میں سڑک کے بیچ میں
 اکیلا کھرا ہوں اور مجھ سے چند گز کے فاصلے پر پولیس والے ہر طرف ہمارے
 والینٹروں کو پیٹ رہے ہیں۔ میرے قدم خود بخود سڑک کے کنارے کی طرف
 ہٹنے لگے تاکہ مجھ پر نظر نہ پڑے۔ مگر میں پھر ٹھہر گیا اور اپنے دل کو سمجھایا کہ مجھے
 یہاں سے ہٹنا زیا نہیں۔ یہ سب کچھ چند سیکنڈ میں ہو گیا مگر مجھے ابھی تک یاد ہے
 کہ میرے ذہن میں اس وقت کیسی کشمکش تھی اور میں نے کیا فیصلہ کیا تھا۔ اس کی
 وجہ شاید یہ تھی کہ میرے غرور نے یہ گوارا نہ کیا کہ کوئی نامردی کی حرکت کروں۔ مگر
 اس وقت مردی اور نامردی میں بس ایک ہی قدم کا فاصلہ تھا اور کوء تعجب نہ تھا کہ میں
 یہ قدم اٹھا لیتا۔ میں یہ سوچ ہی رہا تھا کہ ایک سوار اپنی نئی لاٹھی ہلاتا ہو امیری طرف
 آیا۔ میں نے اس سے کہا کہ ہٹ جاؤ اور خود منہ پھیر کر کھڑا ہو گیا۔ یہ حرکت مجھ
 سے بے اختیار سرزد ہوئی تاکہ سر میں اور منہ پر چوٹ نہ آئے۔ اس نے میری پیٹھ
 پر کس کر دو لاٹھیاں جمائیں۔ مجھے چکر آ گیا اور سارے بدن سے کانپنے لگا۔ مگر یہ
 دیکھ کر مجھے تعجب اور خوشی ہوئی کہ میں نے اپنی جگہ سے قدم نہیں ہٹایا تھا۔ تھوڑی
 دیر کے بعد پولیس چلی گئی اور اس نے آگے جا کر ہمارا راستہ روک دیا۔ ہمارے
 والینٹیر پھر اکٹھے ہو گئے۔ ان میں سے بہتوں کو سر پھٹ گیا تھا اور خون بہہ رہا تھا۔
 پنتھ اور ان کے ساتھی بھی آ گئے۔ ان کی بھی یہی درگت ہوئی تھی۔ ہم سب کے
 سب پولیس کے مقابل سڑک پر بیٹھ گئے۔ اس طرح ایک گھنٹہ گزر گیا اور شام
 ہو گئی۔ ایک طرف بڑے بڑے حکام جمع ہو گئے اور دوسری طرف لوگوں کا مجمع یہ خبر
 پا کر اکٹھا ہونے لگا۔ آخر حکام اس بات پر راضی ہو گئے کہ ہم جس راستہ سے جانا

چاہتے تھے اسی سے جائیں۔ جب ہم روانہ ہوئے تو وہی سوار جنہوں نے ہمیں زد و کوب کیا تھا محافظ دستے کے طور پر ہمارے ساتھ تھے۔

میں نے اس چھوٹے سے واقعے کو کسی قدر تفصیل سے اس لئے بیان کیا ہے کہ اس کا مجھ پر ایک خاص اثر ہوا تھا۔ مجھے جو چوٹ آئی تھی اسے میں اس خوشی میں بھول گیا کہ میں لاٹھی کھانے کی طاقت رکھتا ہوں۔ ایک اور بات جس سے مجھے تعجب ہوا یہ تھی کہ عین اس وقت مجھ پر لاٹھیاں پڑ رہی تھیں میرے خیالات بالکل واضح تھے اور میں اچھی طرح جان بوجھ کر اپنے جذبات کا مشاہدہ کر رہا تھا۔ اس مشق سے مجھے فائدہ پہنچا اس لئے کہ دوسرے دن اس سے بھی زیادہ سخت آزمائش ہونے والی تھی۔ دوسرے دن صبح کو سائمن کمیشن کے آنے کا وقت تھا اور ہمارا بڑا مظاہرہ ہونے والا تھا۔

میرے والد اس وقت الہ آباد میں تھے اور مجھے خوف تھا کہ مجھ پر جو حملہ ہوا تھا اس کی خبر اخبار میں پڑھ کر وہ اور گھر میں سب لوگ پریشان ہوں گے۔ اس لئے میں نے شام کو انہیں ٹیلیفون کر دیا کہ میں خیریت سے ہوں آپ بالکل نہ گھبرائیں مگر وہ اس پر بھی گھبرائے۔ انہیں رات کو نیند نہیں آئی اور آدھی رات کے قریب انہوں نے فیصلہ کیا کہ خود لکھنؤ آئیں۔ آخری گاڑی چھوٹ چکی تھی، اس لئے وہ موٹر کار سے روانہ ہوئے۔ رستے میں کچھ گڑبڑ ہوئی اور وہ صبح پانچ بجے کے قریب ایک سو چھیالیس میل کا سفر طرے کر کے تھکے ہارے لکھنؤ پہنچے۔

اسی وقت ہم لوگ اسٹیشن جانے کے لئے جلوس کی تیاری کر رہے تھے۔ گزشتہ شام کے واقعات کی وجہ سے لکھنؤ میں اتنا جوش پیدا ہو گیا تھا جو ہماری کوششوں سے کبھی نہ ہوتا۔ اور ہزاروں آدمی اسٹیشن کی طرف جا رہے تھے۔ شہر کے مختلف حصوں سے چھوٹے چھوٹے جلوس اٹھ چلے آتے تھے۔ کانگرس کے دفتر سے بڑا جلوس روانہ ہوا جس میں کئی ہزار آدمی چار چار کی ٹولیوں میں چل رہے

تھے۔ ہم لوگ اس بڑے جلوس میں تھے۔ جب اسٹیشن کے قریب پہنچے تو پولیس نیروکا۔ اسٹیشن کے سامنے آدھ میل مربع کا ایک کھلا میدان تھا۔ (جس پر اب نیا اسٹیشن بنایا گیا ہے) ہم لوگوں کو اس سے آگے نہیں بڑھنے دیا گیا۔ اور ہم اس کے ایک طرف صفیں باندھ کر کھڑے ہو گئے ہمارا جلوس چپ چاپ کھڑا رہا اور اس نے آگے بڑھنے کی کوشش نہیں کی۔ ہر طرف پیدال اور سوار پولیس اور فوج کا ہجوم تھا۔ ہمدرد متاثرانیوں کا مجمع بڑھتا گیا۔ اور ان میں سے بہت سے دو دو تین کر کے میدان میں پھیل گئے۔ یکا یک ہم نے دیکھا کہ دور سے ایک جماعت چلی آتی ہے۔ یہ فوج کے رسالے اور سوار پولیس کی دو تین لمبی صفیں تھیں جو ہماری طرف بڑھ رہی تھیں اور ان لوگوں کو جو میدان میں کھڑے تھے مارتی کچلتی چلی آتی تھیں۔ ان سواروں کا بلہ بجائے خود ایک شاندار منظر تھا مگر اس وقت تو یہ منظر بہت دردناک تھا اس لئے کہے بچارے بے قصور متاثرانی حیران پریشان گھوڑوں کا ناپوں کے نیچے کچلے جا رہے تھے۔ سواروں کی بڑھتی ہوئی صفوں کے پیچھے یہ لوگ زمین پر پڑے تھے۔ ان میں سے بعض اپنی جگہ سے بل نہیں سکتے تھے اور بعض درد سے تڑپ رہے تھے۔ میدان جنگ کا پورا نقشہ نظر کے سامنے تھا۔ مگر ہمیں اس منظر کو دیکھنے یا اس پر غور کرنے کا زیادہ موقع نہیں ملا۔ سوار تھوڑی دیر میں ہمارے قریب آن پہنچے اور ان کی پہلی صف پوری رفتار سے ہمارے جلوس سے ٹکرائی۔ ہم اپنی جگہ پر جمے رہے۔ یہ دیکھ کر سواروں نے آخری لمحے میں گھوڑوں کی باگ کھینچ لی۔ گھوڑے پچھلے پیروں پر کھڑے ہو گئے اور ان کے اگلے پیر ہمارے سروں کے بالکل قریب تھر تھرا رہے تھے۔ اب سواروں اور پیادوں نے ہم پر لٹھیاں اور ڈنڈے برسانے شروع کر دیے۔ یہ بڑا سخت حملہ تھا اور خیالات کی وہ وضاحت جو میں گزشتہ شام کو رکھتا تھا، اس وقت رخصت ہو گئی۔ مجھے صرف اتنا احساس باقی تھا کہ جہاں کھڑا ہوں۔ وہاں سے سر کننا نہیں چاہیے۔ میں لٹھیوں کی بوچھاڑ سے اندھا سا ہو رہا تھا۔ کبھی

کبھی غصے سے بیتاب ہو جاتا تھا اور جی چاہتا تھا کہ میں بھی ہاتھ چلاؤں۔ میں دل میں سوچتا تھا کہ یہ کس قدر آسان ہے کہ میں اپنے سامنے والے پولیس افسر کو کھینچ کر گرا دوں اور اس کی جگہ خود سوار ہو جاؤں۔ مگر ایک مدت کی تربیت اور انضباط کام آیا اور میں نے ہاتھ اٹھایا تو مارنے کے لئے نہیں بلکہ صرف وار روکنے کے لئے۔ اس کے علاوہ میں اچھی طرح جانتا تھا کہ اگر ہماری طرف سے ذرا سی بھی زیادتی ہوئی تو نہایت ہی ہولناک مصیبت پیش آئے گی اور ہم میں سے ہزاروں آدمی گولیوں سے ہلاک کر دئے جائیں گے۔

معلوم ہوتا تھا کہ بہت دیر میں مگر اصل میں چند منٹ کے بعد ہماری صف بغیر ٹوٹے ہوئے آہستہ آہستہ پیچھے ہٹنے لگی۔ اب میں اکیال رہ گیا اور دونوں طرف سے حملے کا اندیشہ ہو گیا۔ مجھ پر کئی لاٹھیاں اور پڑیں اس کے بعد کسی نے یکا یک مجھے پیچھے سے پکڑ کر اٹھالیا جس پر میں بہت ہی جھنجھلایا۔ معلوم ہوا کہ میرے بعض نوجوان ساتھیوں نے یہ سمجھ کر کہ میری جان لینے کی جا رہی ہے، مجھے بچانے کے لئے یہ زبردستی کا طریقہ استعمال کیا تھا۔

ہم سب جلوس والے کوئی سو فٹ سرک کر پھر جم گئے۔ پولیس بھی پیچھے ہٹ گئی۔ اور ہم سے پچاس فٹ کے فاصلے پر پراباندھ کر کھڑی ہو گئی۔ اس عرصے میں فساد کی جڑ یعنی سائمن کمیشن اسٹیشن سے جو ہم سے آدھ میل کے فاصلے پر تھا، چپکے سے روانہ ہو گیا مگر اس پر وہ کالے جھنڈیوں اور مظاہرہ کرنے والوں سے محفوظ نہیں رہ سکا۔ تھوڑی دیر گئے۔ میں سیدھا والد کے پاس گیا جو بے چینی سے میرا انتظار کر رہے تھے۔

وقتِ ہیجان کے گزرنے کے بعد مجھے یہ محسوس ہوا کہ سارے بدن میں درد ہو رہا ہے اور میں تھک کر شل ہو گیا ہوں۔ رگ رگ میں درد ہو رہا تھا۔ سارے بدن پر زخم اور لاٹھیوں کے نشان تھے۔ مگر خوش قسمتی سے کسی ایسے حصے میں چوٹ نہیں آئی تھی

جس میں جان کا خطرہ ہو۔ میرے بعض ساتھی بہت بری طرح زخمی ہوئے تھے۔ گووندو لہ پنتھ اس ہنگامے میں میرے پاس ہی کھڑے تھے۔ ان کا قد چھ فٹ سے اوپر ہے اس وجہ سے وہ خاص طور پر لائٹھوں کا نشانہ بنے۔ اس دن کی چوٹوں کی وجہ سے انہیں بڑی تکلیف وہ بیماری لاحق ہو گئی اور وہ ایک عرصے تک اپنی پیٹھ سیدھی کرنے اور چلنے پھرنے کے قابل نہیں ہوئے۔ مجھے اس دن سے اپنی جسمانی طاقت اور برداشت کی قوت پر اور زیادہ گھمنڈ ہو گیا مگر میری آنکھوں میں جو تصویر پھر رہی تھی وہ لائٹھ کے حملوں کی نہیں بلکہ ان پولیس والوں کے چہروں کی ہے جو ہم پر حملہ کر رہے تھے۔ زیادہ بے دردی سے یورپی سارجنوں نے مارا تھا۔ ہندوستانی سپاہیوں نے کسی قدر نرمی سے کام لیا تھا۔ کس قدر خوف ناک تھے وہ چہرے جن میں نفرت اور خونخواری جنون کی حد تک پہنچ گئی تھی اور ہمدردی اور انسانیت کا نام تک نہ تھا! غالباً ہم لوگوں کے چہرے بھی ایسے ہی بھیا تک ہو گئے۔ عدم تشدد نے نہ تو ہمارے دلوں میں حریفوں کی محبت کا جوش، پیدا کیا تھا اور نہ ہمارے چہروں کے حسن میں اضافہ کیا تھا۔ اس پر بھی ہمیں ایک دوسرے سے شکایت نہ تھی۔ ہمارے دل ذاتی عداوت اور کینے سے پاک تھے۔ اس وقت ہمارے اندر عجیب و غریب زبردست قوتیں کارفرما تھیں۔ اور ہمیں جدھر چاہتی تھیں وہ ہمارے دل و دماغ پر چھائی ہوئی تھیں، ہمارے جذبات و خواہشات پر حاوی تھی اور ہمیں کٹھ پتلی کی طرح اپنے شاروں پر چلاتی تھیں۔ ہم اندھا دھند لڑ رہے تھے اور ہمیں یہ خبر نہ تھی کہ ہم کاہے کے لئے لڑ رہے تھے اور کدھر جا رہے ہیں۔ عمل کا جوش اور ہیجان ہم پر طاری تھا، مگر اس جوش کا ٹھنڈا ہونا تھا کہ ہمارے دلوں میں یہ سوال اٹھا، آخر اس سارے ہنگامے کا مقصد کیا ہے؟“

ٹریڈ یونین کانگریس

اس سال ملک کی سیاست پر سائنس کمیشن کا بائیکاٹ اور آل پارٹیز کانفرنس حاوی تھی۔ مگر میری دلچسپی اور سرگرمی کا رخ دوسرا تھا۔ کانگریس کے جنرل سکرٹری کی حیثیت سے میں اس کی تنظیم کو قوت پہنچانے میں مصروف تھا اور خاص طور پر مجھے اس کام سے دلچسپی تھی کہ عام لوگوں کی توجہ کو سماجی اور معاشی تغیرات کی طرف پھيروں۔ مدراس کی کانگریس میں کامل آزادی کی جو تحریک اٹھائی گئی تھی اسے مستحکم کرنے کی ضرورت تھی خصوصاً اس وجہ سے کہ آل پارٹیز کانفرنس ہمیں اس مقصد سے پیچھے ہٹانا چاہتی تھی۔ اس غرض سے میں نے دور دور کا سفر کیا اور بہت سے اہم جلسوں میں تقریریں کیں۔ جہاں تک مجھے یاد ہے میں نے ۱۹۲۸ء میں چار صوبوں یعنی پنجاب، مالا بار دہلی اور صوبہ متحدہ کی کانفرنسوں میں اور بنگال اور بمبئی کے نوجوان اور طالب علموں کی انجمنوں میں صدارت کے فرائض انجام دئے۔ وقتاً فوقتاً میں صوبہ متحدہ کے دیہات میں جاتا رہا اور مزدوروں کے مجموعوں میں بھی تقریریں کرتا رہا۔ میری تقریروں کی تان ہمیشہ ایک ہی چیز پر ٹوٹی تھی، البتہ ان کا طرز مقامی حالات کے لحاظ سے بدلتا رہتا تھا۔ جس قسم کا مجمع دیکھتا اسی قسم کی باتوں پر زور دیتا۔ میری تقریر کا موضوع سب کہیں سیاسی آزادی اور سماجی آزادی ہوتی تھی اور میں سماجی آزادی کو کارکنوں اور تعلیم یافتہ طبقے میں پھیلانا چاہتا تھا کیونکہ یہ لوگ جو قومی تحریک کے پشت پناہ جاتا تھا:۔ ماضی کی شاندار روایات، بدیسی حکومت کے مادی اور روحانی نقصانات، قوم کی حالت زار، غلامی کی ذلت، قومی عزت کا تقاضا کہ ہم آزادی حاصل کریں، مادر وطن کی خاطر قربانی کی ضرورت۔ یہ وہ جانے بوجھے موضوع تھے جو ہر ہندوستانی کے دل کو متاثر کرتے ان لوگوں میں سے نہ تھا جو ہندوستان یا کسی اور ملک کے ماضی کی اندھا دھند تعریف کرتے ہیں (یہ باتیں اپنی جگہ صحیح تھیں لیکن کثرت استعمال سے فرسودہ ہو چکی تھیں اور انھیں بار بار

دہرانے کی وجہ سے لوگ دوسرے مسئلوں اور ہماری جدوجہد کے بعض اہم پہلوؤں کی طرف متوجہ نہیں ہونے پاتے تھے۔ ان سے جذبات بھڑک اٹھتے تھے مگر غور و فکر کی تحریک نہیں ہوتی تھی۔

میں ہندوستان میں اشتراکیت کا ہراول نہیں تھا بلکہ سچ پوچھئے تو میں اس میدان میں بہت پیچھے تھا اور بڑی مشکل سے آہستہ آہستہ قدم اٹھاتا تھا۔ بہت سے لوگ مجھ سے آگے نکل چکے تھے اور میں ان کے روش نقش قدم پر چل رہا تھا۔ مزدوروں کی اشتراکیت کی تحریک اور نوجوانوں کی اکثر انجمنیں اصولاً صریحی طور پر اشتراکیت کی حامی تھیں۔ دسمبر ۱۹۲۷ء میں جب میں یورپ سے واپس آیا، ہندوستان میں اشتراکیت کی ایک دھندلی سی فضا چھائی ہوئی تھی اور بعض افراد اس سے بھی پہلے اشتراکی خیالات رکھتے تھے۔ زیادہ تر یہ لوگ خیالی دنیا میں رہتے تھے مگر مارکس کے نظریہ کا اظہر و زبر و بڑھاتا جاتا تھا اور چند اشخاص اپنے آپ کو مارکس کا پورا پیرو سمجھتے تھے۔ یورپ اور امریکا کی طرح ہندوستان میں بھی اس رجحان کو سو ویٹ یونین کی نشوونما خصوصاً اس کے پنج سالہ منصوبے سے تقویت پہنچی تھی۔

مجھے اشتراکی کارکن کی حیثیت سے جو کچھ اہمیت حاصل تھی وہ اس وجہ سے تھی کہ میں ایک سربراہ آورہ کانگریسی تھا اور کانگریس میں ایک بڑا عہدہ رکھتا تھا۔ بعض اور مشہور کانگریسیوں پر بھی ان خیالات کا اثر ہو چلا تھا۔ یہ چیز سب سے زیادہ صوبہ متحدہ کی کانگریس کمیٹی میں نمایاں تھی اور اور ہم نے ۱۹۲۶ء ہی میں اس کمیٹی میں ایک ہلکا سا اشتراکی پروگرام بنانے کی کوشش کی تھی، ہمارا صوبہ زمینداروں اور تعلقداروں کا صوبہ ہے اس لئے ہمیں سب سے پہلے زمین کا مسئلہ حل کرنا تھا۔ ہم نے یہ اعلان کیا کہ موجودہ نظام آراضی کو منسوخ کر دیا جائے اور سلطنت اور کاشتکاروں کے بیچ میں درمیانی اشخاص نہ رہیں۔ ہمیں بہت احتیاط سے کام کرنے کی ضرورت تھی اس لئے کہ جس فضا میں ہم رہتے تھے وہ اس قسم کے خیالات کی عادی نہیں تھی۔

۱۹۲۹ء میں صوبہ متحدہ کی کانگریس کمیٹی ایک قدم اور آگے بڑھی اور اس نے آل انڈیا کانگریس کمیٹی کے سامنے ایک تجویز پیش کی جو صریح طور پر اشتراکی خیالات پر مبنی تھی۔ آل انڈیا کانگریس کمیٹی نے اپنے اجلاس میں جو ۱۹۲۹ء میں گرمیوں کے موسم میں بمبئی میں منعقد ہوا، صوبہ متحدہ کی تجویز کے ابتدائی حصہ کو منظور کر لیا یعنی اشتراکیت کے اصول کو جس پر یہ تجویز مبنی تھی، قبول کر لیا، اس تجویز میں جو مفصل پروگرام پیش کیا گیا تھا اس پر غور کرنا آئندہ کے لئے ملتان کی ضرورت تھی۔ اکثر لوگ اس تجویز کو بھول گئے ہیں، اور یہ سمجھتے ہیں کہ اشتراکیت کا مسئلہ ابھی سلا بھر سے ایک کانگریس میں چھڑ گیا ہے البتہ یہ ضرور ہے کہ آل انڈیا کانگریس کمیٹی نے اس تجویز کو بغیر کسی خاص غور کے پاس کر دیا تھا اور اکثر ممبر یہ نہیں سمجھتے تھے کہ وہ کیا کر رہے ہیں۔

انجمن آزادی ہند کی صوبہ متحدہ کی شاخ (جس کے سب ممبر اس صوبے کے ممتاز کانگریسی کارکن تھے) بالکل اشتراکی خیالات رکھتی تھی۔ اس لئے وہ کانگریس کمیٹی سے جس میں مختلف خیالات کے لوگ تھے، کچھ آگے بڑھ گئی۔ اصل میں سماجی آزادی انجمن آزادی ہند کے مقاصد میں داخل تھی۔ ہمیں یہ امید تھی کہ ہم اس انجمن کی شاخیں سارے ہندوستان میں پھیلا دیں گے اور ان سے آزادی اور اشتراکیت کے پرو پگنڈا کا کام لیں گے مگر بد قسمتی سے اس انجمن کو صرف صوبہ متحدہ میں کسی قدر کامیابی ہوئی اور کہیں اس کا کام نہیں چلا جس سے میں بہت مایوس ہوا۔ اس ناکامیابی کی وجہ یہ نہیں تھی کہ ملک میں اس انجمن کے حامیوں کی کمی تھی بلکہ اس کے اکثر کارکن کانگریس کے کارکن بھی تھے اور کانگریس نے کم سے کم اصولاً کامل آزادی کے مقصد کو اختیار کر لیا تھا۔ اس لئے وہ سمجھتے تھے کہ ہم خود کانگریس ہی کے ذریعے سے اپنا کام کر سکتے ہیں۔ دوسری وجہ یہ تھی کہ انجمن کے بانیوں میں سے بعض نے اس کی اہمیت کو محسوس نہیں کیا اور اسے ترقی دینے کی ضرورت نہیں سمجھی۔

وہ اس سے صرف اتنا کام لینا چاہتے تھے کہ کانگریس کی ورکنگ کمیٹی پر زور ڈالیں اور اس میں اپنے نمائندوں کو منتخب کرائیں۔ غرض یہ انجمن کچھ زیادہ پنپنے نہیں پائی۔ جب کانگریس نے زیادہ زور دار پالیسی اختیار کی تو وہ لوگ جو انجمن کے روح رواں تھے کانگریس کی طرف کھینچ آئے اور انجمن اور بھی کمزور ہو گئی۔ ۱۹۳۰ء کی سول نافرمانی کے شروع ہوتے ہی انجمن کانگریس میں ضم ہو گئی اور اس کا خاتمہ ہو گیا۔

۱۹۲۸ء کے نصف آخر اور ۱۹۲۹ء میں میری گرفتاری کی خبر گرم تھی نہ معلوم اخبار کی خبروں میں اور انجمن کی اطلاعوں میں جو مجھے واقف کار دوستوں سے ملتی تھیں کہاں تک اصلیت تھی۔ مگر مجھے ان کی وجہ سے ایک بے اطمینانی سی رہنے لگی۔ میں ہر وقت یہ سمجھتا تھا کہ بس اب گرفتار ہوا ہی چاہتا ہوں۔ مجھے اس کی کچھ زیادہ پرواہ نہیں تھی اس لئے کہ میں جانتا تھا کہ میری آئندہ زندگی، اور چاہے جیسی بھی ہو مگر اطمینان کی زندگی نہیں ہو سکتی۔ اس لئے یہی اچھا تھا کہ میں بے اطمینانی اور فوری تغیرات اور جیل جانے کا عادی ہو جاؤں۔ میرے خیال میں مجھے ایک حد تک اور میرے خاندان کو اس کی عادت پڑ گئی۔ اور جب کبھی میرے گرفتاری ہوتی تھی تو میں اسے ایک معمولی چیز سمجھتا تھا۔ غرض گرفتاری کی افواہیں فائدے سے خالی نہ تھیں۔ ان کی وجہ سے میری روزمرہ کی زندگی میں ایک طرح کی بے چینی اور خلش کا لطف پیدا ہو گیا۔ جو دن آزادی میں گذرتا تھا وہ بہت غنیمت معلوم ہوتا تھا۔ مگر خلاف توقع ۱۹۲۸ء میں مجھے بڑی لمبی مہلت ملی اور کہیں اپریل ۱۹۳۰ء میں جا کر میری گرفتاری عمل میں آئی۔ اس وقت سے مجھے جو تھوڑا بہت موقع جیل سے باہر رہنے کا ملتا ہے وہ اے ک خواب سا معلوم ہوتا ہے اور میں اپنے گھر میں اس طرح رہتا ہوں جیسے کوئی مہمان تھوڑے دن کے لئے آیا ہے۔ میری زندگی کچھ بے انکل سی رہتی ہے کیونکہ یہ خبر نہیں رہتی کہ کل کیا ہوا۔ ہر وقت یہ خیال رہتا ہے کہ جیل سے بلا آیا ہی چاہتا ہے۔

۱۹۲۸ء ختم ہونے کو آیا اور کلکتہ کانگریس کا اجلاس قریب آ گیا۔ میرے والد اس کی صدارت کرنے والے تھے۔ وہ ہر وقت آل پارٹیز کانفرنس اور اپنی رپورٹ کی فکر میں رہتے تھے اور اس کو کانگریس میں منظور کرانا چاہتے تھے۔ وہ جانتے تھے کہ میں اس کا مخالف ہوں کیونکہ میں آزادی کے معاملے میں کسی قسم کا سمجھوتا کرنے کو تیار نہیں تھا اور انھیں یہ بات ناگوار تھی۔ ہم اس معاملے میں کچھ زیادہ بحث نہیں کرتے تھے مگر آپس میں ذہنی نزاع اور مخالفت ضرور تھی، خیالات کا اختلاف ہم میں پہلے بھی رہ چکا تھا اور اس قدر ہم تھا کہ دونوں کی سیاسی راہیں الگ الگ ہو گئی تھیں۔ مگر میرے خیال میں اتنی کشیدگی پہلے کبھی نہیں ہوئی تھی۔ ہم دونوں کو اس رنج تھا۔ کلکتے میں یہاں تک نوبت پہنچ گئی کہ میرے والد نے صاف کہہ دیا، اگر انھیں کانگریس میں کامیابی ہوئی، یعنی ان کی آل پارٹیز کانفرنس کی رپورٹ کثرت رائے سے منظور نہ ہوئی تو وہ کانگریس کی صدارت نہیں کریں گے۔ آئینی حیثیت سے یہ بالکل معقول بات تھی مگر ان لوگوں کے لئے جوان کی رائے کی مخالف تھے بڑی مشکل پڑ گئی اسلئے کہ وہ مخالفت کو اس حد تک بڑھانا نہیں چاہتے تھے۔ کانگریس میں اور شاید دوسری جماعتوں میں بھی یہ رجحان عام ہے کہ لوگ نکتہ چینی اور مخالفت کرتے ہیں مگر ذمہ داری قبول کرنے سے گھبراتے ہیں۔ انھیں ہمیشہ یہ امید رہتی ہے کہ ان کی نکتہ چینی سے دوسری پارٹی اپنا رخ بدل دے گی اور کشتی کے چلانے کا بوجھ خود ان پر نہیں پڑے گا۔ جہاں ہم لوگ ذمہ داری سے محروم ہیں اور اختیارات غیر ذمہ دار حکام کے ہاتھ میں ہیں، جو معزول نہیں کئے جاسکتے، مثلاً ہندوستان کی موجودہ حکومت میں وہاں ہم نکتہ چینی (یا عملی مخالف) کے سوا اور کچھ نہیں کر سکتے اور اس صورت میں نکتہ چینی لازمی طور پر محض تخریبی ہوتی ہے لیکن یہاں بھی تخریبی نکتہ چینی اس وقت موثر ہو سکتی ہو جب ہم اس کے لئے تیار ہوں کہ اگر موقع ملا تو ہم حکومت کی پوری ذمہ داری قبول کر لیں گے اور ملی اور فوجی، داخلی اور خارجی تمام محکموں

کو چلائیں گے۔ محض جزوی اختیار کا مطالبہ کرنا، جیسا کہ لبرل جماعت فوج کے معاملے میں کرتی ہے، گویا اس بات کا اعتراف کرنا ہے کہ ہم حکومت کے چلانے کی قابلیت نہیں رکھتا اور پھر ہماری نکتہ چینی میں کچھ زور باقی نہیں رہتا۔ گاندھی جی پ رنکتہ چینی کرنیوالے اکثر یہی طریقہ اختیار کرتے ہیں کہ اعتراض اور مخالفت کرنے کو تو موجود ہیں مگر اس کے قدرتی نتائج سے گھبراتے ہیں۔ کانگریس میں بہت سے لوگ ہیں جو ان کی اکثر کارروائیوں کو ناپسند کرتے ہیں اور ان پر بہت سختی سے نکتہ چینی کرتے ہیں مگر اس کے لئے تیار نہیں ہیں کہ انہیں کانگریس سے الگ کر دیں یہ طریقہ سمجھ میں تو آتا ہے مگر یہ دونوں فریقوں کیساتھ نا انصافی پر مبنی ہے۔

اسی قسم کی مشکلیں کلکتہ کانگریس میں پیش آئیں۔ دونوں فریقوں میں گفت و شنید ہوتی رہی اور سمجھوتے کی راہ نکالی گئی مگر اس میں کامیابی نہیں ہوئی۔ اس سے بڑی الجھن اور اتری پیدا ہوئی۔ کانگریس میں جو رزولوشن پاس ہوا اس میں آل پارٹیز کانفرنس کی رپورٹ منظور کر لی گئی۔ مگر اس شرط کے ساتھ کہ اگر حکومت برطانیہ نے ایک سال کے اندر مجوزہ دستور اساسی قبول نہ کیا تو کانگریس دوبارہ کامل آزادی کو اپنا مقصد قرار دے گی۔ یہ رزولوشن یقیناً کامل آزادی کے نصب العین سے بہت پست تھا اس لئے کہ آل پارٹیز کانفرنس کی رپورٹ میں پورے نو آبادیات کے درجے کا بھی مطالبہ کیا گیا تھا مگر غالباً یہ تجویز ایک لحاظ سے دانشمندی پر مبنی تھی اس لئے کہ اس کی وجہ سے آپس کی تفریق جس کے لئے کوئی تیار نہیں تھا، رک گئی اور کانگریس متحدہ طور پر ۱۹۳۰ء میں سول نافرمانی کی تحریک شروع کر سکی۔ یہ بالکل ظاہر تھا کہ حکومت برطانیہ آل پارٹیز کانفرنس کے دستور اساسی کو سال بھر کے اندر منظور نہیں کرے گی۔ لڑائی کا ہونا یقینی تھا اور ملک کی حالت کو دیکھتے ہوئے گاندھی جی کی رہنمائی کے بغیر لڑائی میں کامیاب ہونے کی کوئی امید نہیں تھی۔

میں نے کسی قدر بے دلی سے کانگریس کے کھلے اجلاس میں اس رزولوشن کی مخالفت کی مگر پھر بھی میں جنرل سکرٹری منتخب ہو گیا، چاہے جو کچھ بھی ہو میں سکرٹری کی عہدے کو نہیں چھوڑتا تھا اور کانگریس میں میری مثال برے کے مشہور پادری کی سی تھی۔ کانگریس کا صدر کوئی بھی ہو سکرٹری میں ہی رہتا تھا۔

کلکتہ کانگریس سے چند روز پہلے جھریا میں جو کونلے کی کانوں کے علاقے کا مرکز ہے۔

آل انڈیا ٹریڈ یونین کانگریس کا اجلاس ہوا۔ میں نے صرف اس کے پہلے دو دن کے جلسوں میں شرکت کی کیونکہ اس کے بعد مجھے کلکتہ جانا تھا۔ مجھے ٹریڈ یونین کانگریس میں شرکت کا یہ پہلا موقع تھا اور میں ایک حد تک باہر کا آدمی سمجھا گئے۔ حالانکہ کسانوں میں اور کچھ دن مزدوروں میں کام کرنے کی وجہ سے مجھے عوام میں خاصی ہر لحاظ پر یزی حاصل ہو گئی تھی یہاں میں بھی اصلاح پسندوں اور انقلاب پسندوں کا وہ پرانا جھڑانظر آیا۔ دواہم مسئلے زیر بحث تھے ایک تو یہ کہ دونوں بین الاقوامی انجمنوں میں سے کسی ایک سے اور انجمن مخالف شہنشاہی اور بین پیسینک یونین سے الحاق کیا جائے یا نہ کیا جائے۔ دوسرا یہ کہ جینیوا کی بین الاقوامی مزدوروں کی کانفرنس میں نمائندے بھیجے جائیں یا نہ بھیجے جائیں۔ مگر ان مسئلوں سے کہیں زیادہ اہم وہ شاید اختلاف تھا جو کانگریس کے دونوں فریقوں میں پایا جاتا تھا۔ ایک تو پرانا ٹریڈ یونین کا فریق تھا جو معتدل سیاسی خیالات رکھتا تھا بلکہ صنعتی معاملات میں سیاست کی مداخلت کو ناپسند کرتا تھا۔ وہ صرف صنعتی جدوجہد چاہتا تھا اور وہ بھی بہت احتیاط کے ساتھ اس کا مقصد یہ تھا کہ مزدوروں کی حالت رفتہ رفتہ بہتر بنائی جائے۔ اس فریق کی لیڈر۔ ن۔ م۔ جوشی تھے جنہوں نے کئی بار جینیوا میں ہندوستانی مزدوروں کی نمائندگی کی تھی۔ دوسرا فریق زیادہ جنگجو تھا وہ سیاسی جدوجہد کا قائل تھا۔ اور کھلم کھلا انقلابی خیالات کا اظہار کرتا تھا۔ اس پر کسی قدر اثر

ان لوگوں کا تھا جو اشتمالی یا قریب قریب اشتمالی اصول رکھتے تھے۔ یہ فریق بمبئی کے پارچہ بانی کے مزدوروں پر حاوی ہو گیا تھا اور اس کی رہنمائی میں بمبئی کے کپڑے کے کارخانوں میں ایک بہت بڑی ہڑتال ہو چکی تھی، جس میں کسی حد تک کامیابی بھی ہوئی تھی۔ بمبئی میں پارچہ بانی کے مزدوروں کی ایک نئی طاقت و رانجمن ’گرنی کامگار یونین‘ کے نام سے قائم ہوئی تھی جس کا وہاں کے مزدوروں میں بہت بڑا اثر تھا۔ ایک اور طاقتور رانجمن یعنی۔ جی۔ آئی۔ پی ریلوے یونین بھی انتہا پسند فریق کے اثر میں تھی۔

جب سے ٹریڈ یونین کانگریس قائم ہوئی اس کا انتظام اور اس کا دفتر۔ م جوشی اور ان کے فریقوں کے ہاتھ میں تھا اور جوشی ہی نے اس تحریک کو نشوونما دی تھی۔ انتہا پسند فریق کا اثر عام ممبروں میں تو بہت تھا مگر کانگریس کے ارباب اقتدار کے سامنے ان کی ایک نہیں چلتی تھی اور اس کی پالیسی میں انھیں ذرا بھی دخل نہ تھا۔ صورت بہت ناقابل اطمینان تھی اور اصل حالات سے مطابقت نہیں رکھتی تھی۔ لوگوں میں ناراضی پھیلی ہوئی تھی، آپس میں جھگڑے ہو رہے تھے۔ اور انتہا پسند فریق ٹریڈ یونین کانگریس میں اقتدار حاصل کرنا چاہتا تھا، مگر اس کے باوجود لوگ معاملے کو زیادہ طول دینے گھبراتے تھے کہ کہیں کانگریس میں تفریق نہ ہو جائے۔ ابھی ٹریڈ یونین کی تحریک ہندوستان میں بالکل بچپن کی حالت میں تھی اس کی قوت بہت کم تھی اور اس کے چلانے والے خود مزدور نہیں بلکہ باہر کے لوگ تھے۔ ان کے حالات میں عموماً یہ ہوتا ہے کہ باہر والے مزدوروں کے ذریعے سے خود فائدہ اٹھاتے ہیں۔ ٹریڈ یونین کانگریس اور مزدوروں کی دوسری انجمنوں میں یہ بات صاف نظر آرہی تھی۔ البتہ۔ م جوشی نے برسوں کی جدوجہد سے یہ ثابت کر دیا تھا، کہ وہ ٹریڈ یونین کے سچے اور پکے حامی ہیں اور جو لوگ انھیں سیاسی حیثیت سے رجعت پسند یا اعتدال پسند سمجھتے تھے وہ بھی اس کے متعرف تھے کہ انھوں نے

ہندوستان کے مزدوروں کی قابل قدر خدمات انجام دی ہیں۔

میں جھریا کی کانگرس میں انتہا پسند فریق سے ہمدردی رکھتا تھا مگر چونکہ میں نیا آدمی تھا اور کانگرس کی خانگی جھگڑوں کو پوری طرح سمجھ نہیں سکتا تھا اس لئے میں نے ان میں کچھ دخل نہیں دیا۔ میرے جانے کے بعد ٹریڈ یونین کانگرس کے سالانہ انتخابات ہوئے اور مجھے کلکتہ میں معلوم ہوا کہ میں آئندہ سال کے اجلاس کا صدر منتخب کیا گیا ہوں۔ میرا نام اعتدال پسند فریق نے پیش کیا تھا، شاید اس وجہ سے کہ اس کے نزدیک انتہا فریق کے امیدوار کے مقابلے میں (جو ریلوے کا ایک مزدور تھا) میری کامیابی کا سب سے زیادہ امکان تھا۔ اگر میں انتخاب کے دن جھریا میں موجود ہوتا تو یقیناً مزدور امیدوار کے حق میں دست بردار ہو جاتا۔ مجھے یہ بات بہت نامناسب معلوم ہوئی کہ ایک نیا آدمی، جو خود مزدور نہیں تھا، ایک دم سے صدر بنا دیا جائے۔ یہ بھی ہندوستان کی ٹریڈ یونین تحریک کے بچپن اور اس کی کمزوری کی ایک علامت تھی۔

۱۹۲۸ء میں مزدوروں کے جھگڑوں اور ہڑتالوں کا بڑا زور رہا تھا۔ ۱۹۲۹ء میں بھی یہ سلسلہ جاری رہا بمبئی کے پارچہ بانی کے خستہ حال اور جنگجو مزدور اس میں پیش پیش تھے۔ بنگال جوٹ مل میں بہت بڑی عام ہڑتال ہوئی۔ جمشید پور کے لوہے کے کارخانے میں (اور شاید ریلوے میں بھی) ہڑتالیں ہوتی رہیں۔ جمشید پور کے ٹین کی چادروں کے کارخانے میں بڑا سخت مقابلہ ہوا اور غریب مزدور کئی مہینے تک لڑتے رہے۔ مگر باوجود اس کے کہ پبلک نے ان سے انتہائی ہمدردی کا اظہار کیا، اس طاقتور کمپنی نے جو اس کارخانے کی مالک تھی (اور برما آئل کمپنی سے وابستہ تھی) انھیں کچل کر رکھا دیا۔

غرض ان دو سال کے عرصے میں صنعتی حلقوں میں سخت بے چینی رہی، اور مزدوروں کی حالت بہت خراب ہو گئی۔ جنگ عظیم کے بعد کا زمانہ ہندوستان میں

صنعت کی گرم بازاری کا زمانہ تھا۔ اور کارخانے کے مالکوں نے اس عرصے میں بے اندازہ نفع کمایا تھا۔ پانچ چھ سال تک جوٹ اور روئی کے کارخانوں کا سالانہ نفع سو فیصد رہا اور کبھی کبھی ڈیڑھ سو فیصد تک بھی پہنچ گیا۔ یہ تمام منافع مالکوں اور حصہ داروں کی جیب میں گیا اور مزدوروں کی حالت جیسی پہلے تھی ویسی ہی رہی۔ کبھی ان کی مزدوری میں خفیف سا اضافہ بھی ہوا تو اسی نسبت سے چیزوں کی قیمتیں بڑھ گئیں۔ اس زمانے میں جب کہ کروڑوں روپے کی آمدنی ہو رہی تھی مزدور بدستور بدتر سے بدتر کوٹھڑیوں میں رہتے تھے اور ان کی عورتوں کو پہننے کو کپڑا بھی میسر نہ تھا۔ بمبئی کے مزدوروں کی حالت تو خراب تھی ہی مگر کلکتے کے محلوں سے گھنٹہ بھر کے راستہ پر جوٹ کے مزدوران سے بھی بڑھ کر مصیبت میں گرفتار تھے۔ نیم برہنہ میلی کچلی عورتیں چند پیسوں کے بدلے صبح سے شام تک کام کرتی تھیں تاکہ گلاسگو اور ڈنڈی میں اور بعض ہندوستانیوں کے گھروں میں دولت کی ندیاں بہتی رہیں۔

جب تک گرم بازاری کا دور رہا کارخانوں کے مالک مزے کرتے رہے مزدوروں کو اس سے کوئی فائدہ نہیں پہنچا اور ان کی زندگی اس طرح گزرتی رہی۔ مگر جب یہ دور ختم ہو گیا اور لمبے چوڑے منافع بند ہو گئے تو ظاہر ہے کہ اس کا سارا بوجھ غریب مزدوروں پر پڑا۔ پچھلے نفع کو لوگ بھول گئے تھے اور کھاپی کے ٹھکانے لگا چکے تھے۔ اب یہ کہا جاتا تھا کہ جب تک کافی نفع نہ ہو کارخانے کیسے چل سکتے ہیں؟ اسی کا نتیجہ تھا کہ صنعتی حلقوں میں بے چینی اور شورش پھیل گئی اور بمبئی میں اتنی زبردست ہڑتالیں ہوئیں جنہیں دیکھ کر لوگ حیران رہ گئے اور کارخانوں کے مالک اور ارباب حکومت دونوں ڈر گئے۔ مزدوروں کی تحریک، خیالات اور تنظیم دونوں کے لحاظ سے متحد جنگجو اور خطرناک ہوتی جاتی تھی۔ سیاسی تحریک بھی تیزی سے بڑھ رہی تھی اور اگرچہ ان دونوں میں کوئی تعلق نہ تھا مگر پھر بھی یہ ایک حد تک ساتھ ساتھ چل رہی تھیں۔ ایسی صورت میں حکومت مستقبل کی طرف سے ہرگز مطمئن نہیں

ہو سکتی تھی۔

مارچ ۱۹۲۹ء میں حکومت نے یکا یک مزدوروں کی تنظیم پر وار کیا اور انتہا پسند فریق کے چند سربراہ اورہ کارکنوں کو گرفتار کر لیا۔ بمبئی کی گرنی کام یونین کے لیڈر اور بنگال صوبہ متحدہ اور پنجاب کے مزدوروں کے لیڈر گرفتار کے لئے گئے۔ ان میں سے بعض اشتہالی تھے، بعض قریب قریب اشتہالی خیالات رکھتے تھے۔ مگر بعض ایسے بھی تھے جو صرف ٹریڈ یونین کے حامی تھے۔ اس طرح میٹرٹھ کا مشہور مقدمہ شروع ہوا جو ساڑھے چار برس تک چلتا رہا۔

میٹرٹھ کے ملزموں کی طرف سے پیروی کرنے کے لئے ایک کمیٹی قائم کی گئی جس کے صدر میرے والد تھے اور جس کے ممبروں میں ڈاکٹر انصاری اور دوسرے حضرات کے ساتھ میں بھی شامل تھا۔ ہماری سامنے بڑا مشکل کام تھا۔ اس کے لئے روپیہ جمع کرنا سہل نہ تھا۔ روپے والوں کو اشتہالیوں، اشتراکیوں اور مزدوروں کی حمایت میں شورش کرنے والوں سے کچھ زیادہ ہمدردی نہیں معلوم ہوتی تھی۔ اور وکیل صاحبان شانِ لاک کی طرف اپنی خدمات صرف اس شرط پر بیچنے کو تیار تھے کہ انھیں پورے آدھ سیر گوشت کا ٹکڑا کسی نہ کسی کے جسم سے کاٹ کر دیا جائے۔ ہماری کمیٹی میں میرے والد اور بعض اور ممتاز وکیل شامل تھے اور وہ مشورہ دینے کے لئے اور عام نگرانی کرنے کے لئے ہر وقت تیار تھے۔ ان لوگوں کو کوئی معاوضہ نہیں دینا پڑتا تھا۔ مگر وہ مہینوں جم کر میٹرٹھ میں نہیں رہ سکتے تھے۔ دوسرے وکیل جن سے ہم نے مدد کی درخواست کی اس مقدمے کو زیادہ سے زیادہ روپیہ کمانے کا ذریعہ سمجھتے تھے۔

میٹرٹھ کے مقدمے کے علاوہ میرا تعلق بعض اور کمیٹیوں سے رہا ہے جو م۔ن۔رے اور دوسرے سیاسی ملزموں کی طرف سے پیروی کرنے کے لئے قائم ہوئی تھیں۔ ہر موقع پر اپنے ہم پیشہ حضرات کی حرص کو دیکھ کر سخت حیرت ہوئی۔ سب

سے پہلا بڑا دھچکا مجھے ۱۹۱۹ء میں پنجاب کے مارشل لا کے مقدمے کے دوران میں پہنچا تھا جبکہ ایک چوٹی کے وکیل کو اس پر اصرار تھا کہ وہ غریب جو مارشل لا کا شکار ہوئے تھے اور جن میں ایک ان کے ہم پیشہ وکیل بھی شامل تھے، ان کی بھاری فیس پوری پوری ادا کریں۔ ان میں سے بہتوں کو ان کی فیس ادا کرنے کے لئے قرض لینا پڑا اپنی جائیداد بیچی پڑی۔ ہم غریب سے غریب مزدوروں سے پیسہ پیسہ جمع کرتے تھے اور وکیلوں کو بڑے بڑے چیک لکھ کر دیتے تھے۔ اس سے مجھے روحانی تکلیف ہوتی تھی کیونکہ سیاسی ملزموں اور مزدوروں کے مقدموں میں خواہ پیروی کی جائے یا نہ کی جائے نتیجہ ایک ہی نظر آتا تھا۔ بہر حال میرٹھ کے مقدمے میں کئی لحاظ سے پیروی ضروری معلوم ہوتی تھی۔

میرٹھ کے ملزموں کی طرف سے پیروی کرنے والی کمیٹی کو خود ان ملزموں کی وجہ سے بڑی قیمتیں پیش آتی تھیں۔ ان میں طرح طرح کے لوگ تھے جن کی طرف سے مختلف قسم کی صفائی پیش کرنے تھی اور اکثر ان میں آپس میں اختلاف رہا کرتا تھا۔ چند مہینے کے بعد ہم نے باضابطہ کمیٹی توڑ دی مگر انفرادی حیثیت سے ان لوگوں کی مدد کرتے رہے۔ سیاسی واقعات کی رفتار روز بروز ہماری توجہ کو اپنی طرف کھینچتی گئی اور ۱۹۳۰ء میں ہم سب کے سب جیل میں پہنچ گئے۔

----- اختتام حصہ اول -----